UNIVERSAL LIBRARY

OU_224384

UNIVERSAL LIBRARY

OUP—43—30-1-71—5,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No. U 35520

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

برہان

جلد ششدہم شمارہ (۱)

جنوری سنہ ۱۹۴۶ء مطابق صفر المظفر سنہ ۱۳۶۵ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات — سعید احمد اکبر آبادی

۲۔ حضرتِ ہارونؑ اور گوسالۂ طلائی

خروج کے ۳۲ ویں باب کی تشریح — جناب مولوی اسحٰق النبی صاحب علوی

۳۔ ادبیات:۔

سوزِ ناتمام — از جناب ماہر القادری

ترکِ آرزو — از جناب الم مظفر نگری

مکاشفات — جناب طور سیوہاردی

۴۔ تبصرے — م ۔ ح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں نیاز صاحب فتحپوری نے ماخذ القرآن نمبر کے نام سے نگار کا ایک خاص شمارہ شائع کیا تھا جو ایک عیسائی مبلغ ڈاکٹر ٹسڈل کے ایک مقالہ پر مشتمل تھا۔ اس مقالہ میں ڈاکٹر ٹسڈل نے عام عیسائی مبلغین کی طرح یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی کہ قرآن مجید کا اگر تجزیہ کیا جائے تو باعتبارِ مضامین اس میں دو ہی چیزیں ہیں ایک احکام جو اوامر و نواہی پر مشتمل ہیں اور دوسرے قصص و حکایات جو لوگوں کی عبرت پذیری کے لئے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ٹسڈل نے کہا تھا کہ قرآن کے جتنے احکام ہیں وہ سب مذاہبِ قدیمہ سے یا مشرکین عرب کے عام عادات و رسوم سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح قرآن کے جتنے قصص ہیں وہ بھی یا تو سرے سے بے اصل ہیں جیسے عاد و ثمود کے واقعات' یا وہ دوسرے مذاہب کی کتابوں سے لئے گئے ہیں اور چونکہ صاحبِ قرآن اصل ماخذ سے براہِ راست واقف نہ تھے اس بناء پر قرآن اور کتبِ قدیمہ دونوں کے بیانات میں بہت کچھ مشابہت ہونے کے باوجود جزوی اختلافات بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ اس سلسلۂ بحث کے ذیل میں ٹسڈل نے حضرت ہارون اور بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی پر بھی گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ روایت بھی یہودیوں سے لی گئی ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودی روایت کے لفظ سمائیل کو اچھی طرح نہیں سمجھا گیا۔ یہودیوں کے یہاں ملک الموت کو سمائیل کہتے ہیں اور غالباً سامری اسی کی بدلی ہوئی صورت ہے" اس بحث کے آخر میں معترض لکھتا ہے "اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) روایاتِ بائبل سے زیادہ واقف ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ گوسالہ طلائی کا بنانے والا ہارون تھا اور بائبل میں نہ سمائیل کا ذکر پایا جاتا ہے نہ سامری کا (نگار جنوری و فروری ۱۹۴۵ء ص ۴۷)

یہ ہے ٹسڈل کے اعتراضات کا خلاصہ اب ان میں سے جو اعتراضات احکامِ قرآنی سے متعلق ہیں وہ قطعاً اہم اور لائقِ توجہ نہیں۔ کیونکہ اول تو قرآن نے خود اپنے آپ کو دوسرے مذاہبِ سماویہ وقدیمہ کی کتابوں کے لئے

مصدق کہا ہے اور پھر علمائے اسلام نے مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں امام رازی نے مطالب عالیہ میں اور علامہ ابن حزم نے المحلی میں اس پر مفصل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کن کن چیزوں کا مصدق ہے اور جن کی وہ تصدیق نہیں کرتا تو اس کی وجہ کیا ہے۔ پس اگر قرآن کے احکام اور دوسرے مذاہب کے احکام میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور تاریخ اس کو ثابت کرتی ہے تو یہ قرآن کا نقص اور عیب نہیں بلکہ اس سے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امی ہونا اور کتب قدیم سے ناواقف ہونا تو خود ٹسڈل ایسے معترضین کو بھی مسلم ہے۔ پس اگر قرآن کلام الٰہی نہ ہوتا اور معترضین کے بیان کے مطابق معاذ اللہ خود آپ کا ہی کلام ہوتا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ آپ کتب قدیمہ سے ناواقف ہونے کے باوجود قرآن کے مصدق ہونے کا دعویٰ کر سکتے۔

البتہ جہاں تک قصص قرآن پر اعتراضات کا تعلق ہے وہ ہمارے نزدیک بہت اہم اور قابل توجہ ہیں اس سلسلہ میں ہمیں یہ بتانا ہے کہ

(۱) معترض قرآن کے جن قصص کو بے اصل اور "خرافات عجائز" کہتا ہے وہ تاریخی اعتبار سے ثابت ہیں اور ٹھیک ٹھیک اسی طرح ثابت ہیں جس طرح کہ قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے۔

(۲) قرآن کے جن قصص کے متعلق معترض یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ قصص دوسرے مذاہب کی کتابوں، یا ان کی روایات سے لئے گئے ہیں اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان روایات سے کما حقہ واقف نہیں تھے اس بنا پر ان روایات کی حقیقت قرآن میں آکر کچھ سے کچھ ہوگئی ہے اُن کے متعلق ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ نہیں قرآن کا بیان ہی اس معاملہ میں درست ہے اور اس کے برخلاف دوسرے مذاہب کی جو روایات ہیں یا تو وہ سرے سے ہی بے اصل اور محرف ہیں یا تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے مذاہب کی اصل روایات تو عین قرآن کے ہی مطابق تھیں لیکن جب اصل مذہب میں تحریف ہوئی تو ساتھ ہی ان قصص میں بھی تحریف ہوگئی اور واقعہ کی صورت بگڑ کر کچھ کی کچھ بن گئی۔ اس تحریف کی وجہ سے قرآن کے بیان اور محرف روایات میں تغایر نظر آتا ہے ورنہ اصل کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں۔

(۳) اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ خود کتب اور روایاتِ قدیمہ پر بھی تنقید کی جائے کہ جس صورت میں وہ ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ کس حد تک بھروسہ کے قابل اور لائقِ اعتماد ہیں اور کیا وہ اس قابل ہیں کہ ان کی روشنی میں قرآن کے کسی واقعہ یا قصہ کی تغلیط کی جا سکے؟

ظاہر ہے کہ یہ کام جس قدر ضروری اور اہم تھا اسی قدر مشکل بھی تھا۔ اس فرض کو باحسنِ وجوہ وہی شخص انجام دیسکتا تھا جو قرآن کا عالم ہونے کے ساتھ کتب قدیمہ کا بھی فاضل ہو اور جس نے ان کا مطالعہ بڑی تحقیق اور دقیقہ رسی کے ساتھ کیا ہو۔ ہمیں یہ اعلان کرنے میں بڑی مسرت ہے کہ خود ہمارے حلقۂ احباب میں ہمیں ایک ایسے فاضل مل گئے اور ہم ان سے مقالہ لکھوانے میں کامیاب ہو سکے۔ چنانچہ آج ہم اس سلسلہ کا پہلا مقالہ شائع کر رہے ہیں۔ اس کے بعد انشاءاللہ "سامری" اور قوم "عاد" پر بھی نہایت محققانہ مقالات آنمکرم کے ہی قلم سے شائع ہوں گے۔

صاحبِ مقالہ جناب مولوی اسحاق النبی صاحب علوی خاموشی کے ساتھ کتبِ قدیمہ کے مطالعہ میں عرصہ سے مصروف ہیں اور ان میں بڑا درک و بصیرت رکھتے ہیں۔ ابھی موصوف کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ علالتِ طبع کے باوجود برہان کے لئے موعودہ مقالات کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ ہم دلی شکریہ کے ساتھ جنابِ موصوف کے لئے دعاءِ صحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں بہمہ وجوہ تندرست رکھے اور وہ اپنے علم اور مطالعہ سے اسلام کی زیادہ سے زیادہ ٹھوس اور مفید خدمات انجام دے سکیں۔ ناسپاسی ہوگی اگر ہم اس شکریہ میں اپنے فاضل دوست مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم اسٹیٹ لائبریری رامپور کو شریک نہ کریں جنھوں نے ہماری طرف سے حقِ نیابت و وکالت ادا کر کے صاحبِ مقالہ سے اس مقالہ کی تکمیل کرائی ورنہ یہ واقعہ ہے کہ اگر مولانا کی سرگرم توجہ فرمائی شاملِ حال نہ ہوتی تو غالباً ابھی ایک مدت تک یہ مقالہ برہان کے صفحات پر جلوہ نما نہ ہو سکتا تھا۔ فجزاھما اللہ عنا احسن الجزاء۔

حضرت ہارونؑ اور گوسالۂ طلائی

خروج کے ۳۲ ویں باب کی تشریح

از جناب مولوی اسحٰق النبی صاحب علوی رامپوری

اس مضمون سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ خروج کے ۳۲ ویں باب کی تاریخی واقعیت کو جوں کا توں ثابت کیا جائے۔ یا یہ یقین دلایا جائے کہ خروج کا یہ حصہ بلاکم وکاست درست ہے، بلکہ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ خود بائبل (جس کی وجہ سے قرآن پر اعتراض کیا جاتا ہے) ہارونؑ کی گوسالہ سازی" کے الزام سے خالی ہے

یہ مضمون اس اعتبار سے نامکمل ہے کہ اس کا نہایت ضروری حصہ "سامری" ہنوز زیرِ ترتیب ہے اس لئے میں نے ان کتابوں کی فہرست جن کے (مختلف) حوالے جگہ جگہ نظر آتے ہیں نہیں دی ہے (انشاءاللہ) سامری کے ساتھ دونوں مضمونوں کی ببلوگرافی شامل کردی جائے گی۔ (علوی)

یورپ کے بعض علمائے "اسلامیات" کا خیال ہے کہ قرآن میں دانستہ یا نادانستہ طور پر متعدد تاریخی غلطیاں راہ پاگئی ہیں جن میں سے ایک بنی اسرائیل کے مشہور طلائی بچھڑے کا واقعہ بھی ہے۔ قرآن نے بچھڑا بنانے والے کا نام "سامری" بتایا ہے۔ حالانکہ وہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر "ہارونؑ" کے علاوہ کسی دوسرے کا کام نہ تھا۔ اس اعتراض کی بنیاد بائبل کی صرف ایک آیت ہے جس کا ترجمہ مروجہ بائبلوں میں اس طرح کیا گیا ہے۔

"اور اس نے (یعنی ہارونؑ نے) ان کے ہاتھوں سے (زیور) لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر

اس کی صورت چکاکی کے اوزار سے درست کی اور انھوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمھارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔" (خروج ۳۲:۴)

اسی آیت کے موجودہ ترجمہ پر معترضین کا مدارِ بحث ہے اور صرف اسی کی بنیاد پر ڈاکٹر ٹسڈل نے یہاں تک کہدیا کہ

"محمدؐ اگر روایاتِ بائبل سے زیادہ واقف ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ گوسالۂ طلائی کا بنانے والا ہارون تھا۔" [1]

دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان علماء کا خیال کہاں تک صحیح ہے؟ اور جو نتائج انھوں نے نکالے ہیں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں؟ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں پوری بائبل میں یہی ایک تنہا آیت ہے جو "ہارونؑ" پر اس الزام کی حامل نظر آتی ہے۔ اصولاً ہمیں صرف اسی آیت سے بحث کرنا چاہئے تھی، لیکن اس آیت کا تعلق دوسری آیتوں سے بھی ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ پورے باب پر غور کرلیا جائے تاکہ اس مسئلے کا کوئی پہلو دھندلا نہ رہے۔

سہولت کے لئے مستند ترجمے (Authoresid version) کی پرانی تقسیم کے مطابق ہر پیراگراف سے علیحدہ علیحدہ بحث کی جائے گی، تاکہ ہر آیت کا تعلق دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا رہے اور نیز ان کے سیاقِ کلام و ربطِ عبارت کے ٹوٹنے کا خطرہ نہ رہے۔

پہلا پیراگراف [2]

۱- اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ پہاڑ سے اترنے میں دیر کرتا ہے تو وہ ہارونؑ کے پاس جمع ہوئے اور اس سے کہا کہ اٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے، کیونکہ یہ مرد موسیٰؑ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا، ہم نہیں جانتے کہ اُسے کیا ہوا۔

۲- ہارونؑ نے اُن سے کہا کہ سونے کے زیور، جو تمہاری بیویوں اور تمہارے بیٹوں اور بیٹیوں کے

---

[1] نگار جنوری فروری ۱۹۴۵ء۔ [2] بائبل کے اردو ترجمے کی زبان اس قدر پرانی اور ناقص ہے کہ بسا اوقات صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آتا اس لئے میں نے انگریزی نسخے کو پیشِ نظر رکھ کر اردو کی عبارت کو موجودہ اسلوبِ زبان کے مطابق کر دیا ہے۔

کانوں میں ہیں، توڑ توڑ کے میرے پاس لاؤ۔

۳۔ چنانچہ سب لوگ سونے کے زیور جو اُن کے کانوں میں تھے توڑ توڑ کے ہارونؑ کے پاس لائے۔

۴۔ اور اس نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے اوزار سے درست کی اور انھوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔

۵۔ اور جب ہارونؑ نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور ہارونؑ نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔

۶۔ اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں، اور لوگ کھانے پینے کو اور کھیلنے کو اٹھے۔

خروج کے بتیسویں باب کا پہلا پیراگراف آپ کے سامنے ہے۔ اس پر مجموعی حقیقت سے بھی بحث ہو سکتی تھی لیکن ہم نے سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ تمام آیتوں پر علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے۔

پہلی آیت | سب سے پہلے آیتِ اول کو لیجئے جو بطورِ تمہید کلام اس واقع کے سرزد ہونے کی وجہ ظاہر کر رہی ہے۔ حقیقتاً اس آیت کا تعلق ۲۵ ویں باب کی آخری آیات سے ہے، جہاں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ موسیٰؑ "ہارونؑ" اور "حور" کو اپنا نائب بنا کر پہاڑ پر چڑھے اور ایک بدلی میں غائب ہو گئے۔

اس آیت کی موجودہ عبارت کا مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب لوگ موسیٰؑ کی واپسی سے مایوس ہو گئے تو وہ "ہارون" (ان کے نائب) کے پاس جمع ہوئے اور ایک معبود[1] بنانے کا مطالبہ کیا جو اُن کے لشکر کے آگے چلے۔

قدیم بت پرست قوموں میں یہ رسم عام تھی کہ جب ان کی فوجیں کوچ کرتی تھیں تو ان کے دیوتا فوج کے آگے آگے چلتے تھے[2]۔ خود بنی اسرائیل میں آخر وقت تک دیوتاؤں کی مورتیوں کی بجائے تابوتِ شہادت فوجوں کی رہنمائی[3]

---

[1] مستند ترجمے میں لفظ معبود جمع کے صیغے میں نظر آتا ہے یعنی gods لیکن اس سے مراد ایک ہی معبود ہے (بصیغۂ واحد) Fuller on Exd XXXII

[2] دیکھو Layard (Ninoa & its Umanns Vol II ch V. P.P. 362, 366

[3] دیکھو Ency of Relay P.P. 35 Sam XVII. 45. . . . .

کرتا تھا۔ لیکن اس آیت کا مروجہ ترجمہ واقع کے اصلی خدوخال کو اچھی طرح ظاہر نہیں کرتا، اور نہ اس سے پورے طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں وہ کونسی روح تھی جو بنی اسرائیل کی جماعت کو اس مطالبہ پر آمادہ کر رہی تھی؟

اس آیت کا ایک اور ترجمہ بھی ہے جو ہم کو ایک قدیم ترجمے یعنی اسپٹواجنٹ (Septuagint) [۵۱] میں نظر آتا ہے۔ واقعات کے لحاظ سے یہ ترجمہ زیادہ قابلِ قبول ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

---

۵۱ اسپٹواجنٹ ترجمہ تقریباً ۱۵۰ ق م میں مصر میں مکمل ہوا (Manica P. 10) یہودیوں کا ایک زمانے تک یہ خیال رہا کہ اس ترجمے میں تائیدِ الٰہی شامل ہے۔ لیکن جب عیسائیوں نے اس ترجمے کے بعض الفاظ سے استناد شروع کر دیا۔ تو آہستہ آہستہ اس خیال میں ترمیم ہوتی چلی گئی (Paterson)

موجودہ دور میں اس قدیم ترجمے سے بہت مفید کام لیا جا رہا ہے۔ علماء کا خیال ہے کہ اسپٹواجنٹ کے مترجمین کے پیشِ نظر بائبل کا جو عبرانی متن تھا وہ موجودہ متن سے بہت کچھ مختلف تھا۔ اکثر تفسیروں میں اس اختلاف کو واضح کیا جاتا ہے مثلاً Cambridge Bible میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ اختلافات دکھائے گئے ہیں۔ ان اختلافات کی صرف دو ایک مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں جو اس وقت سرسری طور پر نکل آئیں۔

یوشع ۲۴ : ۱۰ کی موجودہ عبارت یہ ہے:۔

"لیکن میں نے نہ چاہا کہ بلعام کی سنوں اس لئے وہ تمہارے حق میں دعائے خیر کرتا رہا بس میں نے تمہیں اس کے ہاتھ سے رہائی بخشی"

اسپٹواجنٹ ترجمے میں بجائے "میں نے نہ چاہا کہ بلعام کی سنوں" یہ الفاظ ہیں۔

"اور خداوند تیرے خدا نے نہ چاہا کہ وہ تجھے تباہ کرے"

مفسر یوشع (Cook P. 216) کا خیال ہے کہ اس مقام پر اسپٹواجنٹ کے الفاظ اصلی ہیں اور موجودہ متن میں بلعام کے کیرکٹر کو ملحوظ رکھ کر تبدیلی کر دی گئی ہے (دیکھو۔ ۔ Cambridge Bible. P. 216)

دوسری مثال ملاحظہ ہو: سیموئیل ۱۴ : ۱۸ کے موجودہ الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"اس وقت ساؤل نے اخیاہ سے کہا، خدا کا صندوق یہاں لا۔ کیونکہ خدا کا صندوق اس روز بنی اسرائیل کے درمیان تھا"

لیکن اسپٹواجنٹ میں یہ عبارت اس طرح ہے۔

"اس وقت ساؤل نے اخیاہ سے کہا کہ افود یہاں لا۔ کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کے روبرو اس روز افود پہنا تھا"

(باقی حاشیہ ص ۹ پر ملاحظہ ہو)

"لوگ ہارونؑ کے خلاف[۵۱]	The people Combined Against
متحد ہوئے اور اس سے کہا	"Haron" and Said Unto him,
کہ اٹھ ہمارے لئے معبود	Arise and make us gods
بنا کہ یہ مرد موسیٰؑ جو ہمیں	which shall go before us for
مصر کے ملک سے نکال	as for this Moses, The man that
لایا ہم نہیں جانتے	brought us out of the land of
کہ اُسے کیا ہوا۔	Egypt we wot not what is
	became of him (V.1.)

معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ[۵۲] آیت کے موجودہ عبرانی الفاظ سے کس قدر مطابق ہے؟ اگر موجودہ عبرانی الفاظ اس ترجمے کے متحمل ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس ترجمے کو رد کر دیا جائے۔ لیکن اگر موجودہ الفاظ اس قدیم ترجمے کے متحمل نہیں ہیں تو خود یہ ترجمہ اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ مترجموں کے پیشِ نظر اس آیت کے الفاظ نہ تھے، بہت سے دوسرے مقامات پر جہاں موجودہ عبرانی متن اور اسپٹواجنٹ ترجمے میں اختلافِ مفہوم نظر آتا ہے، علمائے بائبل کی اکثر یہی رائے ہوتی ہے کہ مترجمین اسپٹواجنٹ کے سامنے جو عبرانی متن تھا وہ موجودہ متن سے کچھ مختلف تھا، اس قدیم ترجمے کے ذریعے سے بائبل کے روائیزڈ ورشن (Revesed Version) کے متن کو درست کرنے کے لئے بہت

(صفحہ گزشتہ کا بقیہ حاشیہ) علمائے حال کا خیال ہے کہ اسپٹواجنٹ کا یہ ترجمہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ اسی کتاب (اسموئل) کے ساتویں باب میں (آیت ۱، ۲) یہ بتایا گیا ہے کہ اس وقت صندوق شہادت قریۃ یعاریم میں فلسطیون کے پاس تھا، اور جب تک داؤد نے اس کو دوبارہ حاصل نہیں کیا وہیں رہا۔ (Paterson. P. 194.)

ان دو مثالوں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسپٹواجنٹ ترجمہ کس قدر اہم ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ترجمہ بہمہ وجوہ صحیح اور درست تسلیم کیا جاتا ہے علمائے بائبل ان بڑی بڑی غلطیوں سے بھی واقف ہیں جو اس ترجمہ میں پائی جاتی ہیں۔

[۵۱] Henry gongh (new lestamant Quotations. P.P. 54.

[۵۲] عبرانی اور یونانی زبان سے قطعاً ناواقفیت کے باعث راقم الحروف کے پیشِ نظر صرف انگریزی کتابیں ہیں۔

مدد لی گئی ہے۔

بہر حال اس قدیم ترجمے کی یہ عبارت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ ہارونؑ کے خلاف ایک "بغاوت" تھی۔ اس بات کی مزید تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ یہودی روایات کے بموجب ہارونؑ کے بہنوئی "حور" جو موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ہارون کے برابر درجہ حکومت رکھتے تھے، اسی مطالبے کی مخالفت کے باعث شہید کر دیئے گئے[۵۱]! ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہم بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ طلائی معبود بنانے کا یہ مطالبہ ہارونؑ کی مخالفت میں تھا اور ایک طرح سے بغاوت تھی۔ میکلیر (G. F. Maclear) کا گمان ہے کہ غالباً یہ تجویز بعض مصریوں نے پیش کی تھی جو اسرائیلیوں کی مخلوط جماعت میں شامل تھے۔[۵۳]

دوسری آیت | اب دوسری آیت کو لیجئے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان لوگوں نے جو ہارونؑ کی مخالفت میں جمع ہوئے تھے، ایک معبود بنانے کا مطالبہ کیا تو ان سے ہارونؑ کا مطالبہ یہ تھا کہ "سونے کے زیور جو تمہاری بیویوں اور تمہارے بیٹوں اور بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے میرے پاس لاؤ"۔

مفسرین بائبل کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ زیوروں کا یہ مطالبہ صرف اس غرض سے کیا گیا تھا کہ شاید اسی طرح اس زر پرست قوم کا ذوقِ "صنم پرستی" سرد ہو سکے۔[۵۴]

ہم فی الحال مفسرین کی اس رائے کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ اس لئے کہ ہمارا ارادہ اس آیت نیز آیتِ مابعد پر ایک دوسری جگہ مفصل بحث کرنے کا ہے۔ ہماری رائے میں یہ آیت ہر اعتبار سے ان اہم آیتوں میں شامل ہے جن پر پوری طرح غور کرنا چاہیئے لیکن شاید یہ مناسب ہوگا کہ اول چوتھی آیت پر جو اس پوری بحث کی روحِ رواں کہی جا سکتی ہے غور کر لیا جائے۔ اس کے بعد ان متعلقہ

۵۱ Josephus Ant III. 2. 4.

۵۲ Geiger - Jnd & Islam P. 132, Smith Bib. Dic Calf. P.P. 243

۵۳ G. F. Maclear (O.T. History) P.P. 1120.

۵۴ Ingram Cobin. P. 100

آیتوں کا مفہوم سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی ۔ فی الحال یہاں اتنا سمجھنا کافی ہوگا کہ مفسرین کے نزدیک یہ زیور وہی تھا جو مہاجرت کے وقت بنی اسرائیل مصریوں سے لوٹ کر لائے تھے ۔ لہ

آیت کے ان الفاظ سے کہ سونے کے زیور جو تمہاری بیویوں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں" صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مال غنیمت کو بنی اسرائیل نے اپنی ذاتی ضرورتوں میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا ۔ اس آیت نیز آیت مابعد پر ہم (انشاء اللہ) ۲۴ ویں آیت کے ذیل میں غور کرینگے ۔

۳ سری آیت | یہ آیت فی الحقیقت دوسری آیت کا تتمہ اور چوتھی آیت کا دیباچہ ہے اس لئے علیحدہ بحث کی جگہ چوتھی آیت کے ساتھ ہی اس پر غور کرنا چاہئے ۔

۴ تھی آیت | چوتھی آیت دراصل اس پوری بحث کا مرکزی نقطہ ہے اور سچ پوچھئے تو صرف یہی ایک آیت ہے جس کی بنیاد پر ہارونؑ کی خطا کاری کا قلعہ تعمیر کیا گیا ہے، یہی وہ آیت ہے جو بیک وقت ہارون کی نبوت، قرآن کی صداقت اور خود بائبل کے عام بیانات کی تکذیب کرنے کے لئے بطور "حربہ" استعمال ہوتی ہے ۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کے ہر پہلو کو نہایت ہی احتیاط کے ساتھ جانچنا پڑے گا ۔

آیت کے الفاظ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری اور پانچویں آیت کی درمیانی کڑی ہے اور ہم ان دو آیتوں کے بغیر اس کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے ۔ اس لئے ان تینوں آیتوں کی واقعاتی ترتیب کو ذہن نشین کر لینا چاہئے ۔ جس کا حسب ذیل نتیجہ نکلے گا ۔

(الف) : لوگ سونے کا زیور ہارونؑ کے پاس لائے اور { ہارونؑ نے یہ زیور لیکر

(ب) : ایک بچھڑا ڈھالا اور اس کو حکاکی کے اوزار سے درست کیا }

(ج) : اور لوگوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے ۔

(د) : لیکن جب ہارونؑ نے یہ دیکھا تو ایک قربان گاہ بنائی اور منادی کی کہ کل خداوند (یعنی یہوواہ) کی عید ہے ۔

لہ Al Imqran Colbin. 100

اب ان بیانوں کے تضاد کو دیکھئے۔ لوگ سونے کا زیور ہارونؑ کے پاس لاتے ہیں، اور ہارونؑ بذاتِ خود اس طلائی انبار سے ایک بچھڑا ڈھال لیتے ہیں۔ اور اس کو حکاکی کے ہتیار سے خود درست کرتے ہیں۔ پھر بجائے اس کے کہ اختتام کار پر خود "ہارونؑ" اس بات کا اعلان کریں کہ اے "اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے" جس کی تم کو خواہش تھی! ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ اعلان کرتے ہیں اور اس علان کے جواب میں "ہارونؑ" کو ایک قربان گاہ بنانی پڑتی ہے اور یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ کل یہواہ کی عید ہے (تاکہ لوگوں کی توجہ اس طلائی معبود سے ہٹ کر "یہواہ[۵۱] کی طرف مائل ہو سکے)۔

کیا ان متضاد بیانات کو یونہی نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ بالفرض اگر چوتھی آیت کے معنی وہی ہیں جو عام طور پر بائبل کے ترجموں میں پائے جاتے ہیں، تو پھر پانچویں آیت کا کیا مطلب ہو گا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس "گوسالہ سازی" کو دیکھکر (بطور ردِ عمل) ہارونؑ نے ایک قربان گاہ بنائی اور اپنے معبود یہواہ کی عید کا اعلان کیا۔ چونکہ مفسرین بائبل ان دونوں آیتوں کے باہمی تعلق کو توڑ نہیں سکتے تھے اس لئے ان کو پانچویں آیت کی تشریح میں عجیب وغریب قیاس آرائیاں کرنا پڑیں۔

بعض مفسرین اس طرف گئے کہ قربان گاہ بنانا اور اعلانِ عید محض ایک تمسخر[۵۲] تھا جو ہارونؑ نے بیوقوف بت پرستوں کے ساتھ کیا۔ بعض نے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز تشریح یہ کی کہ سونے کا یہ بچھڑا حقیقتاً یہواہ ہی کی تمثیل[۵۳] تھا۔

یہ تمام غلط تاویلیں محض اس بات کا نتیجہ ہیں کہ بائبل ابتدائی ایام سے لیکر آخری دور تک ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہی جو اس کی صحیح نگہبانی نہیں کر سکتے تھے، حتی کہ آج ہمیں یہ تک معلوم نہیں

---

۵۱ یہودیوں کے نزدیک "یہواہ" خدا کا اسم ذات ہے (Dr. gust Fr Gehler P.P. 134.) یہ نام کسی دوسری ذات یا معبود کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا۔ یہودی اس کو اتنا مقدس اور پاک خیال کرتے تھے۔ کہ کوئی شخص اپنی زبان سے اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا (Josph. Ant II. 12. 4.) چنانچہ آج کل اس کا صحیح تلفظ بھی معرض بحث میں ہے۔ بائبل میں ہر جگہ لفظ "خداوند" اس نام کے ترجمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

۵۲ Henery & Seatl PP. 210

۵۳ Fuller on Exod XXXII

کہ جن اصل دستاویزوں سے یہ کتاب مرتب ہوئی ہے اور جن لوگوں نے اس کو ترتیب دیا ہے ان کی ثقاہت کس درجے کی تھی اور ان کی تشریحات اور ذاتی عقائد نے کہاں تک اس میں جگہ حاصل کی ہے[۵۱]۔ جب یہ حال متن کا ہے تو تراجم کا جو ہمیشہ کسی مخصوص جماعت کے معتقدات اور روایتی تشریحات کا نتیجہ ہوتے ہیں کیا حال ہو گا؟

یہی وجہ ہے کہ ہم اس کتاب میں اس قدر متضاد[۵۲] باتیں پاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیتیں اس وقت "چیستان" بنی ہوئی ہیں۔ چوتھی آیت کے مفہوم کو ایک مرتبہ غلط متعین کرنے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ نہ صرف پانچویں آیت بلکہ پورے باب کو ہم صحیح طور پر سمجھ سکیں اس لئے ہمیں سب سے پہلے چوتھی آیت کے صحیح مفہوم کو تلاش کرنا ہو گا، جو ظاہر ہے کہ مروجہ ترجمے کو مدنظر رکھ کر کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔

کیا ہم مروجہ ترجمے کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ترجمہ ان لوگوں کے علم و فہم کا نتیجہ ہے جو بہر طور ایک درجۂ فضیلت رکھتے ہیں اور ہمیں یہ اصول بھی تسلیم ہے کہ مستند ترجموں کو رد کرنا اس وقت تک کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ جب تک نئے ترجمے کی پشت پر کافی دلائل ترجیح نہ ہوں۔ لیکن اسی اصول کے پیشِ نظر میری رائے میں مروجہ ترجمہ قطعاً ناقابل قبول ہے۔ عین ممکن ہے کہ قواعد زبان کے اعتبار سے اس آیت کا ترجمہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہو لیکن واقعاتِ متعلقہ اور سیاق و سباق کو مدنظر رکھ کر اس کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص اس حالت میں کہ اس سے بہتر ترجمہ اور موجود ہو، میری مراد مشہور عالم دین شیکفرڈ[۵۳] (Shuckford.) کا ترجمہ ہے جس کو انگرام کابن (Ingram Cobin.) نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ چنانچہ شیکفرڈ کی سند سے کابن اس آیت کا ترجمہ اس طرح لکھتا ہے[۵۴]۔

---

۵۱ Willram Rathbour grig ch iii
۵۲ A. Churchward. Olig Evolut of Relig PP. 294. 295
۵۳ Inp Die of univers Biog. Div: XII. P. 979.
۵۴ Ingram Cobin. P.P. 100

آیت کے الفاظ یوں پڑھے جاتے ہیں۔ The words may be read,

اس نے ان کے ہاتھوں سے He receivd it at their hands
لیا اور ان لوگوں نے اس کو and they formd it in a
سانچے میں تشکیل دی[۱] اور انھوں نے mould and they made a
ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور motten calf and they
انھوں نے کہا کہ اے اسرائیل Said this is thy God O
یہ تیرا معبود ہے۔" [۲] Isriel. (Shuelf)

اس ترجمے کا مقابلہ مروجہ تراجم سے کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ تمام مروجہ ترجموں میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ یہ بچھڑا ہارونؑ نے ڈھالا اور اس کے بعد اس کی صورت "حکاکی" کے اوزار سے درست کی لیکن اس ترجمے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس "بچھڑے" کو ان لوگوں نے ڈھالا جنھوں نے طلائی معبود بنانے کا مطالبہ کیا تھا اور جن سے طلائی زیورات منگائے گئے تھے۔ نیز حکاکی کے اوزار کا بھی اس ترجمے میں کوئی پتہ نہیں، بلکہ جس لفظ کا ترجمہ حکاکی کا اوزار کیا جاتا ہے اسی لفظ کا ترجمہ یہاں mould (سانچہ) ہوا ہے اور اکثر علما کے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ موزوں ہے[۳]

سطور بالا میں اس اصول کو مان لیا گیا ہے کہ کوئی بھی غیر مشہور ترجمہ اس وقت تک قابلِ قبول نہیں۔ جب تک اس کو سیاق و سباق کی نیز دوسری قسم کی تائیدیں حاصل نہ ہوں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا وجوہ ہیں جن کی بنا پر اس ترجمے کو مروجہ تراجم پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

فی الحال اس باب کی کسی آیت یا اس پیراگراف کی کسی عبارت کا حوالہ دیکر شوقِ کلام کی ترجیح پیش کرنا اس لئے نامناسب ہے کہ ہنوز اس باب کی آیات پر غور ہو رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں

---

[۱] مقابلہ کیجئے "واتخذ قوم موسی من بعدہ من حلیھم عجلاً جسداً لہ خوار" (۷ : ۱۴۸)
[۲] مقابلہ کیجئے "فقالوا ھذا الٰھکم والٰہ موسیٰ فنسی" (۲۰ : ۸۸)
[۳] Smith Dic. of Bib Vol 1. PP 243.

معلوم ہوتی کہ خواہ مخواہ چند در چند بحثوں کو مخلوط کر دیا جائے، البتہ بائبل کے دوسرے مقامات پر نظر ڈال لینے میں کوئی حرج نہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان مقامات کی شہادت سے آپ کو یہ اندازہ ہو سکیگا کہ بائبل کے کسی مصنف نے کسی عہد میں بھی اس آیت کا وہ مفہوم نہیں سمجھا جو عام ترجموں میں پایا جاتا ہے بخلاف اس کے ہر مصنف نے اس آیت کا وہی مفہوم سمجھا جو اس "نئے ترجمے" نے پیش کیا ہے یعنی یہ بچھڑا ہارونؑ نے نہیں بلکہ ان لوگوں نے بنایا تھا جو ہارونؑ کی مخالفت میں جمع ہوئے تھے اور جنھوں نے ایک معبود بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔

پہلی شہادت | بہ اعتبار ترتیب "کتاب استثنا" پہلی کتاب ہے جس میں اس واقع کو دُہرایا گیا ہے اور چونکہ یہ کتاب خمسۂ موسوی میں شامل ہے اس لئے اس کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کیا اس کتاب میں یہ الزام ہارون پر لگایا گیا ہے؟ یا آیت زیر بحث کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ اس طلائی بچھڑے کو بنانے والی بنی اسرائیل کی عام جماعت تھی؟ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:۔

"اور خداوند نے مجھ سے فرمایا کہ اٹھ اور یہاں سے نیچے جا کیونکہ تیری قوم جسے تو مصر سے نکال لایا خراب ہو گئی وہ اس راہ سے جو میں نے انھیں بتائی جلد باہر ہو گئے۔ انھوں نے اپنے لئے ایک مورت ڈھال کے بنائی۔ (استثنا ۹: ۱۲)

اس کے بعد ۱۶ ویں آیت میں فرماتے ہیں۔

تب میں نے نگاہ کی اور دیکھو تم نے خداوند اپنے خدا کا گناہ کیا تھا اور اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا، تم بہت جلد اس راہ سے جو خداوند نے تمہیں بتائی باہر گئے تھے" (استثنا ۹: ۱۶)

اس کے بعد لوحیں توڑنے کا واقعہ بیان کر کے فرماتے ہیں۔

اور خداوند کا بڑا غصہ ہارون پر بھی بھڑکا[1] اور اسے ہلاک کرنے کو تھا۔ میں نے اس وقت

---

[1] یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ کتاب خروج کی نہ کوئی "یہوائی" اور نہ "الوہیمی" روایت اس غصہ کی حامل نظر آتی ہے دیکھو (Cantridge Bib. P.359) میں ڈرایور (Driver) کا نوٹ۔

ہارونؑ کے لئے بھی دعا[1] مانگی۔ اور میں نے تمہارے گناہ کو یعنی بچھڑے کو جو تم نے بنایا تھا لیا اور آگ میں جلایا" (استثنا ۹: ۲۰، ۲۱)

استثنا کی ان آیتوں کو پڑھنے کے بعد ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ان آیات میں بچھڑا بنانے والوں کے لئے جمع کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں — "انھوں نے اپنے لئے ایک صورت ڈھال کے بنائی" — "تم نے خداوند اپنے خداوند کا گناہ کیا تھا اور ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا تھا" — "میں نے تمہارے گناہ کو یعنی بچھڑے کو جو تم نے بنایا تھا لیا اور آگ میں جلایا" — یہ تمام ضمیریں ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے استعمال ہوئی ہیں نہ کہ ہارونؑ کے لئے۔

مندرجہ بالا آیات سے اب اس نئے ترجمے کا مقابلہ کیجئے جس میں بالکل اسی طرح جمع کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں — "اور انھوں نے اس کو سانچے میں تشکیل دی اور انھوں نے ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا" — وغیرہ

کیا استثنا کی ان ضمیروں کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نیا ترجمہ غلط ہے —؟ کیا ضمیروں کی یہ یگانگت اس نئے ترجمے کو صحیح قرار دینے کے لئے کافی نہیں —؟ اب ایک مرتبہ پھر مندرجہ بالا آیات کو پڑھئے اور دیکھئے کہ کیا ان میں کوئی ایسا لفظ یا اشارہ موجود ہے جس کی بنا پر کوئی یہ کہہ سکے کہ یہ بچھڑا ہارونؑ نے بنایا تھا۔؟ اس بات سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مصنف استثنا کے نزدیک بھی اس چوتھی آیت کا بالکل وہی مفہوم تھا جو اس نئے ترجمے سے پیدا ہوتا ہے۔

شاید کوئی کہے کہ استثنا کی '۲۰ ویں' اور '۲۱ ویں' آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں خدا کا غصہ ہارونؑ پر بھی "بھڑکا" تھا، اس لئے وہ بھی شریک جرم تھے؟ لیکن میری رائے میں یہی دو آیتیں ہارونؑ کی برأت کی سب سے بڑی دلیل ہیں، اس لئے کہ یہاں ہارون اور بنی اسرائیل کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے اور بچھڑا بنانے کے فعل کو صراحتاً بنی اسرائیل کی عام جماعت سے متعلق کیا ہے نہ کہ ہارونؑ سے۔

---

[1] مقابلہ کرو۔ قال رب اغفرلی ولاخی وادخلنا فی رحمتك (۷: ۱۵۱)

باقی ہارونؑ پر عتاب الٰہی کیوں بھڑکنے کو تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ موسیٰ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے حاکم تھے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ پوری شدت سے اس فعل کو روکتے، چاہے اس کا نتیجہ ان کے حق میں کچھ بھی نکلتا۔

۲سری شہادت | کتاب استثنا کے بعد دوسری کتاب جس میں واقعے کا حوالہ ملتا ہے "نحمیاہ" کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے نویں باب میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے۔

"پر تو خدائے غفور ورحیم وکریم ہے، قہر میں دھیما اور مہربانی میں بڑھ کر سو تو نے انھیں ترک نہ کیا، ہاں جب انھوں نے اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا تھا اور کہا تھا اے اسرائیل یہ تیرا معبود ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا" (نحمیاہ ۹: ۱۸)

نحمیاہ کی یہ عبارت خاص طور پر بہت ہی اہم ہے اور ہمارے پیش کئے ہوئے ترجمے کی گویا ایک قدیم دستاویزی شہادت ہے۔ سطور بالا کو ذرا غور سے پڑھئے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ عبارت حقیقتاً آیت زیر بحث ہی کا ایک حوالہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کتاب نحمیاہ کے پیش نظر اس عبارت کے لکھتے وقت یہ آیت کھلی رکھی تھی اس لئے کہ اس میں ایک پورا کا پورا جملہ بجنسہ اسی آیت کا نقل ہوا ہے۔ یعنی

"اے اسرائیل، یہ تیرا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا"

اب ملاحظہ ہو کہ مصنف نحمیاہ نے اس آیت کا مفہوم کیا سمجھا؟ ٹھیک وہی جو ہمارے نئے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے، یعنی یہ بچھڑا بنی اسرائیل کی "باغی" جماعت نے بنایا تھا نہ کہ ہارون نے۔

وہی جمع کی ضمیریں جو ہمارے ترجمے میں پائی جاتی یہاں بھی بجنسہ موجود ہیں۔ کیا اس قدیم دستاویزی شہادت کی بنیاد پر ہم اس نئے ترجمے کو صحیح نہیں قرار دے سکتے؟

۳سری شہادت | کتاب نحمیاہ کے بعد ہمیں "زبور" میں ایک ایسی عبارت ملتی ہے جس سے اس ترجمہ کی پوری پوری صداقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ راقم زبور خدا کی ستائش کے بعد بنی اسرائیل کے بہت سے

۱؎ دیکھو استثنا ۹: ۱۷۔

دوسرے گناہ گناکر اس طلائی بچھڑے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں

"انھوں نے جنگل میں حرص سے خواہش کی اور بیابان میں خدا کو آزمایا۔ اس نے ان کا مطلب روا کیا، پر اُن کی جانوں میں لاغری بھیجی۔ انھوں نے خیمہ گاہ میں موسیٰ پر اور خداوند کے "مقدس مرد" ہارونؑ پر حسد کیا۔ سوزمین پھٹی اور "داتن" کو نگل گئی اور ابرام کی جماعت کو ڈھانپ لیا۔ ان کی جماعت میں آگ بھڑکی، اس شعلے نے شریروں کو بھسم کر دیا۔ انھوں نے حورب میں ایک بچھڑا بنایا، اور ڈھالی ہوئی مورت کے آگے سجدہ کیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے جلال کو ایک بیل کی تشبیہ سے جو گھاس کھاتا ہو بدل ڈالا" (زبور ۱۰۶: ۱۴ تا ۲۰)

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ "صاحبِ زبور" کے پیشِ نظر آیت زیرِ بحث کا وہی مفہوم تھا جو ہم کو عام ترجموں میں نظر آتا ہے؟ کیا یہ عقیدہ کہ طلائی بچھڑا "خداوند کے مقدس مرد ہارونؑ" نے بنایا تھا، اس زبور کے مصنف کے وقت میں موجود تھا؟ یہاں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ ہارونؑ کے خلاف بنی اسرائیل میں ایک جماعت تھی جس کو معجزانہ طور پر سزا دی گئی۔

یہاں تک بائبل کے "عہدِ عتیق" کی شہادتوں کی روشنی میں اس ترجمے کی صداقت پر بحث کی گئی ہے اور اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ "طلائی بچھڑے" کے متعلق کوئی حوالہ ترک نہ ہونے پائے۔ اب عہدِ جدید کو لیجئے۔

ہمتی شہادت | "عہدِ جدید میں اس بچھڑے کا ذکر صرف ایک مقام پر ملتا ہے۔ سینٹ اسٹیفنس (St. Stephens) نے جن کی مظلومانہ شہادت یہودیوں کی قساوتِ قلبی کا نمونہ ہے اپنے آخری خطبے میں یہودیوں پر بہت سے الزام عائد کئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک الزام یہ بھی ہے کہ انھوں نے موسیٰ اور موسیٰؑ کے خدا کی کبھی تابعداری نہیں کی: فرماتے ہیں۔

"پر ہمارے باپ دادوں نے اس کا تابعدار ہونا نہ چاہا بلکہ اس کو رد کیا اور ان کے دل مصر کی طرف پھرے اور ہارونؑ سے کہا کہ ہمارے لئے ایسے معبود بنا جو ہمارے آگے چلیں۔

• کیونکہ یہ موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا، اور ان دنوں انھوں نے ایک بچھڑا بنایا اور اس بت کو قربانی چڑھائی بلکہ اپنے ہاتھوں کے کام پر خوشی منائی۔" (اعمال ۷: ۳۹ تا ۴۱)

عبارتِ بالا کو بغور پڑھئے۔ اس میں کتاب خروج کے زیرِ بحث باب کی "پہلی" اور "چوتھی" آیت کا کھلا حوالہ موجود ہے۔ اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ کیا سینٹ اسٹیفنس کے پیشِ نظر آیت زیرِ بحث کا وہی مفہوم تھا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، وہ اس بات کا توصراحت کے ساتھ اظہار کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل نے "ہارون" سے کہا کہ "ہمارے لئے معبود بنا" لیکن بچھڑا بنانے کا مجرم ہارون کی جگہ ان لوگوں کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے طلائی معبود بنانے کا مطالبہ کیا تھا چنانچہ ان کے یہ الفاظ کہ :-

"ان دنوں انھوں نے ایک بچھڑا بنایا اور اس بت کو قربانی چڑھائی۔"

اس پر کھلی شہادت ہیں۔ اسی ذیل میں انھوں نے دو الزام بنی اسرائیل پر اور عائد کئے ہیں اول یہ کہ : ان لوگوں کا یہ فعل عدم تابعداری یا بالفاظِ دیگر "بغاوت"[۵۱] پر مبنی تھا۔ دوم یہ کہ : ان لوگوں کے دل مصری رسوم کی طرف پھر گئے تھے۔[۵۲]

---

[۵۱] دیکھو استثنا ۹ : ۷۔ [۵۲] تقریباً تمام بڑے بڑے مفسرین کی رائے تو یہی ہے کہ "طلائی بچھڑا" مصریوں کے مذہب کا پرتو تھا (دیکھئے H. & Scoott اور Dr Gust Frohler. P. 94 ....) لیکن زمانۂ حال کے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ مصری مذہب کا خاکہ نہیں تھا بلکہ کنعانی مذہب کے اثر کا نتیجہ تھا (Ency of Relg P. 84) میکلسٹر (Stuart Macalester. P. 116.) نے اپنی کتاب میں (جو فلسطین کے آثار قدیمہ پر لکھی گئی ہے) اس خیال پر بعض دلائل بھی قائم کئے ہیں جن میں سے پہلی دلیل کچھ وزن رکھتی ہے جو یہ ہے کہ "مصری ہمیشہ زندہ بچھڑے کی پرستش کرتے تھے اس کے بے جان بت کی نہیں۔"

زمانۂ حال کی ایک بالکل جدید تالیف (Legacy of Egypt) میں آسٹرلی (W.O.E. Oestrley) نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ یہ بچھڑا کنعانی مذہب سے متعلق تھا، یہ بتایا ہے کہ اسرائیلیوں کا یہ "طلائی معبود" حقیقتاً "ہاتھور" (Hathor) مصری دیوی کی نقل تھا جس کا ایک مجسمہ امینوفس ثانی کے زمانے کا قاہرہ کے عجائب خانے میں رکھا ہے۔ اس دیوی کا سر گردن اور سینگ سونے سے ملبوس تھے۔ اسرائیلی دیوتا کو "سنہری بچھڑے" کے نام سے مشہور کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس دیوی کو "سنہری" یا "دیوتاؤں کا سونا" کہا جاتا تھا۔

اب ہمارے نئے ترجمے سے سینٹ اسٹیفنس کی مذکورہ بالا عبارت کا مقابلہ کیا جائے تو دونوں کے مفہوم میں مشابہتِ تامہ نظر آئے گی اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ خروج کے متن کا عیسائیوں کے ابتدائی عہد میں یہی مطلب سمجھا جاتا تھا۔

بائبل کے ان حوالوں کو مدنظر رکھ کر کیا اب بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مروجہ ترجمہ کے مقابلہ میں یہ نیا ترجمہ زیادہ صحیح اور زیادہ قابل ترجیح ہے۔ جب بائبل کے دوسرے مقامات پر کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جس سے ہارونؑ کی "بت سازی" کی طرف ادنیٰ ترین شبہ بھی ہوسکے، تو پھر ہم کس بنیاد پر ایک اعلیٰ ترجمے کو تبرک کر کے ایک مشتبہ اور قابلِ انکار ترجمہ کو قبول کر لیں۔ گو میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اس آیت کا یہ نیا ترجمہ ہمیں معلوم نہ ہوتا تو بھی ہم بائبل کے دوسرے مقامات کی شہادت کی بنا پر یہ سمجھتے کہ اس آیت کے الفاظ کی کتابت میں کوئی شدید ترین غلطی ہوئی ہے۔[۵۱]

۵ ویں شہادت | عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی ان صاف وصریح شہادتوں پر یہودی روایات وعقائد کا اضافہ غیر ضروری سی بات ہے لیکن محض اتمامِ حجت کے لئے ان پر بھی نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ تالمود میں جو یہودیوں کے نزدیک بائبل کو سمجھنے کا ایک نہایت ہی اہم ذریعہ ہے ایک طویل روایت ملتی ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

> "دس امتحانات کے ذریعے سے خدائے قدوس، تبارک وتعالیٰ نے ہمارے اجداد کو آزمایا۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔ بیابان میں، میدان میں، اصف کے بالمقابل، فاران کے درمیان اور توفل اور لابن اور حضیروت اور ذی ذہب "[۵۲]

آگے چل کر روایت میں ان تمام مقامات پر جو آزمائشیں ہوئیں مجملاً درج ہیں۔ چونکہ یہ آزمائشیں ہمارے موجودہ مبحث سے قطعاً غیر متعلق ہیں اس لئے صرف "بیابان" اور "ذی ذہب" کی آزمائش کو یہاں درج کیا جاتا ہے جو ہمارے موجودہ موضوع سے متعلق ہیں پہلی یعنی بیابان کی آزمائش کے متعلق حسب ذیل تشریح ملتی ہے۔

---

۵۲ Talmud Vol I (IX) Tract Aboth CH. V. PP. III.

"بیابان میں"۔ انھوں نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا جیسا کہ مذکور ہے۔ انھوں نے اپنے لئے ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا۔

"In the wilderness," they made the golden calf as it is written they have made the molten calf

اب ملاحظہ ہو کہ اس روایت میں بھی بائبل کی طرح سونے کا بچھڑا بنانے والوں کے لئے جو ضمیریں استعمال ہوئی ہیں وہ سب جمع کی ہیں۔ جس سے ہمارے ترجمے کی نہ صرف تائید ہوتی ہے بلکہ ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نہ صرف عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے مصنفین بلکہ یہودی علما بھی اس فعل (گوسالہ سازی) کو بنی اسرائیل کی جماعت سے متعلق سمجھتے تھے اور ہارونؑ کے متعلق ان کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس خیال کی مزید تصدیق اسی روایت کے اس مقام سے ہوتی ہے جہاں "ذی ذہب" کی آزمائش کی تشریح کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ذی ذہب" سے کیا مراد ہے؟ — ہارونؑ نے ان سے (یعنی بنی اسرائیل) سے کہا کہ تمہارے لئے اس سونے کا گناہ کافی ہے جو تم بچھڑے کے لئے لائے۔ ربی العزر بن یعقوب کا قول ہے کہ یہ گناہ جس کی معصیت میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے قیامت تک کے لئے کافی ہے۔

"What dose Dizahab" refer to? "Haron Said to then, you have enough of the Sin of the gold which you brought for the Calf". R. Eleezer b. jacab Said "with which the Israilites were affecteted is enough for that Time Till the resurrition of the Dead ۵۱

---

۵۱ Talmud Vol 1(IX) Tract aboth Ch. V. PP 111.

اب ملاحظہ فرمائیے کہ: ذی ذہب کی اس تشریح میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ خود ہارونؑ نے اس گناہ کو بنی اسرائیل پر عائد کیا ہے۔ کیا اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہارون خود اس گناہ کے حامل تھے؟ اس سلسلہ میں صرف ایک آخری بات مجھے اور کہنا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہودی عقیدے کے بموجب یہ "طلائی معبود" ہارونؑ کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے بنایا تھا۔ چنانچہ وہ صحیح یا غلط، بنانے والے کو نامزد بھی کرتے ہیں۔

ربی ابراہیم گیگر (R.A. geeger) مشہور یہودی عالم نے اپنی کتاب یہودیت اور اسلام[۱] میں قرآن کے اس بیان کو کہ یہ بچھڑا ہارونؑ نے نہیں بلکہ ایک دوسرے شخص نے بنایا تھا یہودی الاصل قرار دیا ہے وہ لکھتا ہے:۔

"یہ بات یہودیوں کی روایات سے باہر نہیں ہے کہ ایک دوسرے اسرائیلی نے نہ کہ ہارونؑ نے یہ بچھڑا بنایا تھا اور ایک افسانے کے بموجب میکاہ نے جس کا تذکرہ کتاب قضاۃ میں ہے اس کے بنانے میں مدد کی تھی۔" [۲]

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو یہودی ان روایات کے بموجب ہارونؑ کو "گوسالہ ساز" نہیں جانتے تھے، وہ اس آیت کا ترجمہ کیا کرتے تھے؟ کیا وہ مروجہ ترجمے کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ عقیدہ رکھ سکتے تھے کہ گوسالے کا بنانے والا شخص ہارونؑ کے علاوہ کوئی دوسرا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی رائے میں مروجہ ترجمہ یقیناً غلط اور ایک بہتانِ عظیم کے مترادف ہوگا۔

۵ ویں آیت ہر چند چوتھی آیت کے ضمن میں اس آیت پر بھی سرسری نظر ڈالی جا چکی ہے، لیکن اس کی تفسیروں سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس پر جداگانہ بھی تھوڑا بہت غور کر لیا جائے آیت کے الفاظ پھر ذہن نشین فرمالیجئے۔

"اور جب ہارونؑ نے یہ دیکھا تو اس کے سامنے ایک قربان گاہ بنائی اور ہارون نے یہ

---

[۱] Judaism and Islam.

[۲] geeger P.P. 131.

کہہ کے منادی[۱] کی کہ کل یہواہ کے لئے عید ہے۔"

اس آیت کی عجیب عجیب تشریحیں کی گئی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف ایک قسم کی ظرافت[۲] تھی جو ہارون ؑ نے ان بیوقوف بت پرستوں کے ساتھ کی، بعض دوسرے صاحبان کا جو اس آیت کا تعلق آیتِ ماسبق سے قائم کرتے ہیں یہ قیاس ہے کہ چونکہ اس میں "یہواہ کی عید" کا ذکر ہے اس لئے یہ طلائی بچھڑا حقیقتاً یہواہ کی تمثیل تھی اور اس بنا پر ان کی رائے ہے کہ ہارون اور بنی اسرائیل دونوں نے اس بچھڑے کو بت پرستانہ نظر سے نہیں[۳] دیکھا۔

ظاہر ہے کہ یہ مضحکہ انگیز تاویلیں جو بائبل کے تمام مقامات کے خلاف ہیں محض اس لئے کرنا پڑیں کہ آیتِ ماسبق کا غلط ترجمہ کرنے کے بعد اس آیت کی کوئی اچھی تشریح سمجھ میں نہیں آسکتی تھی، ہمارے نزدیک اس آیت کا مطلب بالکل صاف ہے اور خود اس آیت کے الفاظ ہی ان کی تشریح ہیں یعنی

"جب ہارون ؑ نے یہ دیکھا کہ لوگوں نے ایک طلائی بچھڑا بنایا ہے تو (ان کی اس نئے دیوتا یا بقول سینٹ اسٹیفنس مصری دیوتا سے توجہ ہٹانے کے لئے اور سچے خدا کی طرف مائل کرنے کے لئے) انھوں نے اس کے سامنے (نہ کہ اس کے لئے) ایک قربان گاہ بنائی اور یہ کہہ کے منادی کی کہ کل یہواہ کی عید ہے۔"

اس آیت کے کلیدی الفاظ حسب ذیل ہیں۔

---

[۱] مقابلہ کیجئے ولقد قال لھم ھارون من قبل یا قوم انما فتنتم بہ وان ربکم الرحمٰن فاتبعونی واطیعوا امری (۲۰: ۹۰)

[۲] Haron was willag yet furthen to burman then & he built an alter & Proclamed a feast (Henry & Scott) P. 210.

[۳] Vers 5 Shouy that mither he nor ther people looked up The golden Calf as god beet a Sy m bob an upsesentatives of god who brought then up (Fullezan Exd XXII)

(۱) جب ہارونؑ نے یہ دیکھا تو

(۲) یہ کہہ کے منادی کی کہ کل یہواہ کے لئے عید ہے۔

ان الفاظ کی موجودگی میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہارونؑ نے "طلائی بچھڑے کی بدعت کو دیکھکر "یہواہ کے لئے" نہ کہ اوس "طلائی معبود" کے لئے عید کا اعلان کیا۔

آیت کے بالکل ابتدائی الفاظ (جب ہارونؑ نے یہ دیکھا تو) سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ ہارونؑ نے کیا وہ کسی گذشتہ عمل کا ردِ عمل تھا۔ اور آخری الفاظ (یعنی "یہواہ کے لئے عید ہے") سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ردِ عمل طلائی معبود کی مخالفت اور یہواہ کی حمایت میں تھا۔ چونکہ یہ آیت پچھلی آیت سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے ہمارے نئے ترجمے کے ساتھ اسے پڑھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ اس تشریح کے ہوتے ہوئے مذکورہ بالا عجیب وغریب اور دور از کار تاویلوں کی ضرورت باقی رہتی ہے؟

یہاں ہارونؑ کی "تعمیر قربان گاہ" کے نتائج پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس قربان گاہ کا بنانا بنی اسرائیل کے "طلائی معبود" بنانے کا ایک عابدانہ ردِ عمل تھا، ورنہ ہارونؑ کی نرم حکمتِ عملی بنی اسرائیل کو گمراہ ہونے کا پہلے ہی موقع دے چکی تھی۔ ہر چند کہ اس نیک نفس پیغمبر کا یہ منشا

ل مفسرین بائبل اگر اس آیت کی تفسیر کرتے وقت خود اسی کتاب خروج کے سب سے مشہور باب (یعنی ۲۰ ویں باب) کو پیش نظر رکھتے، تو عین ممکن تھا کہ وہ اتنی بڑی غلطی سے بچ جاتے۔ یہ وہی باب ہے جو ہر روز ایک ایک یہودی اور عیسائی کی نظر سے نہایت ہی فخر و عقیدت کے ساتھ گزرتا ہے۔ اس لئے کہ اسی باب میں مشہور احکام عشرہ پائے جاتے ہیں۔ خدا احکام عشرہ دینے کے فوراً بعد موسیٰ کی وساطت سے بنی اسرائیل کو ہدایت فرماتا ہے۔

"تم میرے مقابل چاندی کے معبود، بت بنائیو اور نہ اپنے لئے سونے کے معبود"
"تو میرے لئے مٹی کی قربان گاہ بنائیو اور تو اپنی سوختنی قربانیاں اور اپنی سلامتی کی قربانیاں اپنی بھیڑوں اور اپنے بیلوں میں سے وہاں ذبح کیجیو ..." (۲۴ و ۲۳)

ان آیتوں کو سامنے رکھکر اب دیکھئے کہ ہارونؑ نے یہ قربان گاہ کس جذبے کے ماتحت بنائی۔ سونے کا معبود جو بنی اسرائیل بنا چکے تھے، یقیناً خدائی احکام سے سرتابی تھی۔ ہارونؑ نے ان کو عملاً بیسویں باب کے اس حکم کو یاد دلایا اور اعلان کیا کہ کل یہواہ کے لئے عید ہے، تاکہ لوگ سوختنی قربانیاں اور سلامتی کی قربانیاں اس قربان گاہ پر لائیں۔

نہیں ہوگا کہ جماعت میں کوئی اختلاف پیدا ہو لیکن " دو معبودوں " کی موجودگی صاف بتا رہی ہے کہ جماعت میں اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اس باب کی آیات (۱۷، ۱۸، ۲۵، ۲۶) اسی اختلاف کی شاہد ہیں۔ اس اختلاف و تقسیم کے بعض عمدہ نتائج بھی نکلے یعنی عین ممکن تھا کہ موسیٰؑ کی آمد تک پوری جماعت گمراہ ہو چکی ہوتی اور موسیٰؑ کی قائدانہ پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لئے ایک متنفس بھی نظر نہیں آتا

۶ ٹی آیت | چھٹی آیت سے (جو اس پیراگراف کی آخری آیت ہے) معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک طرف "طلائی معبود" اور " دوسری طرف " قربان گاہ " بن چکی اور " یہواہ کے لئے عید کی منادی " ہوئی تو اب ہر دو معبودوں کے پرستاروں میں نہایت دھوم دھام سے دینی مراسم ادا کرنے کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پورے جوش و خروش کے ساتھ دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے مذہبی فرائض کو انجام دیا۔ آیت کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذاریں اور لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے"

اس عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام افعال مشترک طور پر ایک ہی دیوتا کے لئے ہو رہے تھے لیکن اگر غور کیجئے تو اس آیت میں نہ صرف دو قسم کے افعال نظر آتے ہیں یعنی

(الف) وہ افعال جو موسوی شریعت کے مطابق ہیں۔

(ب) وہ اعمال جو بت پرستوں کے طریق عبادت سے مشابہ ہیں۔

بلکہ دو مستقل جملے ملتے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے مفہوم کے اعتبار سے مکمل اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ہے غور فرمایئے

(الف:-) اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں۔

(ب) اور لوگ کھانے پینے بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔ [1]

---

[1] یہ کیفیت صرف اردو بائبلوں ہی میں نہیں بلکہ انگریزی اور عربی کے تراجم میں بھی یہ دونوں جملے اسی ہیئت سے نظر آتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل متن میں بھی اس آیت کی شکل یہی ہے۔

A { And they rose up early on the morrow & offered
burnt offerings & brought peace offerings .

(باقی دوسرے صفحہ پر)

ملاحظہ ہو کہ پہلا جملہ "وہ" کی ضمیر (جمع) سے شروع ہوتا ہے جو یقیناً ان لوگوں کی طرف راجع ہے جنھوں نے ہارونؑ کی دعوت یا منادی کو قبول کیا۔ دوسرا جملہ کسی ضمیر سے نہیں بلکہ ایک مستقل لفظ "لوگ" سے شروع ہوتا ہے جس سے بنی اسرائیل کی عام جماعت یا بت پرست لوگ مراد ہیں۔

ہماری اس تشریح کی تائید سینٹ پال (St Paul.) کے اس خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے قرنیتون کو لکھا۔ سینٹ پال نے صرف آخری جملے کو بت پرستوں کی طرف منسوب کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"اور تم بت پرست نہ بنو جس طرح ان میں کئی ایک تھے۔"

"جیسا کہ لکھا ہے: کہ یہ قوم کھانے پینے بیٹھی پھر ناچنے اٹھی۔"[1] (اقر ۱۰: ۷)

ظاہر ہے کہ سینٹ پال نے اسی آیت کا یہاں حوالہ دیا ہے اور صرف آخری جملہ بت پرستوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ خود زیر نظر باب کی ۱۹ ویں آیت سے ہمارے خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سینٹ پال کے نزدیک پوری جماعت بت پرست نہیں تھی بلکہ ان میں سے "کئی ایک" بت پرست تھے اور واقعہ بھی یہی ہے جیسا کہ آئندہ مباحث سے ظاہر ہوگا۔

صرف ایک بات یہاں اور واضح کرنا ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کا اپنے اس طلائی معبود کے سامنے کھیلنا کودنا جس کو سینٹ پال نے "ناچنا" قرار دیا ہے، فراعینِ مصر کی قدیم سنت کے مطابق تھا۔ جیسا کہ سینٹ اسٹیفنس نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مصریوں کی کتاب میت (Book of the dead) کے دیباچہ میں "بج" (Budge) نے اس رسم کو فراعین کی طرف منسوب[2] کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے عوام فراعین کی سنتوں کے کس قدر خوگر ہو چکے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

B { And the people Sat down to eat and drink & rose up to play.

عربی ترجمہ ملاحظہ ہو:۔ الف:۔ فبكروا في الغد واصعدوا محرقات وقدموا ذبائح سلامة

ب:۔ وجلس الشعب للاكل والشرب ثم قاموا للعب۔

میری رائے میں مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر یہ (غالباً) دو علیحدہ علیحدہ آیتیں ہیں جن کو ایک قرار دے دیا گیا ہے۔

[1] مقابلہ کیجیے:۔ قالوا لن نبرح عليه عاكفين حتى يرجع الينا موسى (۲۰: ۹۱)

[2] Book of the dead Vol I PP. xxxv

دوسرا پیراگراف

۷۔ تب خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اتر جا، کیونکہ تیرے لوگ جنھیں تو مصر کے ملک سے چھڑا لایا اب ہو گئے۔ [۱]

۸۔ وہ اس راہ سے جو میں نے انھیں فرمائی جلد پھر گئے، انھوں نے اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کر کے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے چھڑا لایا۔

۹۔ پھر خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے۔

۱۰۔ اب تو مجھے چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انھیں بھسم کروں اور میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤں گا

۱۱۔ تب موسیٰؑ نے خداوند اپنے خدا کے آگے منت کر کے کہا کہ اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر جنھیں تو شہزوری اور زبردستی کے ساتھ مصر کے ملک سے نکال لایا بھڑکتا ہے۔

۱۲۔ کس لئے مصری بولیں اور کہیں کہ وہ ان میں یہاں سے بدی کے لئے نکال لے گیا تاکہ ان کو پہاڑوں میں مار ڈالے اور ان کو روئے زمین پر سے ہلاک کرے؟ اپنے غضب کے بھڑکنے سے باز رہ اور اپنے لوگوں کو بدی پہنچانے سے پھر جا۔

۱۳۔ تو ابرہام اور اضحاق اور اسرائیل اپنے بندوں کو یاد کر جن سے تو نے اپنی ہی قسم کھائی اور ان سے کہا کہ میں تمہاری نسل کو آسمان کے تاروں کی مانند بڑھاؤں گا اور یہ سارا ملک جس کے حق میں کہا سو میں تمہاری نسل کو بخشوں گا کہ ابد تک اس کے مالک ہوں۔

۱۴۔ تب خداوند اس بدی سے جو چاہتا تھا کہ اپنے لوگوں سے کرے پچھتایا۔

مندرجہ بالا پیراگراف کی ہمیں صرف دو تین ابتدا کی آیتوں پر غور کرنا ہے باقی آیات ہمارے موجودہ بحث سے غیر متعلق ہیں اس لئے ہم نے ان آیتوں کو دوسری آیتوں سے ممتاز کر دیا ہے۔

---

[۱] قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ (۲۰، ۸)

۷ویں اور ۸ویں آیت | اول ساتویں اور آٹھویں آیت کو لیجئے۔ اگر ہم ان آیتوں کو عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اپنے پورے اور سچے علم سے موسیٰ کو اطلاع دے رہا ہے کہ

"انھوں نے اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کرکے کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا معبود ہے۔"

اب اس اطلاع کے الفاظ میں وہی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں، جو ہمارے نئے ترجمے میں نظر آتی ہیں۔ اس لئے ہم بربنائے استشہاد پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا نیا ترجمہ یقیناً ٹھیک ہے بالخصوص اس لئے کہ خدا نے بھی اس فعل کو اسرائیلیوں کی عام جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ لوگوں کی ذہنیت پر مذہبی دباؤ ڈال کر فائدہ اٹھائیں اس لئے ان دونوں آیتوں پر تنقیدی نظر ڈالنا چاہئے اب دیکھئے کہ ۸ویں آیت کے آخری حصے میں بجنسہ چوتھی آیت کا ایک پورا جملہ نقل ہوا ہے یعنی۔

"اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے چھڑا لایا۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ مصنفِ خروج چوتھی آیت کے مفہوم کو یاد دلانا چاہتا ہے تو اب جو مفہوم چوتھی آیت کا ہوگا، وہی اس آٹھویں آیت کا ہوگا اور جو مطلب اس آٹھویں آیت کا ہوگا وہی چوتھی آیت کا ہونا چاہئے۔ اس آٹھویں آیت میں بالاتفاق تمام ضمیریں جمع کی ہیں جو بنی اسرائیل کی عام جماعت کی طرف راجع ہیں۔ لہذا چوتھی آیت میں بھی یہ فعل بنی اسرائیل کی طرف منسوب ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطابقت صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اس آٹھویں آیت کے ترجمے کو جو متفق علیہ ہے مدنظر رکھکر ہم چوتھی آیت کا ترجمہ کریں۔ اس طرح ہمارا "نیا ترجمہ" مروجہ ترجمے کے مقابلے میں یقیناً صحیح ہے۔

یہاں دو ایک باتیں اور قابلِ لحاظ ہیں۔

پانچویں آیت کے ذیل میں ہم ایک مسیحی مفسر کی رائے پڑھ آئے ہیں کہ اس طلائی بچھڑے پر نہ ہارونؑ نے اور نہ بنی اسرائیل نے ایسی کوئی نظر ڈالی کہ گویا یہ "بچھڑا" خدا ہے۔

اب یہاں خود "یہواہ" فرماتا ہے کہ "انھوں نے اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کرکے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے!" کیا کسی "طلائی بچھڑے" کو پوجنے اور

اس پر قربانی چڑھائے" اور اسے معبود کہنے کے بعد بھی یہ بچھڑا دیوتاؤں کی فہرست میں شامل نہیں ہوگا؟ اسی طرح بعض لوگوں کو اس آٹھویں آیت کے الفاظ "اور اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کرکے کہا" سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ وہی قربانی ہے جس کا ذکر چھٹی آیت میں ہوا ہے کہ "وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں"۔ لیکن یہ ایک نہایت شدید غلطی ہے۔ ان دونوں آیتوں میں قربانی کے لئے الفاظ بالکل جداگانہ استعمال ہوئے ہیں، جن کی بنا پر ان دونوں قربانیوں کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں قربانی کے لئے جو لفظ[۵۱] استعمال ہوا ہے تم (Zabbach) ہے اور چھٹی آیت میں (oloth) اور (Shelaminu) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ لفظ (Zabbach) سوختنی قربانی (oloth) پر حاوی نہیں۔ [۵۲]

۹ ویں آیت | اس آیت کے صرف ایک لفظ "گردن کش" کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مفسرین بائبل کہتے ہیں کہ اس لفظ سے بنی اسرائیل کو ان چوپایوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو لگام یا نکیل سے بچنے کے لئے گردن نہیں جھکاتے[۵۳]۔ اس لفظ سے ۲۵ ویں آیت کے لفظ "بے قید" کا مقابلہ کیجئے۔ یہ دونوں الفاظ اسرائیلیوں کی باغیانہ ذہنیت کے شاہد ہیں۔

تیسرا پیراگراف

یہ پیراگراف صرف چار آیتوں پر مشتمل ہے۔

۱۵۔ اور موسیٰ پھر کر پہاڑ سے اتر گیا اور شہادت کی دونوں لوحیں اس کے ہاتھ میں تھیں وہ لوحیں

۵۱۔ ... W.L. Baxter (Sauct) 367

۵۲۔ اسمتھ بائبل ڈکشنری کے مضمون نویس Alfrid Barry نے لفظ Zabbach کی تشریح کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ "Thus it is opposid to "Minchah" P.S. XL. 6. & to "olath (the whole burnt offering) in exodus x. 25, XVIII. 12 etc with it the expiatory idia of sacrific is naturally Connected (Vol III P1076)

۵۳۔ Ingram Cobin PP. 100.

لکھی ہوئی تھیں اور دونوں طرف اِدھر اور اُدھر لکھی ہوئی تھیں۔

۱۶۔ اور وہ لوحیں خدا کے کلام سے تھیں اور جو کچھ لکھا ہوا سو خدا کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔

۱۷۔ اور جب یوشع نے لوگوں کی آواز جو پکار رہے تھے سنی تو موسیٰؑ سے کہا کہ لشکر گاہ میں لڑائی کی آواز ہے

۱۸۔ موسیٰؑ بولا یہ تو نہ فتح کے شور کی آواز نہ شکست کے شور کی آواز ہے بلکہ گانے کی آواز میں سنتا ہوں۔

۱۷ویں اور ۱۸ویں آیت | اس پیراگراف کی صرف ۱۷ویں اور ۱۸ویں آیت پر ہمیں کچھ لکھنا ہے۔

آپ پانچویں اور چھٹی آیت کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں کہ جب بنی اسرائیل نے "طلائی بچھڑا" بنایا تھا تو اس کے جواب میں "ہارونؑ" کو ایک قربان گاہ بنانا پڑی تھی اور دوسرے دن صبح ہی سے ہر گروہ نے اپنے اپنے مراسم مذہبی کو جوش و خروش کے ساتھ ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ "یہ مقدس اختلاف کسی بلوے یا فساد پر منتج ہوا ہو، بالخصوص اس حالت میں کہ دو متضاد قسم کی عبادتیں ایک ہی قوم اور ایک ہی مقام میں ادا کی جاری ہوں۔ یہودی روایات کے موجب موسیٰؑ اور ہارونؑ کے حقیقی بہنوئی "حور" کی شہادت[۵۳] (جو بہ اعتبار نیابت ہارونؑ کے درجے کے آدمی تھے) اسی اختلافِ خیال کا نتیجہ تھی۔

اب ۱۷ویں اور ۱۸ویں آیت پر غور کیجئے۔ یوشع جو مسلّمہ سپاہی تھے، لشکر گاہ میں لڑائی کی آواز سنتے ہیں۔ بخلاف اس کے موسیٰؑ جو مصری مراسمِ دینی سے کماحقہ واقف[۵۲] تھے۔ مذہبی گانے کی آواز محسوس کرتے ہیں۔ [۵۳]

کیا عجب ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اپنی اپنی جگہ جو کچھ سمجھا وہ ٹھیک ہی سمجھا ہو۔ موسیٰؑ کا یہ استدلال کہ "یہ نہ فتح کے شور کی آواز ہے اور نہ شکست کے شور کی" بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ دو منظم فوجوں میں بہرحال کوئی ٹکر نہیں تھی۔ یوشع کی سماعت کو وہم قرار دینا اس لئے مناسب نہیں کہ ایک تجربہ کار سپاہی سے ہم یہ امید نہیں کرسکتے۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو پہلی آیت کی تشریح۔

A. Churchward. (origin) 291 - - - - - - - - ۵۲

Smith. Bib. Dic (moses) Josephus PP. ۵۳

چوتھا پیراگراف

یہ پیراگراف پہلے پیراگراف کی طرح نہایت اہم ہے، اس لئے اس کی تقریباً تمام آیتوں سے بحث کرتا ہے۔ اس پیراگراف میں موسیٰؑ بنی اسرائیل کی گمراہی کا "ہارونؑ" کو ذمہ وار قرار دیکر جواب طلب کرتے ہیں اور "ہارونؑ" اپنی صفائی پیش کرتے ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

۱۹۔ اور یوں ہوا کہ جب وہ لشکر گاہ کے پاس آیا اور بچھڑا اور راگ، اور ناچ دیکھا، تب موسیٰؑ کا غضب بھڑکا اور اُس نے لوحیں اپنے ہاتھوں سے پھینک دیں اور پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالیں[۵۱]

۲۰۔ اور اس نے بچھڑے کو جسے انھوں نے بنایا تھا، لیا اور اس کو آگ سے جلایا اور پیس کر خاک سا بنایا اور اس کو پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلایا۔[۵۲]

۲۱۔ اور موسیٰؑ نے ہارونؑ سے کہا کہ ان لوگوں نے تجھ سے کیا کیا کہ تو ان پر اتنا بڑا گناہ لایا۔[۵۳]

۲۲۔ ہارونؑ نے کہا کہ میرے خداوند کا غضب نہ بھڑکے۔ تو اس قوم کو جانتا ہے کہ بدی کی طرف مائل ہے[۵۴]

۲۳۔ سو انھوں نے مجھے کہا کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا، جو ہمارے آگے چلے کہ یہ مرد موسیٰؑ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔

۲۴۔ تب میں نے انھیں کہا کہ جس کے پاس سونا ہو وہ توڑ لائے، انھوں نے مجھے دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا۔ سو یہ بچھڑا نکلا

| ۱۹ویں آیت | ۱۹ویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر گاہ میں داخلے کے وقت موسیٰؑ کو صرف تین باتیں قابلِ اعتراض نظر آئیں یعنی "بچھڑا[۱]" "راگ[۲]" اور "ناچ[۳]" چھٹی آیت کے تحت میں اس بات پر مفصل بحث ہو چکی ہے کہ یہ افعال محض "طلائی بچھڑا" بنانے والوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ یہاں نہ سوختنی قربانی

۵۱ مقابلہ کیجئے:۔ ولما رجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفًا قال بئسما خلفتمونی من بعدی اعجلتم امر ربکم والقی الالواح (۷: ۱۵۰) — ۵۲ مقابلہ کیجئے:۔ وانظر الی الٰهك الذی ظلت علیه عاکفًا لنحرقنه ثم لننسفنه فی الیم نسفًا (۲۰: ۹۷) — ۵۳ مقابلہ کیجئے۔ واخذ براس اخیه یجره الیه۔ ۵۴ قال، ابن ام، ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعداء ولا تجعلنی مع القوم الظالمین۔ (۷: ۱۵۰)

(Olath) کا کوئی ذکر ہے اور نہ سلامتی کی قربانی (Shelamin) کا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قربانیاں بت پرستوں سے متعلق نہیں تھیں۔ اس سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ چھٹی آیت کا صرف آخری جزو طلائی بچھڑا پوجنے والوں سے متعلق ہے اور پوری آیت میں دو مختلف گروہوں کے افعال پائے جاتے ہیں۔[۱]

۲۰ ویں آیت ۲۰ ویں آیت بھی ان آیتوں میں شامل ہونے کی مستحق ہے، جن سے چوتھی آیت کے "نئے ترجمے کی تصدیق ہوتی ہے۔ آیت کے یہ الفاظ کہ" اس نے اُس بچھڑے کو جسے انھوں نے بنایا تھا لیا" صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ یہ فعل بنی اسرائیل کی عام جماعت کا تھا نہ کہ "ہارون" کا۔

اس آیت سے موسیٰؑ کے اس اقتدار کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان کو جماعت پر حاصل تھا۔ بلا کسی ادنیٰ مزاحمت کے اسرائیلیوں کا یہ "طلائی معبود" موسیٰؑ کے قبضے میں تھا۔ وہی معبود جو ہارونؑ کی آنکھوں کے سامنے بنا اور وہ نہ روک سکے۔ وہی معبود جو ہارونؑ کی مخالفت میں بنایا گیا۔[۲] اور وہ کچھ نہ کر سکے اور وہی معبود جس کے جواب میں ہارون کو ایک قربان گاہ بنانا پڑی اور خداوند (یہواہ) کی عید کا اعلان[۳] کرنا پڑا یہ وہی معبود تھا جس پر لوگوں نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے بہنوئی اور اپنے حاکمِ وقت "حور" کو بھینٹ[۴] چڑھا دیا تھا۔ اب یہی معبود جلایا جاتا ہے اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ یہی دیوتا اپنے پجاریوں کی آنکھوں کے سامنے پیسا جاتا ہے۔ اور لوگ خاموش ہیں۔ اس کی راکھ عقیدتمند عابدوں کے حلق میں ٹھونس دی جاتی ہے اور کوئی بغاوت نہیں کرتا۔ ہمیں موسیٰؑ کے اس اقتدار کے وجوہ سے تو کوئی بحث نہیں البتہ اس عجیب و غریب سزا پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی "راکھ پانی پر چھڑک کر" بنی اسرائیل کو کیوں پلائی گئی؟

آپ گذشتہ سطور میں پڑھ چکے ہیں کہ یہ بچھڑا مصریوں کے مذہب کا ایک پرتو تھا۔[۵] اہلِ مصر ان جانوروں کا گوشت قطعاً نہیں کھاتے تھے جن کو وہ دیوتا شمار کرتے تھے۔ یہ طلائی معبود زندہ جانور نہیں تھا کہ اس کا گوشت کھلایا جا سکے اس لئے اس کی راکھ گوشت کا بدل قرار دی گئی ہے۔[۶]

---

[۱] پوری بحث چھٹی آیت کے تحت میں ملاحظہ ہو۔ [۲] سپٹواجنٹ ترجمہ کی آیت اول [۳] دیکھئے ۵ ویں آیت [۴] دیکھئے آیتِ اول کی تشریح۔ [۵] Guest Fr oh PP. 99 (Theo)
[۶] Fuller on Exod XXXII. 20.

اب ظاہر ہے کہ یہ معبود یہواہ کی تمثیل نہیں ہو سکتا بلکہ یقیناً کسی مقدس جانور کی تشبیہ ہوگا جس کا گوشت بت پرستوں کی شریعت میں درجۂ حرمت رکھتا ہو۔

۲۱ ویں آیت | طلائی بچھڑے کو خاکستر کر چکنے کے بعد جو سب سے پہلا "فرض نبوت" تھا، موسیٰؑ اپنے نائب ہارونؑ سے جواب طلب کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی اس گمراہی کا پورا پورا ذمہ دار ہارونؑ کو قرار دیا، لیکن آیت کے کسی لفظ سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے ہارونؑ پر "طلائی بچھڑا" بنانے کا الزام بھی لگایا تھا۔ بعض لوگ اس عبارت سے کہ "ان لوگوں نے تجھ سے کیا کیا تھا کہ تو ان پر اتنا بڑا گناہ لایا" یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں طلائی بچھڑا بنانے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہی جملہ ہمیں تکوین (۲۰ : ۹) میں ملتا ہے، یہ وہ موقع ہے جہاں بقول مصنف تکوین حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی سارا کو ابی ملک کے خوف سے بہن ظاہر کیا تھا اور جب ابی ملک کو یہ معلوم ہوا کہ سارا ابراہیمؑ کی بیوی ہیں تو اس نے ابراہیمؑ کو بلاکر سارا کو واپس کر دیا اور ابراہیمؑ سے شکایت کی۔[1] الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اور ابی ملک نے ابرہامؑ کو بلایا اور اس سے کہا کہ یہ کیا ہے جو تو نے ہم سے کیا اور میں نے تیرا کیا قصور کیا کہ تو مجھ پر اور میری بادشاہت پر ایک گناہِ عظیم لایا۔" (تکوین ۲۰ : ۹)

اب یہ ظاہر ہے کہ ابراہیمؑ نے نہ تو ابی ملک کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ سارا کے ساتھ عقد کرے اور نہ اس کی یہ خواہش ہو سکتی تھی کہ ابی ملک ان کی بیوی کو غصب کر لے۔ ہاں! ابراہیمؑ نے بخوفِ جان اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ سارا ان کی بیوی ہیں اور بقولِ مصنف تکوین ایک ایسے عمل کو برداشت کر لیا جس کو انھیں بزور روک دینا تھا، یہی "سکوت" اور "برداشت" ابی ملک کی نظر میں گناہِ عظیم قرار دی گئی اور اس گناہ کی پوری ذمہ داری ابی ملک نے ابراہیمؑ پر ڈال دی۔ اس آیت کا بھی بالکل یہی مفہوم ہے۔ جو فعل ہارونؑ کو ہر قیمت پر روکنا چاہیے تھا اُسے نہ روک سکے حضرت

---

[1] ابراہیمؑ کے متعلق اور بہت سے قصے اسرائیلیوں اور ان کی وساطت سے مسلمانوں میں مشہور ہو گئے ہیں جو خود بائبل کی رو سے غلط ہیں۔ ان قصوں پر بھی (انشاء اللہ) کبھی بحث ہوگی۔ بالخصوص اس قصے پر۔

موسیٰ نے اسی کمزوری کو بنی اسرائیل پر گناہ وارد کرنے کا سبب قرار دیا۔

۲۲ ویں ۲۳ ویں آیت | ۲۱ ویں آیت کے مطابق طلائی معبود کو نذر آتش کرنے کے بعد موسیٰ نے ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی اس گمراہی کا ذمہ دار قرار دے کر جواب طلب کیا، اب ۲۲ ویں ۲۳ ویں اور ۲۴ ویں آیات میں اس کا جواب ہے۔

اس جواب کو نہایت ہی احتیاط اور غور سے پڑھنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ جواب کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ جواب اس شخص کو دیا جا رہا ہے جس نے "بچھڑا بنانے کا الزام" ہارونؑ پر لگایا تھا؟ یا یہ جواب کسی ایسے شخص کو دیا جا رہا ہے جس نے "بچھڑا بن جانے کی ذمہ داری" ہارونؑ پر عائد کی تھی۔

۲۲ ویں آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ "بچھڑا بن جانے کی ذمہ داری" سے ایک قسم کا گریز ہے۔ ہارون موسیٰ سے کہتے ہیں کہ:۔

"میرے خداوند کا غضب نہ بھڑکے، تو اس قوم کو جانتا ہے کہ بدی کی طرف مائل ہے۔"

گویا اُس ذمہ داری کو جو بحیثیت نگراں ان پر عائد ہوتی تھی یہ بتا کر کچھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں کہ یہ قوم ابتدا ہی سے بدی کی طرف مائل ہے اور میری کوتاہی عمل و تدبیر کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی بدی سے محبت کی تازہ تر شہادت اس مطالبے کو قرار دیتے ہیں جو انھوں نے معبود بنانے کے سلسلے میں خود ہارونؑ سے کیا تھا۔

• ۲۳ ویں آیت ایک ایسے لفظ سے شروع ہوتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲ ویں آیت اپنے پورے مفہوم سے نامکمل رہیگی جب تک ۲۳ ویں آیت کے ابتدائی حصے کو اس میں داخل نہ کیا جائے تیئسویں آیت کی ابتدا انگریزی بائبلوں میں لفظ (For) اور اردو بائبلوں میں لفظ (سو) اور عربی میں (ف) سے ہوتی ہے جس کے معنی صاف طور پر یہ ہیں کہ بائیسویں آیت کے آخری حصے کو تیئسویں آیت کے ابتدائی حصہ سے ملا کر پڑھا جائے۔ اس طرح دونوں آیتوں کا مفہوم مکمل طور پر واضح ہو جائیگا ہم یہاں دونوں آیتوں کے تعلق کو لکھ کر دکھاتے ہیں۔

. تو ان لوگوں کو جانتا ہے کہ یہ بدی کی طرف مائل ہیں سو انھوں نے مجھ سے کہا

کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا"

Thou Knowest the people that they are set on mischief for they said unto me make us gods"

گویا بنی اسرائیل کی بدی کی طرف رغبت کو اس تازہ ترین واقعہ سے ثابت کیا جو ان سے سرزد ہوا تھا۔ ان دونوں آیتوں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہارونؑ ایک ایسے شخص کو جواب دے رہے ہیں جس نے بچھڑا بن جانے کی ذمہ داری ان پر عائد کی ہو اور یہ بات اس کے پہلے سے علم میں ہو کہ ہارون کا اس گناہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں آیتوں سے یہ کہیں پتہ نہیں چلتا کہ ہارونؑ ایسے شخص کے سامنے جواب دہ ہیں جو بچھڑا بنانے کے الزام کو ان پر عائد کر رہا ہو۔

۲۴ ویں آیت | اب چوبیسویں آیت کو لیجئے! آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے دوسری اور تیسری آیت کے ذیل میں یہ لکھا تھا کہ ان آیتوں پر چوبیسویں آیت کے ساتھ مفصل غور کیا جائے گا۔ اس لئے کہ مفہوم کے اعتبار سے یہ آیتیں مشترک ہیں۔ یہاں دوسری اور تیسری آیت کے الفاظ کو دوبارہ ذہن نشین کر لیجئے۔

"ہارونؑ نے اُن سے کہا کہ سونے کے زیور جو تمہاری بیویوں اور تمہارے بیٹوں اور بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے کے زیور جو ان کے کانوں میں تھے توڑ توڑ کے ہارونؑ کے پاس لائے۔"

اس پر ۲۴ ویں آیت کے یہ الفاظ اور اضافہ کیجئے جو ہارونؑ نے موسیٰؑ سے انکشافِ واقعہ کے طور پر کہے۔

"انھوں نے یہ (سونا) مجھے دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈال دیا۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہارونؑ نے طلائی بچھڑا نہیں بنایا تھا تو پھر اس زیور کو کس غرض سے منگایا گیا اور کس لئے انھوں نے اس کو "آگ میں ڈالا"؟ کیا زیور کا منگانا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ اس "طلائی دیوتا" کو بنانے کے لئے منگایا گیا تھا۔ لیکن اس اعتراض سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ "انبارِ طلائی" ان لوگوں کے پاس آیا کہاں سے تھا؟ سونے کی اتنی بڑی مقدار جس سے ایک مکمل

بچھڑا ڈھل سکے، کیا لوگوں کی ذاتی ملکیت تھی؟ ان سوالوں کے جواب پر یہ عقدہ خود بخود کھل جائیگا مفسرین بائبل کا خیال ہے کہ یہ وہی سونا تھا جو بنی اسرائیل موسیٰؑ کے اس حکم کے ماتحت مہاجرت کے وقت مصریوں سے لائے تھے ۵۱

"ہر ایک مرد اپنے پڑوسی سے اور ہر ایک عورت اپنی پڑوسن سے چاندی کا مال اور سونے کا مال عاریت لیوے" (خروج ۱۱:۲)

کتاب خروج کے مطابق موسیٰؑ نے یہ حکم خدا کی مرضی اور نہ صرف مرضی بلکہ اس کی بتائی ہوئی تدبیر کے ماتحت دیا تھا۔

"اور میں ان لوگوں کو مصریوں کی نظر میں عزت دوں گا اور یوں ہوگا کہ جب تم جاؤ گے تو خالی ہاتھ نہ جاؤ گے بلکہ ہر ایک عورت اپنی پڑوسن سے جو اس کے گھر میں رہتی ہے چاندی سونے کا مال اور لباس عاریت لیگی اور تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو غارت کردو گے" ۵۳ (خروج ۳:۲۲)

چنانچہ بارہویں باب کی ۳۶ ویں آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ایک طرف وعدۂ الٰہی اور دوسری طرف

---

۵۱ Cobin P. 100

۵۲ اردو بائبل میں اس جگہ اور نیز خروج ۳:۲۲ ۔ ۱۲:۳۶ میں "چاندی کے برتن" اور "سونے کے برتن" ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن انگریزی کے بائبل میں Jwels of gold. اور Jwels of Silwar. ترجمہ ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس عبرانی لفظ کا ترجمہ اردو میں "برتن" اور "انگریزی میں" Jwels. "کیا گیا ہے۔ اس کے مفہوم میں آلات (Instruments) اوزار (Weapons.) اور برتن (Versels) وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں (دیکھو Cobin 65) اردو ترجمے میں چونکہ "برتن" کے لفظ سے تشریح اس طرح کی گئی ہے:۔

"اس لفظ سے "اشیا" مراد ہیں چاہے وہ برتن ہوں یا زیورات (Personal ornament) (Vol 11. P. 645) میرے خیال میں آخر الذکر مفہوم اس مقام کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ تاہم میں نے بنظر احتیاط زیور کی بجائے لفظ "مال" استعمال کیا ہے۔ حالانکہ "زیور" کے لئے ایک یہ قرینہ بھی موجود تھا کہ خروج ۳:۲۲ میں اس کو پہننے کی چیز ظاہر کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں زیور ہی مراد ہے۔ (Smith Bib Dic Vol 11. P. 646.)

۵۳ دوسری آیت سے مقابلہ کیجئے۔ ۵۴ مقابلہ کیجئے۔ (ولکنا حملنا اوزارا من زینۃ القوم (۲۰:۸۷)

موسیٰؑ کا حکم پورا ہوا:-

"اور بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کے کہنے کے موافق کیا اور انھوں نے مصریوں سے چاندی کا مال اور سونے کا مال اور کپڑے عاریت لئے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ انھوں نے انھیں عاریت دی اور انھوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔"

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ فعل افراد کی انفرادی خواہشات کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ "ایک قوم" کے "قائد" نے "دوسری قوم" کو زک دینے کے لئے "اجتماعی طور" پر ایسا حکم دیا تھا جس سے "مدمقابل" کو "اجتماعی نقصان" پہنچے۔ یہ حکم ایک سرکاری حکم تھا جو بنی اسرائیل کو موسیٰؑ کی طرف سے ملا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بھی "اجتماعی نفع اندوزی" اور "اجتماعی نقصان رسانی" کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی مال کو لوٹ کا مال یا مالِ غنیمت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ خروج ۱۲: ۳۶ اور ۳: ۲۲ میں اس مال کو "لوٹ" اور "غارت" کا مال اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔

بنی اسرائیل جب اس مال کو لیکر نکلے تو فرعون کا تعاقب اور راستے کی دشواریاں اس بات کا موقع نہیں دے سکتی تھیں کہ اس "مالِ غنیمت" کو سرکاری طور پر جمع کیا جائے یا صرف کیا جائے۔ یہ پہلا موقع تھا جب بنی اسرائیل نے کچھ اطمینان کا سانس لیا اور اسی وقت ان کو اپنے "مصری دیوتا" یاد ہوئے۔ یہی وہ وقت تھا جب ہارونؑ کو اس مالِ غنیمت کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا جو بنی اسرائیل مصریوں کا لوٹ کر لائے تھے۔

ممکن ہے کہ ہارونؑ کے اس حکم کو کوئی مصلحت پسند "غیر سیاسی" یا "غیر مدبرانہ" شمار کرے اور کہے کہ عین اس وقت جبکہ بغاوت کے شعلے بھڑکنے ہی والے تھے، ہارون کا یہ مطالبہ نامناسب تھا لیکن اگر دیکھا جائے تو یہی بظاہر نامناسب مطالبہ بنی اسرائیل کی آئندہ حکومت کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔ اور کیا معلوم کہ یہ "بغاوت" اور "طلائی معبود" کا مطالبہ اسی مالِ غنیمت کے مطالبے کی سن گن کا نتیجہ ہو اور پیش بندی ہو۔ بہر حال بہت سے لوگ بہ طیبِ خاطر یا بادلِ ناخواستہ اس مالِ غنیمت کو "توڑ توڑ" کر ہارونؑ کے پاس لائے اور ہارونؑ نے اس کو لیا اور آگ میں ڈالا۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سونا آگ میں کیوں ڈالا گیا؟ اسرائیلی تصور کے بموجب آگ ناپاک اشیا کو پاک کرنے کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بت پرست قوموں سے حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت مسلمہ طور پر ایک ناپاک شے خیال کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں موسوی حکم کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں یہ الفاظ صرف مالِ غنیمت کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔

"فقط سونا، چاندی، پیتل، لوہا، رانگا، سیسہ، اور وہ سب چیزیں جو آگ میں ڈالی جاتی ہیں۔ تم آگ میں ڈالو۔ اور وہ پاک ہوں گی۔ پھر انھیں جدائی کے پانی سے بھی پاک کرو پھر وہ سب چیزیں جو آگ میں نہیں ڈالی جاتیں تم انھیں اس پانی میں ڈالو" (گنتی ۳۱: ۲۲، ۲۳)

اب ہارونؑ کے ان الفاظ سے عبارتِ بالا کا مقابلہ کیجئے۔

"میں نے ان سے کہا کہ جس کسی کے پاس سونا ہے وہ توڑ لائے اور انھوں نے مجھے دیا۔ اور میں نے اسے آگ میں ڈالا۔"

بیشک مالِ غنیمت کا یہ سونا پاک ہی کرنے کی غرض سے آگ میں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس آیت کے بعض الفاظ ابھی تشریح سے رہ گئے ہیں، پوری آیت اس طرح ہے: ہارونؑ کہتے ہیں۔

تب میں نے ان سے کہا کہ جس کسی کے پاس سونا ہو وہ توڑ لائے اور انھوں نے مجھے دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا سو یہ بچھڑا نکلا۔"

چونکہ یہ آیت اور نیز ماقبل کی دو آیتیں ہارونؑ کی طرف سے جواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے مفسرینِ بائبل کو اپنے سابقہ مفروضات کے ماتحت اس جواب میں پیچیدگی، عدم صفائی اور دروغ بیانی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ جواب ناصاف یا غیر مکمل ہے بلکہ یہ حضرات اول تو چوتھی آیت سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ "طلائی بچھڑا" ہارونؑ نے بنایا تھا۔ اس کے بعد ان آیتوں سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں "ہارون" اپنی ذات سے طلائی بچھڑا بنانے کا الزام دفع کر رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر قدرتاً ان کو جواب میں پیچیدگی اور عدم صفائی نظر آنے لگتی ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ ہارونؑ پر "طلائی بچھڑا" بنانے کا الزام لگایا ہی نہیں گیا

تھا اور نہ انھوں نے اپنے جواب کو اس حیثیت سے پیش کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اس الزام کو اپنے اوپر سے اٹھا رہے ہیں۔ یا اس جرم کی وجہ سے معذرت کر رہے ہیں بلکہ انھوں نے یہاں جو کچھ بھی کہا ہے، محض انکشافِ واقعہ کے طور پر ہے سب سے پہلے وہ بچھڑا بن جانے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ قوم بدی کی طرف مائل ہے اور اس کا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ انھوں نے مجھ سے ایک معبود بنانے کی خواہش کی For they said unto me make us gods. اس کے بعد وہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ میں نے ان سے سونا مانگا (وہی سونا جو مالِ غنیمت کا تھا اور جو اب ان کی بیٹوں اور بیٹیوں کے کانوں میں" ذاتی ملکیت کی حیثیت سے موجبِ زینت تھا) لوگ سونا لائے اور میں نے ان سے (پاک کرنے کی غرض سے) آگ میں ڈالا" سو یہ بچھڑا نکلا" یعنی ان لوگوں نے سونے پر قبضہ کرکے بچھڑے کی شکل میں منتقل کردیا"

اس آخری ٹکڑے (یعنی سو یہ بچھڑا نکلا) سے ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ نتیجہ نکالیں کہ یہ گویا بچھڑا بنانے کا ایک طرح سے اقبال یا اقرار ہے۔ لیکن بائبل کے تقریباً تمام بڑے بڑے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ ان الفاظ میں ایسا کوئی مفہوم نہیں ہے، پول (Pool.) اور صرف Shuelha[1] جیسے متبحر علما نے ان الفاظ کا وہی مفہوم سمجھا ہے جس کا ہم نے بار بار اعادہ کیا ہے یعنی یہ بچھڑا بنی اسرائیل نے بنایا۔ ملاحظہ ہو۔

سو یہ بچھڑا نکلا۔ یعنی ان لوگوں	Came out theis Calf
نے بعد میں اس کو بچھڑے کی صورت	thet is they after wards
میں منتقل کردیا ۲	made it into a calf.

صرف (Shuelha) اور پول (Pool) ہی نہیں، وہ تمام مفسرین بھی جو بچھڑا بنانے کا الزام

---

[1] (Shuelha) تو وہی عالم ہے جس کی چوتھی آیت کے ترجمے پر اس پوری بحث کی بنیاد رکھی گئی ہے یہاں (Pool) کی تائید اس کو مزید حاصل ہے (Pool) کے متعلق دیکھو Imp. Bio Dic PP gartous Bio Dic

[2] Ingram Cobin P101.

ہارونؑ پر لگاتے ہیں، اس بات پر متفق ہیں کہ اس جگہ ہارونؑ نے بچھڑا بنانے کے گناہ کو دوسروں پر عائد کیا ہے[۵]۔ اور اپنے آپ کو قطعاً غیر متعلق ظاہر کیا ہے[۶]۔

ان مفسرین کا یہ بھی خیال ہے کہ ہارون کا اپنے آپ کو غیر متعلق ظاہر کرنا اور دوسروں پر الزام عائد کرنا ان کے کردار کی کمزوری اور دروغ پسندی کا ثبوت ہے۔

ہمیں ان عقیدتمندوں کے ایمانیات سے کوئی تعرض نہیں، لیکن اس قدر ضرور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ بائبل کی صرف ایک آیتہ کے چند مشتبہ الفاظ کی بنیاد پر جس کے معنی کا اختلاف تسلیم کیا جا چکا ہے۔ خداوند کے مقدس مرد" ہارونؑ کی گواہی جو وہ اپنی صفائی میں نہیں اظہار واقعہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں کیوں قبول نہیں؟

پانچواں پیراگراف

اس پیراگراف کی بھی تقریباً تمام آیتوں سے ہمیں بحث کرنا ہے۔

۲۵۔ اور جب موسیٰؑ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بے قید ہو گئے (کہ ہارونؑ نے انھیں ان کے مخالفوں کے روبرو ان کی رسوائی کے لئے بے قید کرایا تھا)

۲۶۔ تب موسیٰؑ لشکرگاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا اور کہا جو یہوواہ کی طرف ہو، سو میرے پاس آئے تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوئے۔

۲۷۔ اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکرگاہ میں گذرتے پھر و اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر آدمی اپنے قریب کو قتل کرے

۲۸۔ اور بنی لاوی نے موسیٰؑ کے کہنے کے موافق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تقریباً تین ہزار مارے گئے۔

۲۹۔ اور موسیٰؑ نے کہا کہ آج خداوند کے لئے اپنے آپ کو مخصوص کرو، ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور اپنے بھائی پر حملہ کرے تا کہ وہ تمہیں آج ہی برکت دے اور آج اپنے اوپر برکت لاؤ۔

۲۵ ویں آیت | اس آیت کا آیتِ ماقبل (یعنی ۲۴ ویں آیت) سے نہایت ہی گہرا تعلق ہے۔ اور یہ موسیٰؑ کے اس احساس کو ظاہر کرتی ہے جو ہارون کی زبانی واقعے کی اصلیت معلوم کرنے کے بعد پیدا ہوا۔ اس اعتبار سے یہ آیت گویا آیتِ ماقبل کی ایک تفسیر ہے اس کے یہ الفاظ :-

"جب موسیٰؑ نے یہ دیکھا کہ لوگ بے قید ہو گئے"

دونوں لیڈروں کی گفتگو کے نتیجے کو ظاہر کرتے ہیں اور ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ موسیٰؑ نے ہارونؑ کے الفاظ "سو یہ بچھڑا نکلا" کا مفہوم کیا سمجھا۔

آپ گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ موسیٰؑ نے راگ اور ناچ حتیٰ کہ طلائی بچھڑا دیکھنے کے بعد بھی لوگوں پر تلوار نہیں اٹھائی بلکہ بچھڑے کو جلانے اور اس کی راکھ کو پانی میں گھول کر پلانے پر اکتفا کیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہنوز ان کو واقعہ کی پوری تفصیل اور اصلیت کا علم نہیں ہوا تھا، نہ اصل مجرموں کا پتہ چل سکا تھا۔ لیکن ہارونؑ سے گفتگو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک "پوری جماعت" "بے قید" ہوگئی ہے۔ اس کی مرکزیت کا بالکل خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس نے حاکمِ وقت کو قتل کر ڈالا ہے۔ غنیمت کے سونے پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سونے سے ایک بت ڈھالا ہے۔ غرض وہ سب کچھ کیا ہے جو ایک "گردن کش" "بدی کی طرف مائل" اور "بے قید" جماعت کو کرنا چاہئے تھا۔

اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جو ایک طرف خدا اور دوسری طرف حکومتِ الٰہیہ کے مقابلے میں تھی۔ اب تلوار اٹھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ آئندہ آیات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بلا امتیاز خویش و اقارب ہر مجرم کو قتل کر دیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تلوار کی حکمتِ عملی سے ہارونؑ نے بھی تھوڑا بہت کام لیا جیسا کہ اس آیت کے عبرانی متن سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ اقدام ہنوز نامکمل اور شاید غیر منظم صورت میں تھا۔ اس عبرانی متن کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

اور جب موسیٰؑ نے دیکھا کہ	And when Moses saw
لوگ بے قید ہو گئے (کہ ہارونؑ	that the peopl were
نے انہیں	naked (for Haron had
روبرو جو ان کی مخالفت میں	mad them naked unto
اٹھ کھڑے ہوئے تھے ان کی رسوائی	their shawe amongest
کے لئے بے قید کیا تھا۔	those that rose up
	agaust them.

اس ترجمے سے یہ بات بالکل صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ موسیٰؑ کی واپسی سے پہلے بنی اسرائیل کا ایک گروہ جو "ہارونؑ" کے طرف داروں میں تھا ان باغیوں اور بت پرستوں کی مخالفت میں اٹھ چکا تھا" لیکن شاید ہنوز پورے طور پر منظم نہ ہوا تھا۔ ہم نے اس خیال کا اظہار "حطی" ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں آیت کے ذیل میں کیا تھا۔ اس کی مزید تائید آئندہ آیات سے بھی ہوتی ہے۔

ہر چند کہ یہ ترجمہ جو اصل عبرانی متن کا ہے "غیر مسلمہ" ترجمہ نہیں ہے لیکن چونکہ عام طور پر موجودہ تراجم کا متن اس سے کچھ مختلف ہے اس لئے شاید کسی کو ماننے میں تامل ہو۔ اس لئے ہم یہ بتا دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ موجودہ تراجم کا متن بھی ہمارے خیال کی کسی طرح تردید نہیں کرتا۔ بلکہ اسی قدر تائید کرتا ہے، جتنا کہ یہ ترجمہ۔ ہاں وہ ایسا صاف اور واضح نہیں ہے۔

دوسری بات یہ قابلِ غور ہے کہ اس آیت کا جو حصہ قوسین کے اندر جملۂ معترضہ کے طور پر نظر آتا ہے، بظاہر کسی مابعد کے شخص کا اضافہ معلوم ہوتا ہے جس نے وضاحت کے لئے[۲] اپنا ذاتی خیال یہاں

ا Cambridge para sraph Bible PP76....

۲ زمانۂ حال میں تو یہ خیال عام طور پر قبول کر لیا گیا ہے کہ بائبل کے موجودہ متن میں بہت سے اضافے اور ترمیمیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن قدما بھی ان اضافوں سے بے خبر نہ تھے چنانچہ "ابن عذرا" نے بارہویں صدی میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ متعدد آئتیں "یقینی" طور پر مابعد کا اضافہ ہیں ۱۲:۶ و ۳۶ ، ۳۱ ، اعداد ۱۲ : ۶ ، ۷ ؛ اور استثنا ۳۴ : ۱-۱۲ کو بطور حوالہ پیش کیا تھا۔ منصلہ کی رائے میں یہ اضافہ کسی ترتیب کنندۂ مابعد (باقی حاشیہ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

لکھ ڈالا۔ اس قسم کے اضافے ہم کو قدم قدم پر ملتے ہیں اور بائبل سے دلچسپی رکھنے والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ تاہم اگر اس کو اضافہ نہ بھی شمار کیا جائے تو بھی اس آیت کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہارون کی نرمی نے لوگوں کو ایک ایسی بے لگامی کا موقع دیا جس کو اسرائیلیوں کی ایک جماعت نے اس وقت بھی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

۲۶ ویں آیت | ۲۶ ویں آیت اس سلسلے میں ایک نہایت ہی اہم شہادت ہے۔ اس آیت سے بعض باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔

آیت کے یہ الفاظ کہ (موسیٰؑ نے) کہا جو خداوند (یہواہ) کی طرف ہو میرے پاس آئے۔ ہمارے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ "طلائی بچھڑا" بن جانے کی وجہ سے اسرائیلی کم سے کم دو گروہوں میں ضرور منقسم ہو گئے تھے اور ان میں سے ایک گروہ یقیناً "یہواہ کے ساتھ" تھا۔ اور یہ وہی گروہ تھا جس نے ہارونؑ کی منادی پر دوسرے دن "یہواہ کی عید" منائی تھی[۵۱] اور یہ وہی گروہ تھا جو ان بچھڑا بنانے والوں کے خلاف اٹھا تھا اور ان کو ذلیل نظروں سے دیکھتا تھا۔[۵۲]

یہ پورا گروہ کن کن قبائل پر مشتمل تھا؟ اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس ۲۶ ویں آیت سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) (margend -) کے نوٹ یا حاشیے کی تشریحات (Later Editor.) (amothan) تھیں جنھوں نے اصل متن میں کسی طرح راہ پالی (دیکھئے Lais P 55) یہ تحریفات اور اضافے نہایت ہی آخری زمانے تک جاری رہے (Dellt z sch) کی رائے ہیں "وہ طریقہ جن سے توریت کی موجودہ شکل بن گئی، جلاوطنی کے زمانے کے بعد تک جاری رہے اور گمان غالب ہے کہ سامریوں کی توریت اور اسکندریہ کے ترجمے کی تصنیف ہونے تک کام میں آتے رہے (Scott کی رومن تفسیر استثناء ص ۶۱۷) صفر اعداد کے بارہویں باب کی تیسری آیت بھی اتفاق سے اسی قسم کا اضافہ ہے اور قوسین کے اندر ہونے کی وجہ سے بظاہر ایک جملۂ معترضہ معلوم ہوتا ہے اس آیت کے متعلق (Dr. W. H. green.) فرماتے ہیں "اگر ہم اس بات کو بھی تسلیم کر لیں کہ چند ایسی نظیریں بھی ہیں جن میں کسی مستند شخص نے کوئی لفظ یا آیت یا کسی تحریر کا حصہ جداگانہ براہِ تفسیر یا تحریر کی تکمیل کے لئے مندرج کر دیا ہے، تو ہم بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ موسیٰؑ توریت کا مصنف نہیں ہے۔ (دیکھو Scott تفسیر اعداد ص ۱۴۳)

(حاشیہ صفحہ ھذا) [۵۱] دیکھو آیت ۵، ۶۔ [۵۲] دیکھو آیت ۲۵۔

صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس گروہ میں ہارونؑ[1] کا پورا قبیلہ یعنی بنی لاوی بہرحال مجموعی طور پر شامل تھا، جنھوں نے نہ صرف اپنے ایمان کو سالم رکھا بلکہ اصلاح کی خاطر اپنے آپ کو بطور رضاکار موسیٰؑ کے حوالے کر دیا۔

اب اگر ہارونؑ واقعی بچھڑا بنانے سے اسی قدر دلچسپی رکھتے جتنی کہ یہاں کی جاتی ہے تو ان کا قبیلہ اس بدعت سے کس طرح محفوظ رہتا۔ اور اپنے شیخ کے عمل سے کیوں نہ متاثر ہوتا؟ قبائلی زندگی میں یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ شیخ قبیلہ اس طرح اپنے خیالات اور اعمال کے لحاظ سے منفرد رہ سکے وہ یقیناً اپنے قبیلے کی اکثریت کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس آیت سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تمام یا اکثر قبائل ہارونؑ سے منحرف ہو گئے اس وقت بنی لاوی جو ان کا اپنا قبیلہ تھا اپنے شیخ کے گرد جمع رہا اور اس کے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔

۲۷ ویں ۲۸ ویں اور ۲۹ ویں آیت

۲۷، ۲۸ اور ۲۹ ویں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰؑ کے گرد بنی لاوی جمع ہو گئے تو اب اس گناہ کے کفارے کا وقت آیا اور اصلی مجرموں کو سزا دہی کے لئے آپ نے "لاویوں" کو مامور کیا۔ لاویوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ نہ اپنے قریبی عزیز نہ کسی گہرے دوست حتیٰ کہ بیٹے یا بھائی کی بھی کوئی رعایت نہ کریں بلکہ تمام اُن لوگوں کو جو اس جرم کے مرتکب ہوئے تھے بے دریغ قتل کر دیا جائے۔

یہ حکم موسوی شریعت کا ایک اہم جزو تھا اور توریت میں جگہ جگہ اس کی تکرار اور نظائر نظر آتے ہیں یہاں ہم طوالت کے خوف سے محض دو ایک مقامات نقل کرتے ہیں، جس سے اس حکم کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ ملاحظہ ہو: خدا فرماتا ہے:۔

> "اور اگر تمہارے درمیان کوئی نبی یا خواب دیکھنے والا ظاہر ہو اور تمہیں کوئی نشان یا معجزہ دکھائے اور اس نشان یا معجزے کے مطابق جو اس نے تمہیں دکھایا بات واقع ہو اور وہ تم سے کہے کہ آؤ ہم غیر معبودوں کی جنھیں تم نے نہیں جانا پیروی کریں اور ان کی بندگی کریں

---

[1] یہودی اس بات کے قائل ہیں کہ "لاویوں" کا پورا قبیلہ اس بدعت سے محفوظ رہا (R. Geiger P.135.)

..... تو ..... وہ نبی یا خواب دیکھنے والا قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے خداوند تمہارے خدا سے جو تم کو مصر سے باہر نکال لایا ... پھرانے کے لئے کہا (استثنا ۱۳: ۱، ۲، ۵...)

پھر حکم دیا جاتا ہے۔

اگر تیرا بھائی جو تیری ماں کا بیٹا ہے یا تیرا ہی بیٹا یا بیٹی یا تیری ہمکنار بیوی یا تیرا دوست جو تجھے تیری جان کی برابر عزیز ہے تجھے پوشیدہ طور پر پھسلائے اور کہے کہ آؤ غیر معبودوں کی پرستش کریں جن سے تو اور تیرے آباد اجداد واقف نہیں تھے ؛ یعنی ان لوگوں کے معبودوں میں سے جو تمہارے گرداگرد تمہارے نزدیک یا تم سے دور زمین کے اس سرے سے اُس سرے تک رہتے ہیں تو تو اس سے موافق نہ ہونا۔ نہ اس کی بات سننا، تو اس پر رحم کی نگاہ نہ رکھنا، تو اس کی عاریت نہ کرنا تو اُسے پوشیدہ نہ رکھنا بلکہ تو اس کو ضرور قتل کرنا۔ اس کے قتل پر پہلے تیرا ہاتھ پڑے اور بعد اس کے سب قوم کا" (استثنا ۳: ۶: ۹)

ایک اور مقام ملاحظہ ہو جو ان احکام کی نظیر شمار ہو سکتا ہے۔

"ان لوگوں نے موابیوں کی بیٹیوں سے حرام کاری شروع کی، انھوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کی دعوت کی۔ سو لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا اور اسرائیل "بعل فغور" سے ملے۔ تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا اور خداوند نے موسیٰؑ سے فرمایا کہ قوم کے سارے سرداروں کو پکڑ اور ان کو خداوند کے لئے آفتاب کے مقابل لٹکا دے تاکہ خداوند کا غضب کا بھڑکنا اسرائیل پر سے ٹل جائے۔ سو موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے حاکموں سے کہا کہ تم میں سے ہر ایک اپنے لوگوں کو جو بعل فغور سے مل گئے ہیں قتل کرے (اعداد ۲۵ - ات ۵)

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف تو موسیٰؑ اس قدر سخت احکام دیتے ہیں کہ کوئی اپنے بیٹے بھائی، بیوی، یا کسی دوسرے قریبی دوست کی کوئی رعایت نہ کرے۔ کسی رشتے یا کسی مادی تعلق کو توحید الٰہی میں مخل نہ ہونا چاہئے۔ اور بے دریغ ہر شخص اپنے جگر پاروں کو تلوار کی دھار کے نذر کردے

لیکن دوسری طرف ہارونؑ پر جو ان کے بڑے بھائی ہیں اور اس پورے فتنے کی بنیاد شمار ہوتے ہیں اس قدر مہربانی ہے کہ ان سے دوسری مرتبہ سوال بھی نہیں ہوتا۔ کونسی عقل اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ موسیٰؑ جیسے کیریکٹر کا انسان احکاماتِ الٰہی کی اتنی کھلی نافرمانی کرے گا۔ اور وہ تمام باتیں جو دوسروں کے لئے فرض کی جاتی ہیں اپنے اوپر حرام کر لیگا۔

کیا یہ تمام آیتیں اس بات کی کھلی شہادت نہیں کہ ہارونؑ اس جرم سے بری تھے۔ مجھے یقین ہے کہ موسیٰؑ کو ہارونؑ کی طرف سے ادنیٰ شبہ بھی ہوتا تو ہارونؑ سب سے پہلے وہ شخص ہوتے جن کو قتل یا سنگسار کیا جاتا تاکہ موسیٰؑ کی قیادت باقی رہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو موسیٰؑ کے احکام کی نوعیت یہ نہ ہوتی جو ہم کو نظر آتی ہے۔ قائد ہونے کی حیثیت سے وہ کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتے تھے جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع ملے۔ اور نبوت کی شان سے تو یہ بالکل بعید ہے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ اس قتل عام کا حکم "بنی لاوی" کو دیا گیا تھا، جو خود ہارونؑ کا قبیلہ تھا۔ حکم میں یہ صراحت موجود تھی کہ ہر شخص اپنے قریبی سے قریبی دوست حتیٰ کہ حقیقی بھائی کو بھی قتل کر ڈالے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ لاویوں میں سے کسی ایک حق پرست کی تلوار ہارونؑ کے سر پر نہیں چمکی۔ سچ ہے! یہ کام خود موسیٰؑ کا تھا جو ہارونؑ کے حقیقی بھائی تھے۔ لیکن شاید موسیٰؑ کا علم و یقین ہم سے کچھ مختلف تھا۔

اب یہاں "ہارونؑ کے قبیلے" کی اس خدمتِ جلیلہ کے "صلے" پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ اس انعام پر جو خدا کی طرف سے اس مقدس جماعت کو ملا۔ موسیٰؑ نے ان لوگوں کو (مجرموں کے) قتلِ عام کا حکم دیتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ اس خدمت کے صلے میں تمہیں آج ہی برکت دی جائے گی۔

> "ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور اپنے بھائی پر حملہ کرے تاکہ وہ تمہیں آج ہی برکت دے اور تم آج ہی برکت پاؤ" (۲۹ ویں آیت)

مفسرین کا خیال ہے کہ لاویوں کے سپرد مقدس "مسکنِ الٰہی" کی نگرانی اسی خدمتِ جلیلہ کے

صلے میں تفویض ہوئی تھی۔ یہ عزت صرف ان لوگوں ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ نسل درنسل ہمیشہ کے لئے عطا کی گئی تھی۔[۵۱]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عین اس گناہِ عظیم کے بعد ہارونؑ اور نہ صرف ہارونؑ بلکہ ان کی اولاد کو نسل درنسل کہانت عظمیٰ کا عہدہ وہ عہدہ جس پر موسیٰؑ کی اولاد بھی کبھی فائز نہ ہوسکی۔ کس خدمت کے صلے میں عطا ہوا؟

"یہ بات کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے کہ اس گناہِ عظیم کے فوراً بعد اور ٹھیک اس طرح جیسے یہ گناہ سرزد ہی نہ ہوا تھا خدا کے مضبوط انتظامی مقاصد پر ہارون کی تقدیس کے ذریعے سے جو کہانت عظمیٰ کے نئے عہدے سے کی گئی عمل درآمد ہوا"[۵۲]

چھٹا پیراگراف

خروج کے تبیسویں باب کا یہ آخری پیراگراف ہے۔

۳۰۔ اور دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسیٰؑ نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا اور اب میں یہواہ کے پاس اوپر جاتا ہوں کہ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ کروں۔

۳۱۔ چنانچہ موسیٰؑ خداوند کے پاس پھر گیا اور کہا کہ ہائے ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لئے سونے کا معبود بنایا۔ اور اب کاش کہ تو ان کا گناہ معاف کرنا۔ مگر نہیں تو میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے اپنے اس دفتر سے جو تو نے لکھا ہے میٹ دے۔

۳۲۔ اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ جس نے[۵۳] میرا گناہ کیا ہے میں اس کو اپنے دفتر سے میٹ دونگا

۳۴۔ اور اب روانہ ہوئے لوگوں کو جہاں میں نے تجھ سے کہا ہے لے جا۔ دیکھ میرا فرشتہ تیرے آگے چلے گا۔ لیکن میں اپنے مطالبے کے دن ان سے اپنی خطا کا مطالبہ کروں گا۔

---

۵۱ E.M. Edersheim (Laws & polity PP.15

۵۲ Smith Bib Dic PP.1 (Aaron)

۵۳ مقابلہ کیجئے۔ ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلۃ فی الحیوۃ الدنیا وکذلک نجزی المفترین (۷: ۱۵۲)

۳۵۔اور خداوند نے ان کے بچھڑا بنانے کے سبب جسے ہارونؑ نے بنایا تھا مری بھیجی۔
اس پیراگراف میں بجز آخری آیت کے کوئی آیت زیادہ بحث ونظر کی محتاج نہیں، اس لئے ہم اس کی تمام آیتوں پر بحیثیتِ مجموعی غور کریں گے۔

پیراگراف کی ۳۰ ویں اور ۳۱ ویں آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچھڑا ہارونؑ نے نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے بنایا تھا۔ ان آیتوں میں بھی ویسی ہی جمع کی ضمیریں موجود ہیں جو ہمارے نئے ترجمے میں پائی جاتی ہیں۔ جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارا نیا ترجمہ ٹھیک ہے ۳۱ ویں آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم کی سفارش کی کہ ان کو معاف کر دیا جائے لیکن ۳۳ ویں آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سفارش پورے طور پر مقبول نہیں ہوئی اور خدا نے موسیٰؑ کو بتایا کہ "جس نے میرا گناہ کیا ہے اس کو میں اپنے دفتر سے میٹ دوں گا" یعنی ہلاک کردوں گا۔ اب ۳۵ ویں آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی وعدے کے بموجب اسرائیلیوں پر مری بھیجی گئی۔ لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اصل "گناہ گار" جو اس پورے فتنہ کی بنیاد کہا جا سکتا ہے نہ موسیٰؑ اور بنی لاوی" کی تلوار کی نذر ہوا اور نہ اس "مری" Plauge میں مبتلا ہوا جو خدا نے محض اس کے گناہ کے سبب سے نازل کی تھی۔ بلکہ ہم خروج کے ابواب ما بعد میں اس کی برومندی اور خدا کی انتہائی رضامندی کو نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔

اب اس پیراگراف کی آخری آیت جو اس پورے قصے کی اختتامی آیت کہی جا سکتی ہے ملاحظہ ہو۔ یہ آیت بھی بظاہر اتنی ہی گمراہ کن معلوم ہوتی ہے جس قدر چوتھی آیت لیکن اس آیت پر ہم بہت زیادہ بحث اس لئے نہیں کرنا چاہتے کہ آیاتِ ماسبق سے ہارونؑ کی پوری پوری بریت ظاہر ہو چکی ہے تاہم اس کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں۔

آیت کے الفاظ کو بغور ملاحظہ فرمائیے۔ تقریباً تمام ترجموں میں ایک ہی فعل کو مکرر طور پر دو مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

And the lord plauged the people because

They made the Calf which Haron made.

عربی ترجمہ ملاحظہ ہو:-

فضرب الرب الشعب، لانهم صنعوا العجل الذی صنعه هرون۔

ان ترجموں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کاتب نے لکھتے لکھتے ایک خیال کو ترک کرکے فوراً دوسرا خیال اختیار کرلیا پہلے اس کے قلم سے وہی عبارت نکلی جس کا سوقِ کلام مقتضی تھا اور اس نے اس فعل کو بنی اسرائیل کی طرف منسوب کیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد (اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مکرر جملہ ایک ہی شخص کے قلم کا نتیجہ ہے) اس نے اپنے مخصوص خیال کا بطور وضاحت اضافہ کردیا[1]

لیکن اگر ہم اس آیت کے متعلق بدگمانی میں مبتلا نہ بھی ہوں تو بھی ہارونؑ کے خلاف اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ آیت میں نفسِ فعل جماعت کی طرف منسوب ہے اور جماعت کا سردار ہونے کی وجہ سے اس کی ذمہ داری ہارونؑ پر بھی عائد کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مری Plauge جو اس فعل کا نتیجہ تھی جماعت پر بھیجی گئی اور ہارونؑ اس سے بالکل محفوظ رہے۔ ورنہ ۳۳ ویں آیت کے بموجب مری ہارونؑ کی طرف بھیجی جاتی اور جماعت اس سے محفوظ رہتی۔

گذشتہ اوراق میں آپ نہ صرف "خروج" کے ۳۲ ویں باب کی ایک ایک آیت پر نظر ڈال چکے بلکہ توریت، انجیل اور دوسری کتب انبیا کی وہ تمام آیات جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس سنہری بچھڑے سے تھا مطالعہ کرچکے ہیں اور اب شاید پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مجموعۂ بائبل میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کا تعلق اس واقعہ سے ہو اور وہ آپ کی نظر سے نہ گذری ہو۔

---

[1] مشہور مفسر خروج ڈرایور Driver کی رائے ملاحظہ ہو۔

... wilwich Aaron made) The words read like a Seribis Corseelion of the leos exact "They made" Just before.
(Cambriedg Bib "Exod" PP. 357.

ہم نے ان آیات کو نہ صرف اس لئے کہ یہ تمام کی تمام ہمارے خیال کی موافقت میں تھیں آپ کے روبرو پیش کیا ہے بلکہ ہمارا مقصد چونکہ اس بحث کے ہر گوشے کو نمایاں کرنا تھا اس لئے تمام متعلقہ آیات کا جمع کرنا ضروری تھا۔ ان آیات سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ خروج کی ۴ تھی آیت کے مروجہ ترجمہ کے علاوہ ہارونؑ پر یہ الزام کہیں نظر نہیں آتا۔

اس ترجمے کے متعلق جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ قواعدِ زبان کے اعتبار سے ایک ترجمہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہوگا جس طرح مروجہ بائبلوں میں موجود ہے۔ نیز ہمیں اس بات کے کہنے کی بھی جرأت نہیں کہ مترجمینِ بائبل نے ازراہِ خیانت کسی لفظ کو گھٹا بڑھا کر یہ ترجمہ کیا ہوگا۔

ہمیں اعتراض ہے تو یہ ہے کہ اس ترجمے میں بائبل کے دوسرے مقامات اور ان خیالات، یا عقائد کو جو اس "مقدس" کتاب نے ہارونؑ کے متعلق پیش کئے ہیں، بالکل ملحوظ نہیں رکھا گیا حتی کہ خود ۳۲ ویں باب کی (جس کے اندر یہ آیت ہے) سیاقِ عبارت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اس اس حالت میں ہوا جب کہ ان ہی الفاظ کا ایک ایسا ترجمہ ہو سکتا تھا جو ہر اعتبار سے بائبل کے تمام دوسرے مقامات اور نیز ان تصورات یا عقائد سے جو وہ ہارونؑ کے متعلق پیش کرنا چاہتی ہے، مطابق ہو۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ہر کتاب میں خواہ وہ کوئی ناول ہو یا تاریخ، کوئی افسانہ ہو یا کسی شخص کی سچی داستانِ حیات، کوئی مفروضہ ڈراما ہو یا کوئی "مقدس" واقعاتی نظم، افراد کا کردار ہمیشہ شروع سے آخر تک یکساں رہتا ہے اور مصنف کا قلم شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کردار کو ابتدا ہی سے ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے جو اس کی رائے کے مطابق ان افراد کے لئے مناسب ہوتا ہے یہ کیفیت آخر تک رہتی ہے اور مصنف کی ہر جنبشِ قلم اپنے بنائے ہوئے سانچے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مصنف کی رائے اور اس کے ذاتی معتقدات کا اثر افراد کے کردار پر جگہ جگہ نمایاں نہ ہو، یا یہ کہ مصنف کی نوکِ قلم افرادِ متعلقہ کو اپنی مخصوص رائے یا ذاتی عقائد کے دائرے سے منحرف ہونے دے لیکن "عہدِ عتیق" کی بالخصوص ابتدائی کتابیں (مثلاً خمسہ موسوی وغیرہ) ایک حد تک اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کتابوں میں بسا اوقات ایک ہی شے یا فرد کے متعلق متضاد قسم کے بیانات

نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پڑھنے والے کو اکثر ایک نتیجے پر پہنچنے میں دشواری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ تضاد اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ واقعۂ متعلقہ ایک چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ "مقدس کتابیں" جن اصل روایتوں یا (اصطلاحًا) دستاویزوں سے مرتب ہوئی ہیں ان کا تعلق مختلف قسم کے عقائد، خیالات، اور معلومات، رکھنے والے افراد یا زیادہ درست الفاظ میں مختلف "اسکولوں"[۱] سے ہے۔ اور ان مختلف "اسکولوں" کی روایات کو کسی ایک تیسرے اسکول یا اسکول کے فرد نے ایک جگہ بلا کسی امتیاز کے اکٹھا کر دیا۔ ان میں سے تین دستاویزیں زیادہ مشہور ہیں جن کو اصطلاحًا "الوہمی" (E) "یہووائی" (J) اور "کہانتی" (P) دستاویزیں[۲] یا روایتیں کہا جاتا ہے۔ یہ تمام روایتیں اس طرح پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں کہ ان کو نہ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے، نہ سرسری طور پر دیکھنے کے بعد کوئی شخص اس بات کا امتیاز کر سکتا ہے کہ یہ روایات مختلف العقیدہ یا مختلف الخیال لوگوں کے قلم کا نتیجہ ہیں۔

باوجود اس کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہارون کے متعلق یہ تمام مختلف العقیدہ . . . اور مختلف المعلومات افراد یا "اسکول" ایک ہی قسم کے خیالات رکھتے تھے اور جو تقدس اور بزرگی ہمیں "الوہمی" روایات میں نظر آتی ہے وہی یہووائی اور کہانتی دستاویزوں میں ہے۔

ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کسی ایک دستاویز کا خیال ہارونؑ کے متعلق مختلف ہوتا مثلاً ایک دستاویز "ہارون" کے کردار کو بہت اعلیٰ حیثیت سے پیش کرتی اور ان کے تقدس اور بزرگی کو اچھی سے اچھی صورت میں نمایاں کرتی۔ اس کے مقابلے میں دوسری "دستاویز" کی روایات کچھ مختلف ہوتیں تو

---

[۱] Camb. Bib. P

[۲] اس سلسلے میں مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں۔

1. Cambridge Bible.
2. The Divine names in genesis by john Skinner
3. Principles of Biblical criticism by J. J. Lais
4. Ency Brit
5. Creed of Christendom by. W.R. greg.

ہم کہہ سکتے تھے کہ دستاویزی اختلاف کی وجہ سے ہارونؑ کے کردار میں اس قدر تضاد ہے اور آیت کا مروجہ مفہوم صحیح ہے۔ لیکن بخلاف اس کے یہاں تمام دستاویزیں ہارونؑ کا کردار ایک ہی قسم کا پیش کر رہی ہیں اور ہر دستاویز میں یہ کردار ایک ایسا کردار ہے جو بہر طور اس آیت کے مروجہ ترجمے کی تغلیط کرتا ہے۔

یہی نہیں کہ بائبل کی ابتدائی کتابوں (یعنی خمسۂ موسوی وغیرہ) میں ہمیں ہارون کے متعلق اس قسم کے اعلیٰ خیالات ملتے ہوں بلکہ اگر دیکھئے تو پورا مجموعہ بائبل اس بات کا شاہد ہے کہ اس آیت کا یہ ترجمہ نادرست ہے، اس لئے کہ اس پورے مجموعے میں ہارونؑ۔ مقدس پیغمبر، اور کاہنِ اول کا اعمالنامہ "گوسالہ ساز ہارون" سے بالکل جدا ہے۔

خود علمائے بائبل حیران ہیں کہ کردار کے اس تضاد میں کس طرح تطابق کیا جائے۔ ہنری و اسکاٹ (Henry & Scott) نے اسی اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنا استعجاب ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:-

"یہ بات خاص طور پر تعجب خیز ہے کہ ہارونؑ کو اس گناہ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ وہ بچھڑا بنائے اور اس کی عید کا اعلان کرے۔ کیا یہ وہی ہارونؑ ہے؟۔ خدا کا مقدس مرد، موسیٰؑ خدا کے رسول کا بھائی جو بہت اچھا بولنے والا تھا لیکن اس بت پرستی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔

"کیا یہ وہی ہارونؑ ہے جو صرف دیکھنے والا ہی نہیں بلکہ مصر پر نزول آفات کا اور مصری دیوتاؤں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں سرگرم عمل رہ چکا تھا"

"کیا عجیب بات ہے؟ کہ یہ شخص خود ہی مصر کی ترک کی ہوئی بت پرستی کا نقال ہے؟"

"کیا یہ وہی ہارونؑ ہوسکتا ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ پہاڑ پر تھا اور بخوبی واقف تھا کہ اس ذات کی کوئی تشبیہ نہیں اس کا کسی حیثیت سے بت نہیں بنایا جاسکتا"

"کیا وہی ہارونؑ ہوسکتا ہے جس کو موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں لوگوں کی دیکھ بھال سپرد کی گئی۔ کیا خدا کے خلاف اس بغاوت میں وہ لوگوں کو آمادہ کر کے ان کی امداد کر رہا ہے۔

"یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ کبھی بھی اسے گناہ ایسے بھرے ہوئے فعل کا مرتکب ہو؟" ۵۱

مندرجۂ بالا استعجاب کو کسی طرح بھی نادرست کہا جاسکتا ہے؟ کیا ہارونؑ کا کردار واقعی "طلائی گوسالہ" بنانے والے کی حیثیت رکھتا ہے؟

یقیناً ان سوالوں کا جواب ہماری طرف سے نفی میں ہے۔ شاید کوئی کہے کہ بہت سی مقدس ہستیاں گمراہ ہو جاتی ہیں اور ان کی "طبیعی کمزوری" قعرِ مذلت میں گرا دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہارونؑ پر بھی ایسا کوئی وقت آیا ہو اور یہ گناہِ عظیم ان ہی سے سرزد ہوا ہو۔ ہم اس خیال کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے افعال کا ہمیشہ ایک ردِ عمل ہوتا ہے جو اس گناہگار شخص کی مادی اور روحانی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اور سوانح نگار کا قلم تو اس کو کبھی معاف ہی نہیں کرتا۔ اب ہارونؑ کا معاملہ ملاحظہ ہو جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہارونؑ جیسے ابتدائی ایام میں خدا کے برگزیدہ اور منظورِ نظر تھے۔ بائبل کے بیانات کے مطابق اس واقعہ عظیمہ کے ظہور کے بعد بھی خدا کی نظروں میں ویسے ہی صاحبِ منزلت رہے، بلکہ عین اس حادثے کے بعد ان کے اعزاز، ان کی برگزیدگی اور ان کے تقدس میں اور اضافہ ہوا۔ خدا کی طرف سے ان کو مزید انعامات ملے نہ صرف انھیں کو بلکہ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کو نسل در نسل۔

ریورنڈ الفرید بیری (Rev Alfred Barry) اس بات کو ان الفاظ میں یاد دلاتے ہیں۔

> یہ بات کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے کہ اس گناہِ عظیم کے فوراً ہی بعد اور ٹھیک اس طرح گویا یہ گناہ سرزد ہی نہ ہوا تھا۔ خدا کے مضبوط انتظامی مقاصد پر ہارونؑ کی تقدیس کے ذریعہ سے جو کہانتِ عظمیٰ کے نئے عہدے سے کی گئی عملدرآمد ہوا۔" ۵۲

یہ کیوں؟ کیا یہ بچھڑا بنانے کا انعام تھا، یا لوگوں کو گمراہ کرنے کا صلہ یا حقیقتاً نیکوکار رہنے کے لئے خدا کی طرف سے ایک رشوت؟ کتنا حیرت انگیز بدل ہے جو اس گناہِ عظیم کا ظہور میں آیا۔

---

۵۱ Henry and Scott. PP. 210

۵۲ Smith Bib Dic PP1 (Aaron)

ایک طرف ہم بچھڑا بنانے والوں پر یہ عتابِ الٰہی دیکھتے ہیں کہ موسیٰؑ نے ان سب کا قتلِ عام کردیا، خدا نے ان پر "مری" بھیجی اور تباہ کر ڈالا۔ بلکہ ایک یہودی روایت کے بموجب بنی اسرائیل پر آج تک جو مصائب نازل ہوتے ہیں ان میں گوسالہ طلائی کے بنانے کا انتقامِ الٰہی ہنوز شامل ہوتا ہے[۵۱] گویا بنانے والوں کی نسل درنسل اس گناہ کی مجرم قرار دی گئی۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ عین اس گناہِ عظیم کے بعد ہارونؑ اور نہ صرف ہارونؑ بلکہ اولاد اور ان کی نسل پر وہ ابدی رحمت نازل کی گئی جو موسیٰؑ کی نسل کو بھی میسر نہ ہوسکی۔

کیا ان تمام شواہد کے باوجود یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ خروج کے ۳۲ ویں باب کی چوتھی آیت کا مروجہ مفہوم ہارونؑ کے واقعاتِ زندگی سے مطابقت رکھتا ہے؟ کیا اس آیت کے لکھنے والے کے تصور میں کبھی بھی یہ مفہوم آسکتا تھا؟ کیا مصنفین بائبل کے عقائد ہمیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہم اس آیت کا مروجہ مفہوم قبول کرلیں۔

مصنفین کے ذاتی عقائد اور مخصوص مسلمات و معلومات کے ماتحت قدیم کتابوں کو جانچنے کا طریقہ نیا یا ہمارا اختراع نہیں بلکہ بہت متداول اصول ہے جب کسی قدیم کتاب میں ہمیں کوئی عبارت ایسی نظر آتی ہے جو مصنف کے ذاتی معلومات یا عقائد یا اس زمانے کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتی تو بالعموم اتنے ٹکڑے کو ہم الحاقی اور کسی زمانہ مابعد کے شخص کا اضافہ قرار دیتے ہیں مثلاً جوزیفس مشہور یہودی مصنف کی کتاب میں جس کو مسیح کا معاصر سمجھا جاتا ہے ایک ایسی عبارت ملتی ہے جس میں مسیح کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو ایک یہودی کے معتقدات سے بظاہر بعید معلوم ہوتے ہیں صرف اس بنیاد پر کہ ایک یہودی کے قلم سے اس قسم کے الفاظ نہیں نکل سکتے تھے، اہلِ نظر علماء کے نزدیک یہ ٹکڑا الحاقی ہے[۵۲]۔ اور کسی خوش عقیدہ مسیحی کا ایک عابدانہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ اسی ایک مثال کو پیشِ نظر رکھ کر غور فرمائیے کہ آیت کا مروجہ مفہوم کیوں مسترد نہیں کیا جاسکتا؟

---

۵۱. J. Sanhedrin. PP. 325 (Talmud)

۵۲. Friedrich Loofs P. 24.25.26.

یہاں ہم ایک یہودی روایت نقل کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوسکیگا کہ یہودی ربیون کے تصورات میں بھی یہ ترجمہ نہیں تھا۔

سوال :۔ "ہارونؑ موسیٰؑ سے بڑے تھے اور خداوند ہارونؑ سے بزرگتر ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خدا ہارونؑ سے ہمکلام نہ ہوا۔

جواب :۔ اس لئے کہ ہارونؑ کے دوسرے بیٹے "ندب"[۱] اور "ابیہوہ" کو گناہ سے نہ روک سکے۔"[۲]

اب ملاحظہ فرمائیے کہ خدا سے ہمکلامی کا شرف نہ حاصل ہونے کی وجہ یہ ظاہر کی گئی کہ ہارون کے دوسرے بیٹے "ندب" اور "ابیہوہ" کے مقابلہ میں "نہی عن المنکر" کا فرض جو ان کے ذمے عائد تھا پورا نہ کرسکے گویا "ہارون" نے یہ نقصان صرف بیٹوں کی کمزوری سے اٹھایا۔

کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس عالم کے پیشِ نظر آیت کا مروجہ مفہوم تھا؟ میرے نزدیک اگر یہ مفہوم اس کے سامنے ہوتا تو اس قدر دور از کار تاویل پیش کرنے کی بجائے شاید اس آیت کو پیش کرنا زیادہ سہل اور مفید مطلب تھا۔

ان حقائق کے باوجود بار بار یہ بات دل میں کھٹکتی ہے کہ جب بائبل میں کوئی مقام ایسا موجود ہی نہیں جس سے ہارونؑ کا گوسالہ ساز ہونا پایا جاتا ہو تو پھر ایک جماعتِ کثیر کا یہ عقیدہ کس طرح تھا۔ اور کس طرح انھوں نے یہ یقین کرلیا کہ ہارونؑ اس گناہِ عظیم کے مرتکب ہوئے تھے؟ کوئی قطعی ثبوت تو فی الحال موجود نہیں۔ البتہ قیاس چاہتا ہے کہ اس عقیدے کی بنیاد چوتھی آیت کے اسی غلط ترجمے میں مضمر ہے یا بالفاظِ دیگر اس عقیدے کی تاسیس اسی عہد سے تعلق رکھتی ہے جس عہد میں بائبل کے تراجم دوسری زبانوں میں ہونا شروع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اہم مترجم نے ضمیروں کو غلط[۳] استعمال کرکے اس عقیدے

---

[۱] "ندب" اور "ابیہوہ" بھی دونوں ہارون ہی کے لڑکے تھے۔ ان کا گناہ یہ تھا کہ انھوں نے خداوند کے روبرو "اجنبی آگ" پیش کی تھی۔ (احبار ۱۰: ۱، ۲)

[۲] Josephtha aboth of R. Nathan (Talmud) Vol. 1 (IX) P. 125

[۳] یہاں قدیم مترجمین بائبل کی دو ایک غلطیاں مثال میں پیش کی جاتی ہیں جو صرف اعراب کے غلط استعمال یا کسی مشابہ حرف کو غلط پڑھنے کا نتیجہ ہیں؛ پیدائش ۱۵: ۱۱ کا عبرانی متن اس طرح ہے:۔

کی ابتدا غیر شعوری طور پر کی اور آہستہ آہستہ لوگوں کے دماغ متاثر ہوتے چلے گئے۔

اس قیاس کو ایک گونہ تقویت جوزیفس کی تاریخ سے ملتی ہے جو اس نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بائبل کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی ہے اور اس اعتبار سے گویا یہ بائبل کی ایک قدیم تفسیر ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس کتاب میں (خلافِ عادت) خروج کا ۲۲ واں باب بالکل حذف کر دیا گیا ہے گویا کہ یہ باب اس کی نظر سے گذرا ہی نہیں! اب تو یہ ہو نہیں سکتا کہ جوزیفس کے زمانے میں یہ باب توریت کے اندر موجود ہی نہیں ہو — اسپٹواجنٹ ترجمہ جو اس کے عہد سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور خود اس کے استعمال میں تھا اس باب کی موجودگی کا شاہد ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس مصنف نے پورے واقعہ کو نظر انداز کر دیا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوزیفس اس ترجمہ کے مفہوم سے متفق نہیں تھا اور اس کی رائے میں اس باب کا ترجمہ خواہ اس کے عقیدے کے اعتبار سے خواہ کسی دوسری وجہ سے مشکوک اور غلط تھا — قیاس چاہتا ہے کہ شاید اسی بنیاد پر اس نے پورے واقعے کو نظر انداز کر دیا، یا یوں سمجھئے کہ مزید تحقیق کی غرض سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵ سے) "تب شکاری پرندے ان لاشوں پر اترے پھر ابرام نے انھیں ہانکا"

سینٹ جیروم (ST Gerom) نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اسپٹواجنٹ ترجمے میں اعراب کے غلط استعمال کی وجہ سے آیت کے آخری حصے کے معنی بالکل بدل گئے۔ یعنی بجائے "ابرام نے انھیں ہانکا" کے ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے "ابرام ان کے ساتھ بیٹھ گیا" یہ غلطی صرف اس بنا پر ہوئی کہ مترجمین نے (وَیَشِبْ تَم) کی بجائے (وَیِشِبْ تَم) پڑھا۔ (Paterson PP. 8)

اسی اسپٹواجنٹ ترجمے کی ایک دوسری غلطی ملاحظہ ہو جو صرف حرف (ر) کو (د) پڑھنے کا نتیجہ ہے:

۱۔ سموئیل ۱۹: ۱۳ کا (جہاں یہ دکھایا گیا ہے کہ میکال نے اپنے شوہر داؤد کو ساؤل کے ہاتھ سے بچ نکلنے میں کس طرح مدد کی) عبرانی متن اس طرح ہے: "اور میکال نے بت لیکے پلنگ پر لٹا رکھا اور ایک بکری کے بالوں کا تکیہ اس کے سرہانے رکھا اور اوپر سے چادر اڑھا دی۔"

اسپٹواجنٹ کے مترجم نے لفظ (کبر) کو (کبد) پڑھ کر اس کا ترجمہ اس طرح کیا کہ "میکال نے اس کے سرہانے بکری کا جگر رکھا (Paterson PP. 17.)

چونکہ جوزیفس کے پیشِ نظر اسپٹواجنٹ ہی ترجمہ تھا اس لئے اس نے اس واقعے کو اسی طرح لکھا ہے بلکہ قدرتی طور پر اس کو اتنا اور اضافہ کرنا پڑا کہ بکری کے جگر کے کودنے کی وجہ سے بستر میں ایسی حرکت پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی سانس لیتا ہو۔ (Josp Ant VI. 11: 4.)

اس جگہ اس نے "بیاض" چھوڑ دی۔ اگر ہمارا یہ قیاس ٹھیک ہے تو جوزیفس کے اس "باب" کو ترک کرنے کے ایک معنیٰ یہ بھی ہوتے ہیں کہ اس عہد کے دوسرے اکابر علما بھی مروجہ ترجمے سے غیر مطمئن تھے چنانچہ ہمارے پاس اس بات کی دستاویزی شہادت موجود ہے کہ جوزیفس کے عہد یا اس سے کچھ بعد تک بھی آیت کا مروجہ مفہوم بہت سے بڑے بڑے دینداروں کو تسلیم نہیں تھا۔ مثلاً سینٹ اسٹیفنس کا بیان جو ہم چوتھی آیت کے ذیل میں نقل کر چکے اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو خود سینٹ اسٹیفنس یا کتاب اعمال کا مصنف اس آیت کے مروجہ مفہوم کو تسلیم نہیں کرتا تھا ــــ سینٹ پال کے خط سے بھی جس کا ذکر آپ چھٹی آیت کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی چوتھی آیت کا مروجہ مفہوم صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ وہ پوری چھٹی آیت کو بت پرستوں سے متعلق کرتے

ان تمام شواہد سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں اگر ایک طرف مروجہ مفہوم کا ترجمہ پایا جاتا تھا تو دوسری طرف ایسے علمار بھی موجود تھے جو اس ترجمے کو تسلیم یا قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔

آخر میں لیکن بہت ہی زیادہ اہم شہادت ہمارے پاس خود قرآن کی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بائبل کا قدیم عربی ترجمہ جو عہدِ رسالت میں حجاز کے رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس ہوگا آیت کے مروجہ مفہوم سے خالی تھا اور عرب کے نہ صرف یہودی بلکہ عیسائی بھی ہرگز کسی ایسے مفہوم کو قبول نہیں کرتے تھے جو ہارونؑ کو اس گناہ کا ذمہ دار قرار دیتا ہو۔ ورنہ یہ بات شاید محال تھی کہ قرآن اس واقعے کو بلا کسی اختلافی اشارے کے نقل کرتا۔ بالفرض اگر قرآن کو اس عقیدے کی اصلاح منظور ہوتی تو وہ اول یہ بتاتا کہ یہودیوں یا عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے اور اصل واقعہ اس طرح گذرا جیسا کہ تعداد اصحابِ کہف یا شہادتِ مسیح میں کیا گیا ہے۔

ادبیات

سوزِ ناتمام

از جناب ماہر القادری

نہ وہ خمارِ شبانہ نہ وہ گراں خوابی — کہ دل کے ساتھ نظر ہے شریکِ بے تابی
مری نگاہ میں فاروقؓ و بوذرؓ و سلمانؓ — ترے خیال میں ہیں ابنِ رُشد و فارابی
زمانہ ساز ہے شاید کہ فطرتِ اسلام — بہت سے لوگ اسی دُھن میں ہوگئے بابی[1]
کسے خبر کہ ترے دل میں درد ہے کہ نہیں — کہ تیری آنکھ ابھی تک نہیں ہے عنابی
کھڑی ہوئی ہیں رہِ زندگی میں دیواریں — یہ پردہ ہائے حریر و غلافِ سنجابی!

طلوعِ مہر کو خوش آمدید کہتی ہے
سحر کے وقت ستاروں کی یہ خنک تابی

۱؎ ایران میں علی محمد باب نے زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ اسلام کو خود ایجاد سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کی۔ ماہر

ترکِ آرزو

تضمین بر شعر مرزا صائب تبریزی

از جناب الم مظفر نگری

کشتیِ دل بموجِ فنا خود رساندہ ایم — اے ناخدا ز جبر تو مجبور ماندہ ایم
بگرفتہ درس ہوش ز عرفانِ بیخودی — زور خمارِ بادۂ ہستی نشاندہ ایم

گوئید مرحبا بہ نہاں خانۂ ازل — داماں وآستیں زدوعالم فشاندہ ایم
مائیم برمنازل خودفائزالمرام — ازکارواں اگرچہ بسے دوررماندہ ایم
رقصیم صبح وشام بہروادیٔ جنوں — ازدست عقل دامن دل وارہاندہ ایم
یعنی بقول حضرت صائب دریں چمن — "ازبال وپرغبارِ تمنافشاندہ ایم"
"برشاخِ گل گراں بنود آشیانِ ما"

مکاشفات

ازجنابِ طور سیوہاروی۔ بی، اے

رہبر کا طلبگار نہیں شوق ہمارا — کافی ہے ہر اک گام پہ ہمت کا اشارا
بے سوز ہے گر زیست تو ہے مرگ سی بدتر — تو طالبِ درماں نہ ہو، کر درد گوارا
افزوں ہوئی رونے سے مرے رونقِ گلشن — ہر غنچۂ بے رنگ کو شبنم نے نکھارا
یہ لذتِ سرگرمیٔ رفتار تو دیکھو — ہر موجِ رواں کرتی ہے ساحل سی کنارا
کیا تجھ سے کہوں رفعتِ تخئیل کا عالم — کب ہوتا ہے الفاظ کو اظہار کا یارا
افلاک پہ ہے کون مرا محرمِ اسرار — یہ کس نے جہانِ مہ و انجم سے پکارا۔
کیوں ماند ہوئے جاتے ہیں مغرب کے مہ و مہر — کیا اوج پہ آنے کو ہے مشرق کا ستارا
اے نورِ سحر دہر میں پھر جلوہ نما ہو — بھاتا نہیں یہ شام کی ظلمت کا نظارا

ناکامیٔ پیہم کا مجھے غم نہیں اے طور
روشن ہے اسی سے مری ہستی کا شرارا

تبصرے

ادب اور زندگی | از احمد صدیق صاحب مجنوں گورکھپوری۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۶۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عمر پتہ:۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

آج کل "ترقی پسند ادب" یا "نیا ادب" کے عنوان سے ملک میں جس قسم کا لٹریچر فروغ پا رہا ہے اس کی بے عنوانی کے لئے سندِ جواز کے طور پر اس نظریہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ "ادب برائے ادب" کا نظریہ غلط ہے۔ ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ترقی پسند نوجوان ادیبوں کا یہ دعویٰ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن اس سے جو نتیجہ وہ اخذ کرتے ہیں اور اس کو جس قدر ہمہ گیر بنا دیتے ہیں۔ ہر سنجیدہ آدمی کے لئے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے ضرورت اس کی تھی کہ "ادب اور زندگی" کے باہمی تعلق پر بے لاگ تنقیدی نگاہ ڈالی جائے اور یہ بتایا جائے کہ ادب کا تعلق زندگی کے کن کن شعبوں سے ہے اور اس تعلق کے مقتضیات کیا ہیں؟۔ مجنوں صاحب گورکھپوری بھی اپنے رجحانات کے اعتبار سے "ترقی پسند" ہی معلوم ہوتے ہیں لیکن عام ترقی پسند ادیبوں کے بالمقابل ان میں سنجیدگی اور متانت اور حقائق کا صبر وسکون کے ساتھ جائزہ لینے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ مغربی ادبیات کے ساتھ انھوں نے مشرقی ادبیات کا مطالعہ بھی دقتِ نظر اور وسعت کے ساتھ کیا ہے۔ اس بنا پر اس کتاب میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے کافی غور وخوض کے بعد اور پراز معلومات لکھا ہے۔ وہ عام ترقی پسندوں کے خلاف اپنے ماضی سے بیزار نہیں بلکہ اس کی عظمت کے قائل ہیں اور اپنی جگہ پر اس کی افادیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ علاوہ بریں وہ اقتصادیات کو ہی ساری زندگی نہیں سمجھتے بلکہ اسے تو زندگی کی عمارت کا صرف ایک ستون مانتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اور بہت سے عناصر اور بہت سی قوتیں زندگی میں کام کر رہی ہیں" چنانچہ لکھتے ہیں" میں ان لوگوں کا ہم آواز نہیں، جو بھوک کو انسان کی واحد ضرورت

اور روٹی کو اس کی زندگی کا تنہا سبب بتاتے ہیں" (ص ۱۲۱) لیکن ساتھ ہی یہ دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ آج کل کے بدنام ترقی پسند ادیبوں کی طرح وہ بھی مذہب اور روحانیت سے بیزار نظر آتے ہیں اور ان دونوں کو کارل مارکس کے لفظوں میں "افیون کی چسکی" قرار دیتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اپنی اس کتاب میں انھوں نے جہاں کہیں مذہب یا کسی مذہبی کتاب کا تذکرہ کیا ہے ان کا انداز بیان حد درجہ قابلِ اعتراض اور گستاخانہ ہو گیا ہے۔ گنڈہ تعویذ کو "خیالی اور غیر واقعی" (ص ۴) کہنا تو خیر ایک معمولی سی بات ہے صفحہ ۶ پر کتبِ سماویہ کی نسبت لکھتے ہیں "اسی کے ساتھ ساتھ خرافات واساطیر بھی زیادہ منضبط اور معقول و مدلل ہوتے گئے۔ یہ مذہبی دور تھا اور ژند اوستا، اسفار موسوی انجیل، قرآن اور دوسری الہامی کتابیں اس دور کے سب سے بڑے ادبی اختراعات ہیں" روحانی اور اخلاقی اقدار سے بدعقیدہ ہونے کے باعث مجنوں صاحب کے نزدیک "صبر و شکر" اور تسلیم و رضا۔ سب خود فریبی ہے" (ص ۴۲) معلوم نہیں ہمارے ان ادیبوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ مشرق کی شاعری اور ادب میں مغرب کی شاعری کے بالمقابل جو جوش، ولولہ اور لطیفِ زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ مشرقی افکار میں لادینیت نہیں ہے اس بنا پر اقبال مرحوم کے لفظوں میں اُن کے ہاں عشق زندہ ہے۔ بخلاف اہلِ مغرب کے کہ وہاں "مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق" کا منظر نظر آتا ہے۔

پھر خالص ادبی اعتبار سے مجنوں صاحب نے حالی اور نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان پر بھی تنقید کی کافی گنجائش ہے۔ مثلاً ہمارے نزدیک یہ کہنا درست نہیں کہ "حالی نے زمانے کے ساتھ گھاٹے پر صلح کر لی اور اس کے ہر نشیب و فراز کو بغیر چون وچرا کے تسلیم کر لیا" (ص ۱۳۰) اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ "حالی کی شاعری فلسفہ اور تصوف سے بالکل خالی ہے" (ص ۱۲۸) ان سب سے قطع نظر ہمارے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب نظیر اکبرآبادی کے متعلق یہ عبارت ہماری نظر سے گذری لکھتے ہیں "نظیر نے ہندوؤں کے رسوم و روایات کی طرف زیادہ توجہ رکھی اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی معاشرت کے غالب عناصر یہی ہیں۔ نظیر نے یوں تو حمد و نعت، معجزہ حضرت علیؓ

اور معجزہ حضرتِ عباسؓ پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب برائے بیت ہیں اور ان میں وہ جان نہیں ہے جو کنہیا جی کے جنم" "بانسری" "ہر کی تعریف" "مہادیو جی" کے ایک ایک لفظ میں موجود ہے (ص ۱۰۲) مجنوں صاحب نے اس موقع پر بالارادہ یا بے ارادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے ورنہ ہر وہ شخص جس نے کلیاتِ نظیر کا مطالعہ کیا ہے وہ جان سکتا ہے کہ ان میں اسلامی رنگ کی نظمیں زیادہ ہیں یا ہندوانہ رنگ کی؟ رہا زورِ بیان کا معاملہ! تو ممکن ہے مجنوں صاحب کو نظیر کی ہندوانہ نظموں میں زور زیادہ نظر آتا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظیر کا خاص رنگ سب جگہ یکساں ہے۔ البتہ ہاں جس تہوار یا جس محفل کے ذکر میں "رنڈی" "شراب" "طبلہ" "ناچ" "بھڑوے" "ہولی" "گلال" اور "گھنگرو" وغیرہ کا ذکر آئے گا اس میں لامحالہ (اور وہ بھی نظیر ایسی طبیعت کے شاعر کے کلام میں) حمد و نعت ایسے سنجیدہ اور ثقہ مضامین کی بہ نسبت زیادہ رنگینی پیدا ہو جائیگی ــــ ان چند غلطیوں اور لغزشوں کے باوجود کتاب ادبی تنقید کے اعتبار سے پڑھنے کے لائق ہے۔ طباعت اور کتابت کی متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں اور خصوصاً انگریزی الفاظ تو اکثر و بیشتر غلط ہی ہیں۔ اگر ان کا بھی اہتمام کر لیا جاتا تو اچھا تھا۔

موجِ نیل از قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۷۶ صفحات طباعت و کتابت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ میرٹھ۔

سید مصطفیٰ لطفی منفلوطی مصر کے دورِ جدید کے نامور انشا پرداز تھے، ان کی انشا میں بلا کا زور، غضب کی روانی اور اثر انگیزی ہے۔ مرحوم نے اگرچہ زیادہ تر افسانے لکھے ہیں یا مضامین لکھے ہیں تو وہ بھی بالعموم افسانوی طرز میں ہی لکھے ہیں۔ لیکن در اصل انھوں نے افسانہ کی زبان میں حکمت و اخلاق کا نہایت موثر وعظ کہا ہے اور اس ذریعہ سے مصروالوں میں ایک ذہنی اور اخلاقی بیداری پیدا کی ہے۔ کئی سال ہوئے کہ قاضی زین العابدین صاحب سجاد نے بعض افسانوں کا اردو میں کامیاب ترجمہ کیا تھا جو لاہور سے "مصری افسانے" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیئے گئے تھے۔ اب دوبارہ ان افسانوں کو بعض اور دوسرے افسانوں اور مضامین کے ساتھ جو سب کے سب منفلوطی کے ہی تراجم ہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ "موجِ نیل" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

قاضی صاحب عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا بڑا عمدہ اور اچھا سلیقہ رکھتے ہیں چنانچہ اس مجموعہ کے ہر مضمون اور افسانہ سے فاضل مترجم کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ وہی اصل کا سا زور اور روانی، سلاست اور اثر انگیزی ہے

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کے لئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

سنہ ۳۹ء۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت:۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جن میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ۳ مجلد ۴

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام:۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۲ مجلد ۸

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳ مجلد ۴

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۴

سنہ ۴۰ء۔ نبی عربی صلعم:۔ تاریخِ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے قیمت ۱

فہم قرآن جدید ایڈیشن:۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو ازسرِنو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب۔ قیمت ۲ مجلد ۳

غلامانِ اسلام:۔ پچہتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت ۵ مجلد ۶

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق:۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے قیمت ۵ مجلد ۶

سنہ ۴۱ء:۔ قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت ۵ مجلد ۶

وحیِ الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ۳

بین الاقوامی سیاسی معلومات:۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت ۲

تاریخ انقلابِ روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت ۲

۱۹۴۳ء قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ۔ مجلد ۔

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں قیمت سے مجلد للعہ

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ ۱۲ عہ

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت: صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپے مجلد سات روپے۔

خلافتِ بنی امیہ:۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ، خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات سے مجلد ۱۲

۱۹۴۴ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی۔ قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم:۔ کتاب کے اس حصہ میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اور تاریخی واقعات کی مکمل تشریح وتفسیر کی گئی ہے قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

۱۹۴۵ء کی کتابوں میں "قرآن اور تصوف" مؤلفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی طبع ہوچکی ہے جو رفتہ رفتہ حضرات محسنین ومعاونین کی خدمت میں روانہ کی جارہی ہے۔

قصص القرآن جلد چہارم پریس [illegible] ہے۔

انقلاب روس بھی پریس میں ہے، بہت جلد تیار ہوجائے گی۔ صفحات ۳۰۰۔ قیمت سے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے توانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبا کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

~~۱۹۳۸ء~~ اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید اڈیشن جن میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت عہ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد عہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۲؍

~~۱۹۳۹ء~~ نبی عربی صلعم۔ تاریخِ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید اڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد عہ

غلامانِ اسلام۔ اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد عہ

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ مجلد عہ

~~۱۹۴۰ء~~ قصص القرآن حصہ اول۔ جدید اڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت عہ مجلد عہ

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ۳؍

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

برہان

جلد شانزدہم شمارہ (۲)

فروری ۱۹۴۶ء مطابق ربیع الاول ۱۳۶۵ھ

فہرست مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۶۶
۲۔ اسلام اور نظام سرمایہ داری		
جذبۂ اکتناز کی مضرتوں پر ایک نظر	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ	۶۹
۳۔ بیت المقدس پر اجمالی نظر	جناب منشی عبدالقدیر صاحب	۹۸
۴۔ راندیر		
عرب جہازرانوں کی قدیم بستی	جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی	۱۲۲
۵۔ ادبیات:۔		
تہذیب نو	از جناب ماہر القادری	۱۲۵
۶۔ تبصرے۔	م۔ ح	۱۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اگر ایک شخص یا دو شخص کسی فریب میں مبتلا ہو کر کوئی افسوسناک یا مضحکہ انگیز حرکت کرنے لگیں تو آپ ان کا مذاق اڑا سکتے ہیں۔ انھیں ملامت کر سکتے ہیں۔ اور انھیں ان کی سبک حرکتی پر برا بھلا بھی کہہ سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اگر پوری کی پوری قوم ہی کسی فریب خیال و عمل کے حمام میں برہنہ ہو کر ناچنے لگ جائے تو آپ اسے کیا کہیں گے۔ کس کس کو برا کہئے گا اور کس منہ سے فرمائیے گا کہ آپ خود بھی تو اسی قوم کے ایک فرد ہیں۔ آج الکشن کے عنوان سے پورے ہندوستان کی مسلمان آبادی میں جو ہڑبونگ پھیلی ہوئی ہے۔ غور کیجئے تو یہ سب اسی نوع کی فریب خوردگی کا ایک نہایت المناک نظارہ ہے اگر مسلمانوں نے آئندہ کبھی سنجیدگی اور متانت سے آج کے واقعات کا جائزہ لیا تو یقین ہے کہ کل انھیں جوش و خروش کے ان تمام مظاہروں پر ندامت اور شرمندگی ہوگی جن میں آج وہ بڑے احساسِ غرور و تمکنت کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں

ووٹ کے ذریعہ جو لوگ الکشن میں کامیاب ہوتے ہیں وہ عوام کا نمائندہ کہلاتے ہیں اور ان کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو عوام کا اعتماد حاصل ہے اور عوام نے اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال پوری آزادی اور دیانت داری کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن ایمان سے بتائیے کہ کیا واقعہ بھی یہی ہے؟ کیا درحقیقت جس شخص نے الکشن میں کامیابی حاصل کی ہے اس کی نسبت یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے حلقہ کے رائے دہندگان نے اپنی رائے کا آزادی کے ساتھ استعمال کر کے اسے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے؟ جن قوموں کے عوام تعلیم یافتہ ہیں اور جو اپنے اچھے برے کی تمیز اور پہچان رکھنے کے ساتھ اپنی رائے کو آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کی جرأت اور جسارت بھی رکھتے ہیں۔ بے شبہ ان کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ

انھوں نے جس شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر کونسل یا اسمبلی میں بھیجا ہے وہ واقعی ان کا نمائندہ ہے اور اس کو اپنے حلقۂ انتخاب کا اعتماد حاصل ہے۔

لیکن ہندوستان میں مسلم عوام کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے' ان میں نہ تعلیم ہے نہ سیاسی شعور ہے' نہ دستوری اور آئینی پیچیدگیوں کا احساس ہے اور نہ اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ سب خطرات سے بے نیاز ہو کر اپنی رائے کا اظہار آزادی اور بیباکی سے کرسکیں. آج الکشن کے میدانِ کارزار میں دیکھ لیجئے کیا ہو رہا ہے! عوام کی زندگی اور ان کی معاشرتی دنیا سے الگ رہنے والوں کا ایک مخصوص طبقہ ہے جو مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہو کر اور اپنی اپنی پارٹی کا ٹکٹ لیکر کونسلوں کی ممبری کے لئے جدوجہد کر رہا ہے ان پارٹیوں کے خاص خاص نعرے ہیں جن کے ذریعہ عوام کی رائے کو متاثر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس طبقہ میں جو زمیندار اور جاگیردار ہیں وہ اپنے اس رسوخ اور اثر کو کام میں لارہے ہیں علمائے کرام اپنے ورع اور تقدس کے نام پر ووٹ طلب کر رہے ہیں ایک فریق دوسرے فریق کو کہتا ہے کہ یہ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں اور اسلام کو تباہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ دوسرا فریق اپنے حریف کی نسبت کہتا ہے کہ یہ حکومت کے غلام اور اپنی غرض کے بندے ہیں ان کو اسلام اور مسلمانی سے کیا واسطہ؟ پھر اس پر بھی بس نہیں! اس کے ساتھ ساتھ زجر و توبیخ اور تخویف و تہدید بھی ہے اپنے حریفوں کیلئے سب و شتم' زدوکوب اور گالی گلوچ غرض یہ کہ سب ہی کچھ روا ہے' فتاویٰ کی بھرمار ہو رہی ہے اسی ایک چیز پر دوزخ اور جنت کا فیصلہ ہو رہا ہے گویا اب اسلام اور کفر کا دارومدار صرف اس پر رہ گیا ہے کہ کون کس پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دیتا ہے۔

فلسطین کے عربوں پر قیامت گذر گئی' انڈونیشیا کے مسلمان ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہے ہیں ہندوستان کا مسلمان استعماریت کے پنجہ میں صیدِ زبوں بنا ہوا ہے شام اور لبنان کے فرزندانِ توحید فرانسیسیوں کی سنگینوں کے زیر سایہ زندگی کا سانس لے رہے ہیں' ٹرکی پر روس اپنے حرص و آز کے دندان تیز کر رہا ہے۔ ایران میں اشتراکیت کے عفریتِ جاں شکار نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ کروڑوں بندگانِ خدا افلاس اور غریبی کے مارے ہوئے درد و کرب میں مبتلا ہیں۔ عالمِ اسلام کا گوشہ گوشہ ماتم کدۂ آہ و بکا بن گیا ہے۔ لیکن ان سب آفات و

مصائب کے باوجود جن ارباب تقدس کے لب دہن سے جزع وفزع کی ایک آہ بھی نہ نکل سکی آج وہ بھی اپنا گوشۂ عافیت چھوڑ کر الکشن کے میدان میں اتر پڑے ہیں اور صرف اس لئے کہ وہ جس فریق کی حمایت کررہے ہیں اگر الکشن میں اس کو کامیابی نہ ہوئی تو اس ملک میں ایک ہزار سال سے رہنے بسنے والا اسلام یہاں سے فنا ہو جائیگا اور مسلمان ہمیشہ کے لئے نیست نابود ہو جائیں گے۔ "بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

ہمارا روئے سخن کسی ایک پارٹی کی طرف نہیں ہے بلکہ ہم مسلمانوں کی تمام پارٹیوں کے مقتدر رہنماؤں سے پوچھتے ہیں کہ خدا کے لئے ذرا انصاف سے کام لیجئے اگر آپ نے عوام کے بنانے اور سدھارنے کے لئے کوئی تعمیری کام نہیں کیا اور ہر الکشن کے موقع پر اسی طرح ان غریبوں کے ذہن ودماغ سے کھیلتے رہے تو آئندہ چل کر ہندوستان تقسیم ہو یا ایک ہی متحدہ ہندوستان بنے بہرحال مسلمان کسی گوشہ میں بھی ترقی یافتہ اور مضبوط قوم کی حیثیت سے زندگی بسر نہیں کرسکتے ان سب طرز جدید وقدیم کے مسلمان رہنماؤں کو سوچنا چاہئے کہ انھوں نے عوام کی اخلاقی تعلیمی اقتصادی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اب تک کیا کیا ہے؟ قوم کی اصل تعمیر کا راز اس میں مضمر ہے کہ اس کے عوام تعلیم یافتہ ہوں، زندگی کی ضرورتوں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے نئے اور ترقی یافتہ طریقوں سے واقف ہوں، سیاسی شعور رکھتے ہوں اور صنعت وحرفت، زراعت و کاشتکاری وغیرہ کا کوئی میدان ایسا نہ ہو جس میں ان کے قدم دوسری قوموں سے پیچھے ہوں۔ پھر ساتھ ہی ان کی ذہنی اور دماغی تربیت اس طرح کی گئی ہو کہ وہ مضبوط کیرکٹر کے مالک ہوں۔ ان میں خود اعتمادی اور عزتِ نفس کا جوہر اس درجہ کامل ہو کہ وہ کسی قوم کا آلۂ کار بن کر اپنا قومی مفاد قربان نہ کرسکیں۔ اصل کام کرنے کا یہی ہے۔ اور ہر پارٹی کو جواب دینا چاہئے کہ اس راہ میں اس نے اب تک کیا کیا ہے؟

اسلام اور نظامِ سرمایہ داری

جذبۂ اکتناز کی مضرتوں پر ایک نظر

قرآن مجید کی روشنی میں

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ (۱۰۲-۱،۲)

(ترجمہ۔ کثرت کی خواہش نے تمہیں غافل کر رکھا حتیٰ کہ تم قبروں میں جا پہنچے)

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد

دنیا کا زر و مال بُری چیز نہیں، اچھی چیز ہے۔ تمام دنیاوی ضروریات اسی سے پوری ہوتی ہیں۔ اکثر دینی مقاصد بھی اسی کے ذریعے سرانجام پاتے ہیں۔ چنانچہ جا بجا قرآن مجید میں دولتِ دنیا کو لفظِ خیر اور لفظ فضل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۶۲-۱۰)

"پس جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (یعنی رزق) کو تلاش کرو۔"

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۷۳-۲۰)

"اور بعض اور لوگ ہیں جو زمین پر پھرتے ہیں اللہ کے فضل (یعنی روزی) کو تلاش کرتے۔"

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۲-۲۱۵)

"کہو جو کچھ بھی خیر (یعنی اچھے مال) سے خرچ کرو۔ وہ والدین، قرابت داروں، یتیموں مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے۔

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (۱۰۰-۸)   اور وہ خیر (یعنی مال) کی محبت میں سخت ہے

پس دولتِ دنیا کی مذمت تو کسی حال میں جائز نہیں۔ بعض انتہا پسند بزرگوں نے اور خصوصاً بعض شعرا نے تو دنیا کے زر و مال کو مطلق لعنت قرار دے رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسلامی ادبیات میں اس انتہا پسندانہ روش نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی پستی ایک حد تک اقتصادی پستی کا نتیجہ ہے اور یہ اقتصادی پستی ایک حد تک اسی قسم کی ادبیات کا نتیجہ ہے بعض لوگوں نے تو اس بارے میں اتنا مبالغہ کیا کہ فی الواقعہ دوسرے رنگ میں وہ رہبانیت کی تعلیم دینے لگ گئے۔ حالانکہ انھیں یہ بھولنا نہ چاہیئے تھا کہ اسلامی تعلیمات میں رہبانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر کسبِ معیشت کی تعلیم موجود ہے۔ ذیل میں "اسلام کا اقتصادی نظام" مصنفہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی (صفحات ۶۲-۶۳) سے چند احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے طلبِ معیشت پر کتنا زور دیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ۔	"رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریضہ عبادت کے بعد کسبِ حلال (سب سے بڑا) فریضہ ہے۔"
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلیتم الفجر فلا تنوموا عن طلب ارزاقکم	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب فجر کی نماز پڑھ چکو تو اپنے رزق کے لئے جد وجہد کئے بغیر نیند کا نام نہ لو۔"
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الذنوب ذنوبٌ لا یکفرھا الا الھم فی طلب المعیشۃ۔	"رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہوں میں سے بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ صرف طلبِ معیشت کی فکر ہی سے ہو سکتا ہے۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ — "حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تم
اطلبوا الرزق فی خبایا الارض — اپنی روزی کو زمین کے پوشیدہ خزانوں میں تلاش کرو۔

قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ — حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ
لا یقعد احدکم عن طلب الرزق۔ — تم میں سے کوئی شخص طلب رزق کو چھوڑ کر بیٹھ نہ جائے

نہ صرف کسب معیشت اور طلب رزق ہی واجب ہے بلکہ ایک حد تک دولت جمع رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ انسان پر ہر طرح کا زمانہ آتا ہے۔ کبھی رزق میں فراخی ہوتی ہے کبھی تنگی، کبھی دولت کمانے کی طاقت زیادہ ہوتی ہے کبھی کم۔ بلکہ بعض دفعہ دولت کمانے کی طاقت بالکل نہیں رہتی۔ اس لئے حسب مقدور ہر آدمی کا فرض ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ہمیشہ پس انداز کرتا رہے۔

قرآن مجید میں جہاں بارہا بار بلکہ صدہا بار زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کی ادائیگی کی تاکید آئی ہے۔ وہاں جا بجا اس بارے میں بھی افراط و تفریط سے منع کیا گیا ہے اور میانہ روی کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ حکم ہے کہ

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (۱۷-۲۹)

اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ باندھ ہی نہ دے اور نہ اس کو انتہائی حد تک کھول ہی دے کہ پھر ملامت کیا ہوا پچھتاتا ہوا بیٹھ رہے۔

یعنی اتنا بخیل بھی نہ بن کہ اپنے آپ پر، اپنے اہل و عیال پر اور مستحقین پر خرچ کرنا بالکل چھوڑ دے۔ اور نہ اتنا سخی بن کہ سب کچھ خرچ کر ڈالے یا سب کچھ دے ڈالے اور پھر پشیمان اور محتاج بن کر بیٹھ رہے۔

مسلمانوں میں عام طور سے جذبۂ زر اندوزی کی شکایت کم ہے اور فضول خرچی کی شکایت زیادہ۔ غیر مسلم جماعتوں میں معاملے کی صورت بالکل برعکس ہے۔ اُن دنوں کی بات ہے کہ میں بی لے کر کے لاکالج میں پڑھ رہا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ اس سال مرحوم میاں شاہ دین صاحب

جج چیف کورٹ لاہور بھی گرمیاں گزارنے ایبٹ آباد آئے ہوئے تھے۔ والد مرحوم ومغفور اور میاں صاحب موصوف ہر روز شام کے وقت سیر کے لئے اکٹھے باہر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی ساتھ چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن ہم تینوں بازار سے گزر رہے تھے کہ میں نے ایک دکاندار کی طرف اشارہ کرکے میاں صاحب کہا کہ یہ شخص شہر میں سب سے بڑا کنجوس ہے۔ یہ سن کر میاں صاحب ایک آدھ منٹ تو خاموش رہے۔ پھر والد مرحوم کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "میر صاحب! میں جب کسی مسلمان کی نسبت یہ سنتا ہوں کہ وہ کنجوس ہے تو بہت خوش ہوتا ہوں کہ آخر کوئی مسلمان تو ہے جو فضول خرچ نہیں" میاں صاحب مرحوم کے یہ لفظ سن کر میں نادم بھی ہوا کہ خواہ مخواہ ایک آدمی کی بدگوئی اور غیبت کی اور خوش بھی ہوا کہ ایک بڑا نکتہ ہاتھ آگیا۔ فی الواقعہ میاں صاحب مرحوم نے بہت پتے کی بات کہی۔ میں اُن کے اس ارشاد کو کبھی بھول نہیں سکتا۔

دولت جتنی بھی زیادہ ہو۔ اتنی ہی اچھی ہے خدا کی نعمت ہے اور خدا کا فضل۔ بشرطیکہ جائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہو۔ اور اس میں جتنے لوگوں کا حق ہے وہ بھی ادا کیا جائے اگر یہ نہ ہو تو دولت فی الواقعہ لعنت ہے اور جتنی زیادہ ہو۔ اتنی بڑی لعنت۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ	"جو لوگ جمع رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اللہ
وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ	کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک
بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا	عذاب کی خوشخبری دو جس دن اس سونے
فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ	چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا
وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا	اور اس سے ان کے ماتھے پہلو اور پیٹھیں داغ
کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ	دی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے جمع کیا تھا
تَکْنِزُوْنَ ۝ (۹-۳۴ و ۳۵)	اپنے لئے پس جو تم نے جمع کیا تھا اس کا مزہ چکھو

یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکتناز وہی معیوب ہے جس سے زکوۃ اور صدقات وغیرہ ادا نہ کئے جائیں۔ محض جمع آوری اور زراندوزی اور خزانے بھرنا برا نہیں حضرت رسولِ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے فرض کی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ پاک ہوجائے (ابوداؤد)

اشعۃ اللمعات میں ہے کہ "جب مال کی زکوٰۃ ادا ہوچکی تو تمہارا باقی مال پاک ہوگیا پھر اسے جمع کرو اور خزانے بھرو کوئی ڈر نہیں" (ج ۲ ص ۱۰)

جس چیز کو ہم آج کل عرفِ عام میں سرمایہ داری کہتے ہیں وہ چیز اسلام کے اقتصادی نظام میں قطعاً غیر ممکن ہے۔ اگر اسلام کی تعلیمات پر پوری سختی سے عمل کیا جائے تو ان معنوں میں کسی شخص کا سرمایہ دار بن جانا ممکن ہی نہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے اسلامی اقتصادی اصولوں پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اسلامی حکومت میں یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک طرف تو چند آدمی انتہائی عیش وعشرت میں زندگانی بسر کر رہے ہوں اور دوسری طرف پڑوس میں ہی بعض آدمی بھوک سے مر رہے ہوں۔ ایک طرف ایک آدمی شاہانہ زندگی بسر کر رہا ہو اور دوسری طرف ایک آدمی کے پاس نہ کھانے کو ہو نہ پہننے کو اور اگر بیمار پڑے تو علاج کے لئے بھی کچھ نہ ہو۔

بنگال کے قحط کو ابھی دنیا بھولی نہیں۔ کلکتہ کے جس شہر میں ہزاروں آدمی عیش وعشرت سے وقت گزار رہے تھے وہاں انہی دنوں اسی شہر کی گلیوں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی مرد اور عورت، بوڑھے اور بچے فاقوں سے جان توڑ رہے تھے۔ ایک طرف لاکھوں آدمی روٹی نہ ملنے کی وجہ سے مر رہے تھے اور دوسری طرف احتکار و اکتناز کے مرتکب سرمایہ دار غلہ فروش کروڑوں روپے کا ناجائز منافع حاصل کر رہے تھے۔ لوگوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس قحط میں بھوک کی وجہ سے فی موت سرمایہ داروں نے دو دو ہزار روپیہ غلہ کی گراں فروشی سے منافع حاصل کیا ہے سرمایہ داری کا یہی نظام ہے جو بنی نوعِ انسان کے لئے ایک لعنت ہے اور قہرِ الٰہی کی ایک شکل۔

اسلامی نظام میں یہ صورتِ حالات کبھی واقع ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اسلامی تعلیمات میں اس قسم کی سرمایہ داری کے خلاف بعض نہایت سنگین موانع موجود ہیں۔

مانع اول | زکوٰۃ۔ ہر صاحب نصاب مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہے۔ چاندی کا نصاب دو سو درم یعنی

ساڑھے باون تولہ۔ سونے کا نصاب بیس دینار یعنی ساڑھے سات تولہ۔ اسی طرح اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری وغیرہ کا الگ الگ نصاب مقرر ہے۔ شرح زکوٰۃ ہے مال کا چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فی صدی۔

یاد رہے کہ زکوٰۃ انکم ٹیکس کی طرح آمدنی پر نہیں بلکہ کل سرمایہ پر ہے یعنی جس قدر تجارتی سرمایہ کسی شخص کے پاس موجود ہے اس تمام سرمایے کا چالیسواں حصہ اسے ہر سال زکوٰۃ میں دینا پڑتا ہے چند ضروریات کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام جائداد منقولہ وغیر منقولہ پر زکوٰۃ لازم ہے۔

آج کل کی طرح زکوٰۃ کی حیثیت انفرادی نہیں کہ جو شخص چاہے ادا کرے اور جو نہ چاہے نہ ادا کرے۔ یا کم و بیش ادا کرے۔ بلکہ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی وصولی بطور ایک ٹیکس کے حکومت خود کرتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے عہدِ خلافت میں چند قبائلِ عرب نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا تو انھوں نے ان قبائل پر جہاد کا ارادہ کیا۔ اس پر بعض صحابہ کبار نے کہا کہ مسلمانوں پر جہاد کس طرح ہو سکتا ہے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بکری کا ایک بچہ بھی زکوٰۃ میں دیتا تھا اگر وہ اس کے دینے سے انکار کرے گا تو میں اس کے مقابلے میں جہاد کروں گا۔

زکوٰۃ کا بڑا مصرف مسکینوں کی امداد ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔

کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے	ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ
تاکہ ان کے دولت مندوں سے لیکر ان کے	توخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم
مسکینوں کو دی جائے۔ (بخاری ومسلم)	(متفق علیہ)

قانونِ اسلامی میں زکوٰۃ کے مصرف یہ لکھے ہیں۔ فقیر و مسکین و عامل و مکاتب و مدیون اور منقطع الغزات وابن سبیل یعنی مسکینوں اور فقیروں کی امداد کرنا۔ زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو تنخواہ دینا، غلام کو آزاد کرانا، مقروض کا قرض ادا کرنا۔ جہاد کی ضروریات کا حاجت مند مجاہد کے لئے مہیا کرنا اور مسافر کی امداد کرنا۔ آپ نے دیکھا کہ سوائے زکوٰۃ وصول کرنے والے کی تنخواہ کے زکوٰۃ کی باقی تمام آمدنی

محتاجوں کی حاجت برآری میں صرف ہوتی ہے۔

اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کا تمام روپیہ بیت المال (خزانے) میں جمع ہوتا تھا اور پھر حکومت کی طرف سے نادار لوگوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ یہ تقسیم بھی باضابطہ ہوتی تھی۔ تمام معذور اور محتاج لوگوں کی فہرستیں مرتب ہوتی تھیں اور ان کو باقاعدہ ماہانہ ملتا تھا۔ تاریخ اسلام کی سرسری ورق گردانی سے جو معلومات اس بارے میں مہیا ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھکر آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلامی عہدِ حکومت میں صورتِ حالات کیا تھی۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے کہ "ایک مرتبہ ایک قافلہ آیا اور مدینہ کے باہر اترا آپ اس کی خبرگیری اور حفاظت کے لئے تشریف لے گئے۔ پہرہ دے رہے تھے کہ ایک بچہ کے رونے کی آواز سنی۔ پاس جاکر اس کی ماں کو تاکید کی کہ بچہ کو بہلائے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اُدھر سے گزرے تو پھر بچہ کو روتے پایا۔ ماں کو ڈانٹا کہ تو بڑی بے رحم ہے۔ اس نے کہا تم کو اصل واقعہ کی خبر نہیں ہے، خواہ مخواہ مجھے دق کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا ہے کہ جب تک بچے دودھ نہ چھوڑیں اس وقت تک بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے۔ اس لئے میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں۔ اس پر وہ روتا ہے یہ سن کر حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور فرمایا ہائے عمرؓ تونے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔ اسی دن منادی کرادی کہ جس دن سے بچہ پیدا ہو۔ اسی دن سے وظیفہ مقرر کیا جائے۔

"حضرت عمرؓ کو اس کا بڑا خیال تھا کہ رعایا کا کوئی فرد بھوکا نہ رہنے پائے۔ چنانچہ ملک میں جس قدر معذور و مجبور اور ازکار رفتہ آدمی تھے بلاقید ملت و مذہب بیت المال سے سب کے روزینے مقرر تھے۔ لقطہ یعنی ان لاوارث بچوں کی پرورش کا انتظام بھی بیت المال سے تھا جن کی مائیں انھیں راستوں پر پھینک جاتی تھیں ایسے بچوں کے لئے ابتدا میں سو درہم سالانہ مقرر ہوتے تھے پھر ان کی عمر بڑھنے کے ساتھ اس میں سال بسال ترقی ہوتی جاتی تھی"۔ [۵۲]

عثمانی عہدِ خلافت کی بات ہے کہ "آمدنی میں اضافہ کے ساتھ آپ نے لوگوں کے وظائف

---

[۵۱] تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین احمد حصہ اول ص ۲۱۴۔ [۵۲] ایضاً ص ۲۱۶

میں اضافہ فرمایا جن لوگوں کو رمضان کے مصارف کے لئے نقد ملتا تھا ان کا کھانا بھی مقرر کیا۔[1]

"یہ ولید کا قابلِ فخر کارنامہ ہے کہ اس نے تمام ممالکِ محروسہ کے معذور ناکارہ اور اپاہج لوگوں کے روزینے مقرر کرکے انھیں بھیک مانگنے کی ممانعت کردی۔ اندھوں کی رہنمائی اور اپاہجوں کی خدمت کے لئے آدمی مقرر کئے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس سے آج کل متمدن حکومتیں بھی عاجز ہیں۔ یتیموں کی کفالت اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ اشیاء کے نرخ کی نگرانی بھی رعایا کی بڑی خدمت ہے۔ ولید خود بازاروں میں جاکر چیزوں کی قیمت دریافت کرکے ان کو کم کراتا تھا"[2]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے متعلق لکھا ہے کہ "ملک میں جتنے مجبور اور معذور اشخاص تھے۔ سب کے نام درج رجسٹر کرکے ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ اگر اس میں کسی عامل سے ذرا بھی غفلت ہوتی تھی تو سخت تنبیہ کرتے تھے۔ بعضوں کو نقد کی بجائے جنس ملتی تھی۔ ان کے علاوہ تمام ملک کے حاجتمندوں میں صدقات تقسیم ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک شخص کو غرباء میں صدقات تقسیم کرنے کے لئے رقعہ بھیجنا چاہا۔ اس نے عذر کیا کہ میں ناواقفیت کی وجہ سے وہاں کے امیر و غریب میں امتیاز نہیں کرسکتا۔ فرمایا جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دیدینا۔ ناجائز آمدنیوں کے سدباب، مظالم کے انسداد اور عام داد و دہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے زمانے میں رعایا بڑی آسودہ حال ہوگئی ملک کے طول و عرض سے افلاس و غربت کا نام و نشان مٹ گیا اور کچھ دنوں میں صدقہ لینے والے نہ ملتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے صرف ڈھائی برس خلافت کی۔ اس مختصر مدت میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ لوگ عمال کے پاس صدقہ کا مال تقسیم کرانے کے لئے لے جاتے تھے۔ اور کوئی لینے والا نہ ملتا تھا اور وہ لوگ مجبور ہوکر صدقہ واپس لے جاتے تھے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے رعایا کو اس قدر آسودہ حال کردیا تھا کہ کوئی شخص حاجتمند باقی ہی نہ رہ گیا تھا"[3]

انہی کے متعلق لکھا ہے کہ "ممالکِ محروسہ میں بکثرت سرائیں بنوائیں، خراساں کے والی کو لکھا کہ وہاں کے تمام راستوں میں سرائیں تعمیر کرائی جائیں۔ سمرقند کے والی سلیمان بن ابی السری کو حکم

---

[1] تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین احمد حصہ اول ص ۲۷۷۔ [2] ایضاً حصہ دوم ص ۲۰۴ و ۲۰۵ [3] ایضاً ۲۷۴ و ۲۷۵

بھیجا کہ اس علاقے کے تمام شہروں میں سرائیں تعمیر کرائی جائیں اور جو مسلمان ادھر سے گزرے۔ ایک شبانہ یوم اس کی میزبانی کی جائے۔ اس کی سواری کی حفاظت ... ... کی جائے۔ بیمار مسافر کی دو دن میزبانی کی جائے۔ جس کے پاس گھر تک پہنچنے کا سامان نہ ہو۔ اس کا سامان کیا جائے"۔ [1]

نہ صرف مسلم رعایا بلکہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا تھا۔ چنانچہ" نادار بیکس اور معذور ذمی جزیہ سے مستثنٰی تھے اور بیت المال سے ان کی کفالت کی جاتی تھی۔ حیرہ کی فتح کے معاہدے میں اس کی تصریح ہے کہ اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہو جائے۔ یا کوئی آفت آئے یا دولت مندی کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو مسلمانوں کے بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔ یہ معاہدہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسی پر عمل رہا۔ بلکہ آپ نے اس کو قرآنی استدلال سے اور زیادہ موکد کر دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک ضعیف شخص کو بھیک مانگتے دیکھا۔ پوچھا بھیک کیوں مانگتا ہے۔ اس نے کہا مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور مجھ کو اس کے ادا کرنے کا مقدور نہیں۔ یہ سن کر آپ اسے اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد دیکر داروغہ کو کہلا بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے"۔ [2]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی برتو۔ ان میں جو بوڑھا اور نادار ہو جائے اس کی کفالت کا انتظام کرو۔ اگر اس کا کوئی صاحبِ حیثیت رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو۔ ورنہ بیت المال سے کفالت کا انتظام کرو۔ جس طرح اگر تمہارا کوئی غلام بوڑھا ہو جائے تو اسے یا تو آزاد کرنا پڑے گا یا مرتے دم تک اس کی کفالت کرنی پڑے گی"۔ [3]

تاریخ فیروز شاہی مصنفہ شمس سراج عفیف میں لکھا ہے کہ" بادشاہ باخیر و برکت نے مثل دیگر سلاطینِ عالم کے ناکتخدا غریب لڑکیوں کی تزویج کے لئے دیوانِ خیرات بنا کے۔ وہ غمزدہ مسلمان جو فقیر و صاحبِ دختر تھے اور ان کی لڑکیاں حدِ بلوغ کو پہنچ چکی ہیں اور لڑکیوں کے باپ

---

[1] تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین احمد ج ص ۲۵۳ و ۲۵۴۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۲ و ۲۱۳۔ [3] ایضاً ج ۲ ص ۲۵۰

نادار و مفلس ہیں اور اس وجہ سے ان کے دل پریشان و ملول ہیں بلکہ اوقاتِ متبرک میں بھی ان کے دل پریشان رہتے ہیں اور ان کو نہ شب کو خواب نصیب ہے اور نہ دن کو آرام۔ اس بنا پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ایسے نادار اشخاص اپنے حال سے دیوانِ خیرات کو مطلع کر دیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دیوانِ خیرات کے عہدے دار ایسے اشخاص کی جستجو کریں۔ اور ان کو رقم خیرات عطا کریں۔ قسم اول کی پچاس تنگہ نقرہ اور قسمِ دوم تیس اور قسم سوم بیس تنگہ خیرات مقرر کی گئی۔ مختصر یہ کہ ایسا ایک خیرات خانہ قائم ہوا اور عہدہ دار اس کے انتظام میں مشغول ہوئے اور نادار مسلمان عورات کثیر تعداد میں ہر طرف سے آکر اپنی لڑکیوں کے نام درج کرا کے بیشمار اسباب ان کی تزویج کے لئے حاصل کرنے لگیں۔ غرضکہ بادشاہ کی عنایت و مہربانی سے ہزارہا لڑکیوں کے کار خیر سے فراغت ہوئی اور حدیث شریف کے مطابق کہ لڑکیاں رزق رسانی کی مستحق ہیں ان کے لئے سامان تزویج ہونے لگا حقیقت یہ ہے کہ لڑکیاں بھی عجیب مخلوق ہیں جن کی بابت خداوندِ کریم نے قرآن پاک میں باقیات الصالحات کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ [1]

ایک اور مقام پر لکھا ہے "اسی طرح فقراء و مساکین کے گروہ کو جو درماندہ و عاجز تھے۔ ایک کروڑ تنگے سالانہ مرحمت فرمائے تھے۔ تاکہ یہ گروہ اطمینانِ قلب کے ساتھ دین پروری کرے اور حاجاتِ دنیوی سے بے نیاز ہو کر آخرت کی نعمتیں حاصل کرے" [2]

مانع دوم عشر۔ زراعتی زمینوں پر زکوٰۃ کی جگہ ایک اور ٹیکس ہے جسے عشر کہتے ہیں۔ بارانی زمین اور ندی نالوں سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار کا ایک عشر یعنی دسواں حصہ حکومت بیت المال کے لئے وصول کرتی ہے۔ کنویں وغیرہ سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار کا نصف عشر یعنی بیسواں حصہ وصول کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس زمین کی سیرابی بغیر خرچ اور محنت کے قدرتی ذرائع سے ہوتی ہے اس کا ٹیکس زیادہ ہے اور جس زمین کو خرچ اور محنت سے سیراب کیا جائے اس پر ٹیکس کم ہے۔ عشری زمینوں پر جو شہد پیدا ہوتا ہے اس پر بھی عشر واجب الادا ہے۔

---

[1] ترجمہ اردو از مولوی محمد فدا علی صاحب طالب ص ۲۴۲۔ [2] ایضاً ص ۱۲۹۔

عشر کے مصارف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں یعنی اس ٹیکس کی آمدنی بھی مسکینوں اور ناداروں کی امداد پر خرچ کی جاتی ہے۔

مانع سوم | عشور۔ سوداگر جو مالِ تجارت لیکر ایک ملک سے دوسرے ملک میں آتے جاتے ہیں۔ یہ محصول ان سے لیا جاتا ہے۔ اس محصول کی وصولی کے لئے ملک کی سرحدوں پر حکومت کی طرف سے چوکیاں نصب کی جاتی تھیں۔ مسلمان تاجروں سے تو جو رقم بطور عشور وصول ہوتی تھی۔ وہ ان کی زکوٰۃ میں محسوب ہوتی تھی۔ البتہ ذمی اور حربی سوداگروں سے یہ رقم بطور محصولِ تجارت وصول ہوتی تھی۔ ذمی کافر جتنا مالِ تجارت ساتھ لیکر چوکی سے گزرتا تھا اسے اُس مال کا بیسواں حصہ بطورِ عشور دینا پڑتا تھا۔ حربی کافر سے مالِ تجارت کا دسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ یہ محصول آج کل کی کسٹم ڈیوٹی کی قسم سے ہے۔

اس محصول کی آمدنی ہر قسم کے وظائف اور شعبہ ہائے حکومت کے انتظامی اخراجات میں صرف کی جاتی تھی۔

مانع چہارم | رکاز۔ سونے چاندی لوہے وغیرہ کی کانوں کی آمدنی سے پانچواں حصہ بیت المال میں جاتا تھا۔ اور اگر کوئی دفینہ مل جاتا تو اس کا بھی یہی حکم تھا۔ اس ٹیکس کو خمس کہتے ہیں۔

رکاز کے مصارف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں۔ یعنی یہ ٹیکس بھی محتاجوں اور ناداروں کی امداد میں خرچ ہوتا تھا۔

مانع پنجم | صدقات۔ زکوٰۃ۔ عشر عشور اور رکاز کے علاوہ بھی قرآن کریم اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں متفرق صدقات وخیرات کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ صدقات بعض حالات میں واجب اور بعض حالات میں صرف مستحب ہوتے ہیں۔ صدقاتِ واجبہ تو ضرور بیت المال میں داخل کرنے پڑتے ہیں۔ البتہ مستحب صدقات کو آدمی چاہے تو خود محتاجوں میں تقسیم کردے اور چاہے تو بیت المال میں داخل کردے۔

روزہ نہ رکھ سکے تو غریبوں کو کھانا کھلائے۔ روزہ توڑدے تو غریبوں کو کھانا دے۔ کوئی

فضول قسم کر بیٹھے تو اس کو توڑنے کے لئے مسکینوں کو روٹی کھلائے غرضکہ بیسیوں ایسے موقعوں پر صدقات اور خیرات کرنے کا حکم ہے۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔

والذین یظٰھرون من نساءھم ثم — اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور
یعودون لما قالوا فتحریر رقبۃ من — پھر جو کہا تھا اس کی طرف پھر جاتے ہیں وہ
قبل ان یتماسا۔ ذلکم توعظون بہ — ایک غلام آزاد کریں پیشتر اس کے کہ بیوی کو
واللہ بما تعملون خبیر۔ فمن لم یجد — ہاتھ لگائیں تمہیں یہ نصیحت دی جاتی ہے
فصیام شھرین متتابعین من قبل — اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو جانتا ہے جو یہ نہ کرسکے
ان یتماسا۔ فمن لم یستطع فاطعام — متواتر دو مہینے روزے رکھے پیشتر ہاتھ لگانے کے
ستین مسکینا۔ (۵۸-۳ و ۴) — یہ بھی نہ ہو سکے تو ساٹھ فقیروں کو کھانا کھلائے

ظہار یہ ہے کہ مثلاً بیوی کو کہہ دیا کہ تو میری ماں ہے۔ یہ اس یاوہ گوئی کا کفارہ ہے۔

یا ایھا الذین امنوا اذا ناجیتم — اے ایمان والو جب سرگوشی کرنے آؤ
الرسول فقدموا بین یدی نجوٰکم — پیغمبر سے تو اس سرگوشی سے پہلے کچھ خیرات
صدقۃ۔ ذلک خیر لکم واطھر — کر لیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور پاکیزہ۔
فان لم تجدوا فان اللہ غفور — اگر خیرات کی توفیق نہ ہو تو اللہ بخشنے والا
رحیم (۵۸-۱۲) — مہربان ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔

فمن کان منکم مریضا او بہ اذی — پس جو کوئی تم میں سے بیمار ہو، یا سر میں
من راسہ ففدیۃ من صیام او — کوئی ایذا ہو تو بدلہ ہے روزے یا خیرات
صدقۃ او نسک (۲-۱۹۶) — یا ذبح۔

یہ حج اور عمرہ کے تعلق میں سر منڈانے کے احکام میں ہے۔

لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم — نہیں پکڑتا تم کو اللہ لغو قسموں میں۔ لیکن

ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان	پکڑتا ہے تم کو قصد سے باندھی ہوئی قسموں
فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین۔	میں۔پس اس کا کفارہ دس مسکینوں کو
(۵ - ۸۹)	کھانا کھلانا ہے۔

کفارہ ارادتًا اور قصدًا کی ہوئی قسم کے متعلق ہے۔

یاایھاالذین اٰمنوا لاتقتلوا الصید	اے ایمان والو مت مارڈالو شکار کو بحالیکہ
وانتم حُرُم ۔ ۔ ۔ اوکفارۃ	تم احرام میں ہو ۔ ۔ ۔ یا اس کا کفارہ ہے
طعام مسٰکین (۵ - ۹۵)	مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

حالتِ احرام میں شکار منع ہے جو کرے کفارہ ادا کرے۔

فمن کان منکم مریضا اوعلی سفر	اور جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو۔
فعدۃٌ من ایام اخر۔ وعلی الذین	وہ اور دنوں سے یہ گنتی پوری کرے اور جو
یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین۔	لوگ طاقت رکھتے ہوں ان پر بدلہ ہے
(۲ - ۱۸۴)	فقیر کو کھانا کھلانا

یہ رمضان کے روزوں کے متعلق ہے۔ تنسیخ وغیرہ کے مسائل سے یہاں بحث نہیں۔

نوع ششم | مالِ غنیمت۔ مسلمان حاکم جب کسی شہر کو لڑائی کر کے فتح کرے تو وہاں جو مال منقولہ یا غیر منقولہ اس کے ہاتھ آئے وہ مالِ غنیمت کہلاتا ہے۔

مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

نوع ہفتم | فئ۔ اگر دشمن مسلمانوں کے لشکر سے مرعوب ہو کر لڑائی کئے بغیر بھاگ جائے تو جو مال وہ چھوڑ جائے فئ کہلاتا ہے۔

یہ مال قریبًا تمام کا تمام یتیموں محتاجوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اسی طرح مالِ غنیمت میں بھی یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حصہ مقرر ہے۔

واعلموآ انما غنمتم من شئ فان	اور جانو کہ جو کچھ تمہیں غنیمت میں ملے۔

للہ خمسہٗ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل ۔ (۸ - ۴۱)

اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور رسول کے قرابتیوں اور یتیموں اور فقیروں اور مسافروں کے لئے ہے ۔

باقی چار حصے لشکر میں تقسیم ہوتے ہیں ۔

مانع ہشتم | خاص ٹیکس ۔ عام حالات میں تو مذکورہ بالا موانع کی موجودگی میں یہ صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی ۔ کہ ایک طرف تو ایک آدمی خزانہ جمع کر لے اور دوسری طرف ایک آدمی ناداری کی وجہ سے فاقوں سے مر جائے ۔ لیکن خاص حالات میں مثلاً قحط سالی وغیرہ کے وقت بعض ہنگامی صورتیں ایسی بھی پیدا ہو سکتی ہیں جن میں موانعِ ہفتگانہ مذکورہ بالا کے باوجود ملک کی اقتصادی سطح کو ہموار رکھنے کے لئے مزید ٹیکسوں کی ضرورت پڑ جاتی ہے ۔ ان حالات میں امیر المومنین کو شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ اہلِ ثروت لوگوں پر خاص ٹیکس عاید کر دے تاکہ قحطِ بنگال والی ہولناک صورت پیدا نہ ہو جائے اس کے علاوہ خراج ۔ جزیہ ۔ اوقاف وغیرہ وغیرہ حکومت کی آمدنی کی دیگر مدات سے بھی کام لیا جا سکتا ہے بالفاظِ دیگر حکومت کا تمام تر خزانہ (بیت المال) فی الواقعہ اسی لئے ہے کہ رعایا کا کوئی آدمی بھوکا ننگا نہ رہے ۔

غور سے دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ زکوٰۃ ۔ عشر ۔ عشور اور صدقات نہایت سنگین اور گراں بار ٹیکس ہیں ۔ کوئی حکومت بھی عام حالات میں اتنے بھاری ٹیکس عائد نہیں کرتی ۔ لیکن اس کے ساتھ جب دنیا کی اقتصادی سطح پر نظر ڈالیں تو وہاں کی ناہمواری بھی محیر العقول دکھائی دے گی ۔ ایک آدمی لاکھوں کا مالک ہوتا ہے ۔ تو دوسرا پیسے پیسے کا محتاج ۔ ایک آدمی محلوں میں رہتا ہے اور دوسرا سر چھپانے کے لئے ایک جھونپڑی بھی نہیں رکھتا ۔ ایسی ناہمواری کو کسی موثر حد تک دور کرنے کے لئے ایسے سنگین ٹیکسوں کے بغیر اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں ۔ جن حکومتوں کے خزانے سے غریبوں مسکینوں یتیموں اور معذور لوگوں کے لئے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہو سکتا ۔ ان حکومتوں کی ٹیکس گزار رعایا اگر ٹیکسوں کی گراں باری کے خلاف آواز اٹھائے تو وہ حق بجانب ہے ۔ لیکن اسلامی

نظامِ اقتصادیات میں ٹیکسوں کی سنگینی پر اُن کے مصارف کی موجودگی میں کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

علاوہ مذکورہ بالا موانع کے قانونِ اسلام میں بعض اور ایسے موانع بھی موجود ہیں۔ جو سرمایہ دارانہ نظامِ اقتصادیات کو خطرناک حدود تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ ذیل میں مختصر طور سے چند ایسے موانع کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مانع نہم | سود کی ممانعت۔ دنیا کی مالی سطح کو ناہموار کرنے میں سودی کاروبار کا بڑا ہاتھ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دکاندار سو دو سو کے سرمایہ سے کسی گاؤں میں جاکر دکان لگا دیتا ہے اور ساتھ ہی پانچ پانچ دس دس روپے سود پر لوگوں کو قرض دینا شروع کر دیتا ہے۔ رقمیں تھوڑی ہوتی ہیں لیکن شرحِ سود بہت سنگین ہوتی ہے۔ پانچ دس سال کے اندر اندر وہ دکاندار ایک بڑا مالدار ساہوکار بن جاتا ہے اور گاؤں کے غریب زمیندار سود کے نیچے دب کر گھر بار نیلام کرا بیٹھتے ہیں۔

سودی کاروبار سرمایہ داری کو ترقی دینے کے بڑے موثر وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے۔ اسلام نے سودی لین دین کو قطعاً حرام قرار دیدیا ہے لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے سود لینا تو حرام سمجھ رکھا ہے لیکن سود دینا حلال۔

مانع دہم | قانونِ وراثت۔ اکثر قوموں کا قانونِ وراثت بھی نظامِ سرمایہ داری کو ترقی دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ اکثر ملکوں میں قانونِ وراثت بحقِ پسر کلاں رائج ہے۔ اس قانون کی رُو سے جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو اس کی تمام ترجائداد کا مالک اس کا بڑا لڑکا ہوجاتا ہے دوسرے بیٹے صرف گزارہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس طرح بڑا بیٹا تو رئیس بن جاتا ہے اور اس کے چھوٹے بھائی گزارہ خور۔ بڑا بھائی ہزارہا ایکڑ زمین کا مالک اور چھوٹے بھائی پانچ پانچ دس دس کنال۔ زمین کے قابض۔ ہندوستان میں بھی بعض خاندان اور چند مسلمان خاندان بھی بروئے رواج اسی قانونِ وراثت پر کاربند ہیں۔ خود ہمارے ضلع میں بعض معزز مسلمان خاندان اسی رواج کے پابند تھے۔ لیکن اب صوبہ جٹر میں شریعت ایکٹ کے نافذ ہوجانے سے صورتِ حالات تبدیل ہو چکی ہے۔

قانونِ پسرِ کلان کے علاوہ بھی عام قانونِ وراثت اکثر قوموں میں نظامِ سرمایہ داری کا

ممد و معاون ہے۔ مثلاً عام قانونِ وراثت یہ ہے کہ صرف اولادِ نرینہ وراثت کی حقدار ہوتی ہے۔ بیٹیوں کو صرف شادی ہو جانے تک گزارہ ملتا ہے۔ بیوہ بھی صرف گزارے کی مستحق ہوتی ہے اگر اولادِ نرینہ نہ ہو تو ساتویں آٹھویں پشت سے ملتا ہوا کوئی آدمی آکر وراثت کو سنبھال لے گا۔ لیکن بچاری بیٹیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ پنجاب کے مسلمان آج بھی اسی ملعون قانون کے پابند ہیں۔ صوبہ سرحد میں البتہ چند سالوں سے اسلامی قانونِ وراثت کا عمل درآمد ہو چکا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی قانون کو دیکھیئے۔ بیٹے بیٹیاں، بیوی، خاوند، بہن، بھائی ماں باپ وغیرہ وغیرہ سب وراثت کے حقدار ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وراثت بسا اوقات سینکڑوں حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور لوگوں کی اقتصادی سطح میں کافی ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔

اگر دنیا کی قومیں اسلامی قوانین پر کاربند ہو جائیں تو تھوڑے عرصہ میں سرمایہ داری کی لعنت دنیا سے دور ہو جائے۔ اسلام کا اقتصادی نظام تمام تر اسی اصول پر مبنی ہے کہ افراد کی مالی حالتوں میں جو تفاوت بعض صورتوں میں انتہائی حد تک جا پہنچتا ہے۔ اسے حتی الامکان کم سے کم درجے پر رکھا جائے اور اس بات میں شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ اسلامی نظام اپنے مقصد کی تکمیل میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس نظام کے اصولی احکام پر عمل درآمد نہ کریں۔

بالشویزم روسی بالشویزم کو سرمایہ دارانہ نظامِ اقتصادیات کی تباہ کاریوں کے علاج کا آج خیال آیا ہے۔ لیکن اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے اس وبا کے مداوا کا نسخہ تجویز کر دیا تھا۔ بالشویزم نے اقتصادی سطح کی ناہمواری کو دور کرنے کے لئے ایک ہولناک بھونچال پیدا کیا۔ لیکن یہ بھونچال بذاتِ خود بڑی بڑی خونریز تباہیوں کا باعث بنا۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے جو اقتصادی انقلاب پیدا کیا وہ نہایت آہستگی، نرمی امن وامان اور تدریج کے ساتھ اپنا کام کرتا چلا گیا۔ اسلام کا طریقِ کار یہ ہے کہ بعض لوگوں سے کچھ لے کر بعض لوگوں کو کچھ دیا جائے۔ بالشویزم کا اصول یہ ہے کہ سب لوگوں سے سب کچھ چھین کر پھر سب لوگوں پر برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔ یہ طریقِ عمل قوانینِ قدرت اور خود انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ سب آدمی برابر نہیں۔ کوئی عقلمند ہے کوئی کم عقل اور کوئی

مطلق احمق۔ کوئی قوی ہے اور کوئی ضعیف۔ کوئی بیمار ہے اور کوئی تندرست۔ کوئی ہوشیار ہے اور کوئی چالاک، کوئی بالکل سادہ لوح، کوئی چست ہے اور کوئی سست وغیرہ وغیرہ اس لئے تمام افراد کی مالی حالت کو قطعی طور سے ہموار کر دینے کی کوشش قوانینِ فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے اس طریق کا میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں افراد کو کسبِ معیشت کے لئے کوئی وجہ محرّک باقی نہیں رہتی۔

روئے زمین ہموار نہیں۔ پھر بھی لوگ جہاں تہاں تھوڑے تھوڑے ناہموار رقبے کو ہموار کر کے کھیتیاں بنا لیتے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں، پہاڑوں کے پہلوؤں میں حتیٰ کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی زمیندار کھیتی باڑی کے لئے تھوڑی تھوڑی زمین ہموار کر لیتے ہیں اور ضرورت کے لئے کافی اناج پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ پُرامن اور قدرتی طریق کار ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام بھی اسی پر چلتا ہے۔ بالشویزم کی کوشش یہ ہے کہ ایک ایسا زلزلہ پیدا کیا جائے کہ وادیاں اور کہسار سب ایک سطح پر آجائیں۔ ایسی کوشش کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب روسی بھی اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں اور اپنے طریقِ عمل کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

سرمایہ داری باعثِ غفلت آمدم بسرِ مضمون۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ دولت بُری چیز نہیں بلکہ خیر ہے اور فضلِ خدا۔ دولت جمع کرنا بھی معیوب نہیں بلکہ ضروری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دولت کن حالات میں باعثِ خیر نہیں رہتی۔ اور لعنت بن جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔

الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر (۱۰۲-۲و۱) — غفلت میں ڈالے رکھا تم کو کثرت کی خواہش نے حتیٰ کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔

ان دو چھوٹی چھوٹی آیتوں میں نفسیاتِ انسانی کے عجیب و غریب نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ بعض انسانوں پر بسا اوقات ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ

۱۔ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی اپنی دولت کو زیادہ کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہوس کبھی پوری ہونے میں نہیں آتی۔ ایک کے پاس دس ہزار روپیہ ہے تو دوسرا

پندرہ ہزار جمع کر لینے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ جب اس کے پاس پندرہ ہزار ہو جاتے ہیں تو پھر بیس ہزار پورے کرنے میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے مقابلے میں وہ ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں تک جا پہنچتے ہیں۔ لیکن تکاثر کی خواہش کسی صورت میں پوری نہیں ہو سکتی۔ نہ دولتِ دنیا کی کوئی حد ہے اور نہ ہوسِ انسانی کی۔ یاد رہے کہ لفظِ تکاثر میں ایک دوسرے کے مقابلے کے معنی بھی موجود ہیں۔

۲۔ پھر بتدریج تکاثر کی یہ ہوس اکتناز کے ان دلدادوں کے دل و دماغ پر غفلت کا ایک پردہ ڈال دیتی ہے۔ روزانہ یہ پردہ دبیز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ غفلت ان لوگوں کو نہ صرف خدا سے غافل کر دیتی ہے بلکہ اکثر حالات میں وہ لوگ خود اپنے آپ سے بھی غافل ہو جاتے ہیں خدا سے غافل ہو کر یہ لوگ اپنے مال سے زکوٰۃ، عشر اور صدقات وغیرہ دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور خود اپنے آپ سے غافل ہو کر وہ اپنے پر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بھی حتی الوسع بند کر دیتے ہیں آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض دولت مند آدمی باوجود بے حساب دولت و ثروت کے خود بھی خستہ حالی میں وقت گزارتے ہیں اور اپنے متعلقین کو بھی خستہ حال رکھتے ہیں۔ صاحبِ اولاد لوگوں کی صورت میں تو بھلا اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ سب کچھ اپنی اولاد کے لئے جمع کر کے چھوڑ جانا چاہتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کے لئے آپ کیا کہیں گے جو صاحبِ اولاد بھی نہیں اور نہ ان کا کوئی ایسا قریبی عزیز ہے۔ جس کے لئے وہ جمع کر کے چھوڑ جانا چاہیں۔ پھر بھی وہ جمع ہی کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ بدحالی میں مبتلا رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی دولت ان کے مرنے کے بعد اُن کے دشمنوں کے کام آئیگی۔ اِن لوگوں کا یہ طرزِ عمل انہی غفلت کے پردوں کی وجہ سے ہے جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے ؎

مردِ ممسک بہرہ ور از جمع سیم و زر نشد　　رشتہ را ہرگز گلو از آبِ گوہر تر نشد

۳۔ ان لوگوں کے دل و دماغ پر غفلت کے یہ پردے مرتے دم تک پڑے رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی دولت ان کے کسی کام نہیں آتی۔ اس دولت سے نہ انھیں کوئی دنیاوی فائدہ

ہوتا ہے اور نہ دینی۔ یہی وہ منزل ہے جس سے آگے چل کر دولتِ دنیا خیر و فضل نہیں بلکہ لعنت بن جاتی ہے اور یہی وہ دولت مندی ہے جس کی قرآن مجید نے جا بجا مذمت کی ہے۔

نفسیاتِ انسانی کے طالب علم جانتے ہیں کہ دولت مند آدمیوں پر یہ حالت کس طرح طاری ہوتی ہے۔ انسان دولت کی اس لئے ہوس کرتا ہے کہ وہ اچھا کھائے، اچھا پہنے، اچھے مکان میں رہے اور اسی طرح اس کے اہل و عیال بھی خوش حالی میں وقت گزاریں گویا یہ خوش باشی مقصد ہے اور دولت اس مقصد کے حاصل کرنے کا وسیلہ۔ بعض آدمیوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ مقصد اُن کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وسیلہ مقصد بن جاتا ہے یعنی ان لوگوں کی زندگی کا منتہائے مقصود ہی دولت جمع کرنا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم کی ان دو آیتوں میں کیا گیا ہے۔ جب انسان پر یہ حالت طاری ہو جاتی ہے تو وہ دولت جمع کرنے میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام وسیلوں میں تمیز کرنا چھوڑ دیتا ہے اور زکوٰۃ و صدقات تو درکنار، وہ خود اپنی جان پر اور اپنے اہل و عیال پر بھی خرچ کرنے سے جی چراتا ہے۔

زجمع مال ندانم نشاطِ ممسک چیست   کہ ہمچو کیسہ زراز بہر دیگرے دارد

بظاہر یہ بڑی عجیب بات نظر آتی ہے کہ زر و مال کے موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی اپنے آپ کو اپنی اولاد کو، اپنے والدین کو اور اپنے دوسرے اقارب کو تکلیف میں رکھتا ہے اور خرچ نہیں کرتا۔ حقیقت میں یہ ایک سزا ہے جو خدا کی طرف سے ایسے آدمیوں کو دی جاتی ہے۔ یہ ایک قہرِ الٰہی ہے جو زکوٰۃ و صدقات میں بخل کرنے کا نتیجہ ہے۔ ایسے آدمی دولت کی محبت میں خدا کو بھول جاتے ہیں اور اس کی پاداش میں خدا ان پر ایک ایسی کیفیت طاری کر دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتے ہیں اور پھر روپیہ بنانے کی محض ایک ٹکسال بن کر رہ جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں قرآن مجید نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے۔

ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم۔ اولئک ھم الفاسقون (۵۹-۱۹)   اور ان لوگوں کی مانند مت بنو جو خدا کو بھول گئے پس بھلا دیا خدا نے ان کو اپنا آپ۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔

دینی اور دنیوی فوز و فلاح سے ہر قسم کی محرومیوں پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے انسان کی ہر نوع کی بد بختیاں ناکامیاں اور تباہ کاریاں فی الواقع اسی سبب سے ہوتی ہیں کہ وہ خدا کو بھول جاتا ہے آدمی اگر خدا کا ہو رہے تو کائنات کی ہر چیز اس کی ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ خدا سے منہ پھیر لے تو پھر ہر شے اس سے منہ پھیر لیتی ہے ؎

چوں ازو گشتی ہمہ چیز از تو گشت چوں ازو گشتی ہمہ چیز از تو گشت

قرآن کریم میں دولت مندوں کی اور دولت مندی کی جا بجا مذمت کی گئی ہے اور زراندوزی کی مضرتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس دولت کو قرآن نے برا کہا ہے وہ صرف وہی دولت ہے جو آدمی کو خدا سے غافل کر دیتی ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بُدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ذیل میں قرآن مجید کی ان آیات کو جمع کیا گیا ہے جن سے سرمایہ دارانہ زراندوزی کی گوناگوں مضرتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دولت کی محبت بسا اوقات انسان کو خدا کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔ چنانچہ دولت مند آدمی سمجھنے لگ جاتا ہے کہ یہ زر و مال جو میں نے جمع کیا ہے وہ میری عقل و دانش، علم و فن، محنت اور تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اسے کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ یہ سب کچھ خداوندِ کریم کا دیا ہوا ہے اور اسی کے فضل و کرم کا ثمرہ ہے۔

قال انما اوتیتہ علیٰ علمٍ اس نے کہا بات یہ ہے کہ مجھے دیا گیا ہے مال

عندی (۲۸ - ۷۸) بسبب اس علم کے جو میرے پاس ہے۔

یہ قارون کا قول ہے۔ جب اس کی قوم نے اسے کہا کہ اتنا خوش مت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت خوش ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تجھے چاہیے کہ اپنی دولت کے ذریعے اپنی آخرت کو سنوارے اور تجھے دنیا سے اپنا حصہ نہیں بھولنا چاہیے۔ جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تجھے چاہیے کہ خلقِ خدا پر احسان کرے اور زمین پر فساد برپا نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قارون نے جواب دیا کہ یہ مال و دولت جو میرے پاس جمع ہے میرے علم کا نتیجہ ہے (یعنی اس میں خدا کا احسان کیا ہے)

قارون پر ہی منحصر نہیں۔ ہر ایک سرمایہ دار یہی کہتا ہے اور اگر کہتا نہیں تو یہی سمجھتا ہے کہ میری دولت، میری محنت، چالاکی ہوشیاری اور لیاقت کا نتیجہ ہے سرمایہ داری کی یہ سب سے بڑی لعنت ہے جو دولتمند آدمی پر نازل ہوتی ہے۔

سرمایہ داری باعثِ تکبر | سرمایہ داری کی دوسری بڑی مضرت جو قرآن مجید میں بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ دولت مند آدمی کم دولت لوگوں کو رذیل سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ فی الواقعہ وہ غریب آدمی خدا کے نزدیک بہ نسبت ان دولت مندوں کے بہت زیادہ شریف۔ بہت زیادہ متقی اور بہت زیادہ نجیب ہوتے ہیں۔ بنی نوعِ انسان کی یہ سب سے بڑی بدبختی ہے کہ دولت مند لوگوں کی جماعت اپنے آپ کو شریف اور کم مایہ لوگوں کو رذیل سمجھتی ہے اور اپنی دولت کے زور سے اس ظالمانہ اور غلط تفریق کو ہمیشہ قائم رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ حالانکہ ذاتی شرافت ان لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے جنھیں دنیا رذیل سمجھتی رہتی ہے۔ یہی ناجائز تفریق دنیا کے سیاسی مذہبی، اخلاقی اور سماجی اصلاحات کے رستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔

قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون (۲۶-۱۱۱)		انھوں نے کہا کیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں حالانکہ تیرے پیرو رذیل لوگ ہیں۔

یہ قول ہے قوم نوحؑ کا۔ اور رذیل ان لوگوں کو کہا جو مومن اور مسلم تھے اور حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو کہا کہ تم خدا سے ڈرتے کیوں نہیں۔ میں تمہاری ہدایت کے لئے ایک باامانت پیغمبر بھیجا گیا ہوں اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ میں اس ہدایت کے بدلے تم سے کچھ مانگتا نہیں۔ میرا بدلہ تو میرا خدا دے گا۔ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ ان کم بخت لوگوں نے جنھیں اپنی دولت کا گھمنڈ تھا جواب دیا کہ ہم تیری اطاعت کس طرح کرسکتے ہیں تیرے پیرو تو رذیل لوگ ہیں۔

دوسرے پیغمبروں کو بھی عام طور سے لوگوں نے یہی جواب دیا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

انبیاء علیہم السلام کے ابتدائی پیرو اکثر غریب لوگ ہی ہوئے ہیں۔

هم الذين يقولون لا تنفقوا على	یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو
من عند رسول الله حتى ينفضوا	ان لوگوں پر جو رسولِ خدا کے نزدیک ہیں تاکہ
ولله خزائن السماوات والارض	وہ بھاگ جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں کے
ولكن المنافقين لا يفقهون ٥	اور زمین کے خزانے خدا کے ہاتھ میں ہیں لیکن
يقولون لئن رجعنا الى المدينة	یہ منافق نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس
ليخرجن الاعز منها الاذل۔	پہنچے تو عزت والے وہاں سے ذلت والوں کو
ولله العزة ولرسوله وللمومنين	نکال دیں گے حالانکہ عزت خدا کے لئے ہے
ولكن المنفقين لا يعلمون۔	اور رسول کیلئے اور مومنوں کے لئے لیکن یہ
(۶۳- ۷و۸)	منافق لوگ نہیں سمجھتے۔

کہتے ہیں کہ ایک سفر میں دو شخص لڑ پڑے۔ ایک ان میں سے مہاجر تھا اور دوسرا انصار میں سے۔ پھر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملا دیا۔ انصار میں سے منافق لوگ پس پشت کہنے لگے کہ اگر ہم ان مہاجرین کو اپنے شہر (مدینہ) میں جگہ نہ دیتے تو یہ ہم سے مقابلہ کیوں کرتے۔ ایک نے کہا تم ہی لوگ ان کی مالی امداد کرتے ہو تو یہ لوگ رسولؐ کے ساتھ جمع رہتے ہیں۔ ان کی خبرگیری چھوڑ دو تو خود بخود مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ ایک نے کہا اب کے سفر سے ہم مدینہ پہنچیں تو مدینہ کے عزت دار لوگ ان بے قدرے ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں۔ ایک صحابی نے یہ باتیں سنیں اور آنحضرتؐ کے پاس بیان کیں حضرت نے بلایا اور پوچھا تو قسمیں کھا گئے کہ اس نے ہماری دشمنی سے یہ کہا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں (موضح القرآن)

ان بدبخت مال داروں نے اپنے آپ کو عزت والا کہا اور نادار مہاجرین کو ذلیل بیان کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ عزت مال کے ساتھ نہیں۔ ایمان کے ساتھ ہے۔ عزت خدا کے لئے ہے، خدا کے رسول کے لئے ہے اور مومنین کے لئے۔ لیکن سرمایہ دار لوگ ہر زمانے میں اپنے آپ کو شریف اور غریب

لوگوں کو رذیل کہتے رہے ہیں افسوس اس بات کا ہے کہ اور لوگ بھی قریب قریب یہی سمجھتے ہیں ۔

در کیسہ زرے ہر کہ مہیا دارد چوں نور بچشم ہمہ کس جا دارد
زرگر بسر ے دوش چہ نیکو گفتا اشراف کسے کہ اشرفی ہا دارد

ہر زمانے میں یہی حال رہا ہے لیکن اس زمانے میں بالخصوص جب کہ دنیا کی حکومتیں سرمایہ داری کے اصولوں پر قائم ہیں۔ عزت بھی دولت کے ساتھ ہے، شرافت بھی دولت کے ساتھ اور نجابت بھی دولت کے ساتھ۔ نیک سے نیک آدمی بھی اگر دولت مند نہیں تو رذیل ہے اور ذلیل۔ افراد کے جماعتوں کے اور اقوام کے تمام تر فسادات اسی ملعون سرمایہ دارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں ۔

گویند بہ آدمی ہنرے باید یا اصلِ نجابت از پدرے باید
اینہا ہمہ در زمانِ سابق بودند بالفعل دریں زمانہ زرے باید

فرعون کے پاس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام خداوند کریم کا پیغام لیکر پہنچے تو اس ملعون نے بھی اپنی مالداری کے مقابلے میں موسیٰ کی بے زری کا ذکر کیا۔ اور اسی بنا پر ان کو ذلیل بتایا۔

ونادیٰ فرعونُ فی قومہٖ قال	اور فرعون نے اپنی قوم کو پکار کر کہا۔ اے
یٰقوم الیس لی ملک مصر وھذہ	میری قوم۔ کیا میرے پاس مصر کی سلطنت نہیں
الانھار تجری من تحتی افلا تبصرون	اور یہ نہریں جو چلتی ہیں میرے نیچے۔ کیا تم
ام انا خیر من ھذا الذی ھو	نہیں دیکھتے۔ یقیناً میں بہتر ہوں اس شخص سے
مھین۔ (۴۳ - ۵۱ و ۵۲)	یہ تو ذلیل ہے اور رذیل۔

دیکھئے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات، آیاتِ بینات اور دلائل و براہین کے جواب میں کیا کہا۔ کسی دلیل کی تردید نہیں کی۔ کسی دلیل کے مقابلے میں کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ کوئی معقول بات نہیں کہی۔ کہا تو یہ کہا کہ اے میری قوم اس شخص کی باتوں میں نہ آنا۔ اس شخص کے دلائل و براہین پر کان نہ دھرنا۔ اس کے معجزوں سے مرعوب نہ ہونا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں یقیناً اس سے بہتر ہوں اور اس سے زیادہ تمہاری اطاعت کا حقدار ہوں کیونکہ میرے پاس مصر کی سلطنت ہے میرے پاس زمینیں

ہیں۔ میرے پاس باغ ہیں، میرے پاس محل ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں اور انھیں سیراب کر رہی ہیں۔ اس شخص کے پاس کیا ہے نہ سلطنت، نہ مال و دولت، نہ زمینیں، نہ باغات نہ محلات ۔ یہ تو ایک رذیل آدمی ہے۔

فرعون کی بدبخت قوم کے لئے یہ دلیل دلیلِ قاطع تھی۔ چنانچہ جب تک اُن پر قہرِ الٰہی نازل نہ ہوا حقیقتِ حال کو نہ وہ ملعون سمجھا نہ اس کی بدنصیب قوم۔ آج بھی دنیا کے سرمایہ دار فرعون ہی کہہ رہے ہیں اور غریب قومیں ان کی آواز پر لبیک کہہ رہی ہیں۔

سرمایہ داری کی ایک اور مضرت

سرمایہ داری کی ایک اور بڑی خطرناک اور تباہ کن مضرت جو قرآن مجید سے ثابت ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ دولت مند آدمی انسانیت کی تکمیل اور بلندی مدارج کا معیار دولت ہی کو سمجھتے ہیں۔ حتی کہ دنیا میں جتنے انبیا علیہم السلام آتے رہے۔ دولت مند لوگوں نے ان کی نبوت کا انکار زیادہ تر اسی وجہ سے کیا۔ کہ وہ دولت مند نہیں۔ گویا سرمایہ دار لوگوں کے نزدیک پیغمبری بھی صرف سرمایہ دار لوگوں کا حق ہے۔ نادار لوگ یہ حق نہیں رکھتے کہ خدا انھیں نبی بنا کر دنیا میں بھیجے۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر خدا کسی غریب کو پیغمبر بناتا بھی تو یہ ضروری تھا کہ وحی کے ساتھ اس کے پاس سیم و زر کے خزانے بھی بھیجتا۔

وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی	اور انھوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دونوں
رجل من القریتین عظیم۔	بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اتارا
اھم یقسمون رحمت ربك۔ نحن	گیا کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے
قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ	ہیں۔ ہم نے بانٹی ہے ان کے درمیان ان کی
الدنیا ورفعنا بعضھم فوق	دولت دنیا کی زندگانی میں۔ اور ہم نے بعضوں کے
بعض درجت لیتخذ بعضھم	مقابلے میں بعضوں کے درجے بلند کئے تاکہ ان میں
بعضا سخریا ورحمت ربك خیر	سے بعض دوسروں کو محکوم بنائیں اور تیرے رب کی
مما یجمعون۔ (۳۲،۳۱-۴۳)	رحمت بہتر ہے اس مال سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو عرب کے کافروں نے بھی بعینہ وہی بات کہی جو فرعون نے کہی تھی۔ دلائلِ نبوت کا اور تو کوئی جواب بن نہ پڑا۔ کہا تو یہ کہا کہ اگر خدا فی الواقعہ یہ قرآن نازل کرتا تو ضرور مکہ یا طائف کے کسی سردار پر نازل کرتا۔ اس غریب آدمی پر قرآن کس طرح نازل ہو سکتا تھا۔

ان کفار کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اللہ کی رحمت یعنی دولت اور نبوت وغیرہ کا تقسیم کرنے والا اللہ خود ہے۔ یہ کافر سرمایہ دار رحمت کے تقسیم کرنے والے نہیں۔ خدا ہی دنیا کی دولت تقسیم کرتا ہے کسی کو زیادہ دیتا ہے کسی کو کم۔ کسی کا درجہ اونچا کیا کسی کا نیچا۔ کسی کو حاکم بنایا کسی کو محکوم۔ سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ تاکہ دنیا کے کام چلتے رہیں، نہ دولت کی تقسیم بندوں کے ہاتھ میں ہے نہ نبوت پر ان کا کچھ اختیار ہے۔ ان لوگوں کا اپنی دولت پر مغرور ہونا حماقت ہے، دولتِ دنیا تو ایک معمولی چیز ہے خدا کے خزانوں میں بڑی بڑی نعمتیں ہیں جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اگر ان کفار کو دولتِ دنیا دی تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبوت جو سب دولتوں سے بڑی دولت ہے۔ لیکن ہر زمانے میں سرمایہ دار لوگ یہی سمجھتے رہے کہ خدا کی تمام رحمتوں کے حقدار وہی ہیں اور کوئی نہیں۔

فلعلك تارکٌ بعض ما یوحیٰ	شاید تو چھوڑ دینے والا ہے بعض وہ چیز جو تیری
الیك وضائقٌ بہ صدرك ان	طرف وحی کی جاتی ہے اور تنگ ہو جاتا ہے
یقولوا لولا انزل علیہ کنزٌ او	اس سے تیرا سینہ اس لئے کہ کہیں یہ لوگ یہ نہ
جاء معہ ملك انما انت نذیر	کہیں کہ اس پر خزانہ کیوں نہ اتارا گیا یا اس کے
واللہ علی کل شئٍ وکیل۔	ساتھ فرشتہ کیوں نہ آیا۔ بات یہ ہے کہ تو صرف ڈرانے
(۱۱-۱۲)	والا ہے اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں پر کارساز ہے۔

اللہ تعالیٰ رسول کریمؐ کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ ان نامراد کافروں کے طعنوں سے پریشان ہو کر تبلیغ کو نہ چھوڑیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ سچے نبی ہوتے تو آپ پر زر و مال کے خزانے اترتے یا آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ آتا۔ آپ ان بیہودہ باتوں پر افسردہ خاطر نہ ہوں۔ آپ صرف خدا کا

پیغام لوگوں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس سے زیادہ آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں تبلیغ کرتے جائیے۔
باقی باتوں کو اللہ پر چھوڑئیے یہ کافر جائیں اور خدا۔

جو بات عرب کے کفار نے کہی وہی بات فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہی تھی۔

فلولا اُلقی علیہ اَسورۃ من ذھب — پس کیوں نہ ڈالے گئے اس پر سونے کے کنگن۔

اوجآء معہ الملٰئکۃ مقترنین (۴۳-۵۳) — یا اس کے ساتھ فرشتے پرا باندھ کر آتے۔

یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام سچے پیغمبر ہوتے تو ان پر سونے کے کنگنوں کی بارش ہوتی یا کم از کم ان کے فرشتوں کی صفیں ہوتیں۔

سرمایہ دار آدمی بے سرمایہ لوگوں کو فی الواقعہ کسی چیز کے قابل نہیں سمجھتے۔ اور یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت جیسے پہلے تھی ویسے ہی آج بھی کارفرما ہے ؎

نفسِ ماہم کم تر از فرعون نیست — لیک اورا عون ماراعون نیست

جس طرح دولت مند لوگ نبوت کو سرمایہ داروں کا حق سمجھتے تھے اسی طرح وہ امارت، ریاست اور سلطنت کو بھی صرف دولت مندوں کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔

وقال لھم نبیھم ان اللہ قد	اور ان کے نبی نے ان کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے
بعث لکم طالوت ملکا۔ قالوا انّیٰ	طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے
یکون لہ الملک علینا و نحن احق	کہا کہ اسے بادشاہی کس طرح مل سکتی ہے۔ ہم اس
بالملک منہ ولم یوت سعۃً	سے زیادہ بادشاہی کے حقدار ہیں۔ اس کو تو
من المال۔ قال ان اللہ اصطفہ	مال کی کشائش حاصل نہیں۔ نبی نے جواب دیا کہ
علیکم وزادہٗ بسطۃً فی العلم	اللہ نے اس کو تم پر بادشاہ منتخب کیا اور اس کو
والجسم۔ واللہ یؤتی ملکہٗ من	علم میں اور جسم میں کشادگی دی اور اللہ جسے
یشاء واللہ واسعٌ علیم۔	چاہتا ہے اپنا ملک دیدیتا ہے اور اللہ کشائش والا
(۲-۲۴۷)	اور جاننے والا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک بنی اسرائیل کا کام بنا رہا۔ پھر جب ان کی نیت بری ہوئی تو ان پر کافر بادشاہ جالوت مسلط ہوا۔ ان کے اطراف کے شہر چھین لئے اور لوٹا۔ اور بنی اسرائیل کے بہت آدمیوں کو قید کر لیا۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگ بیت المقدس میں جمع ہوئے اور حضرت سموئیل پیغمبر علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کی سرداری میں جالوت سے لڑیں۔

جب وحی الٰہی کے مطابق حضرت سموئیلؑ نے بنی اسرائیل کو بتایا کہ خداوند تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے تو بنی اسرائیل کے سرمایہ دار چلا اٹھے کہ طالوت ہمارا بادشاہ کس طرح بن سکتا ہے وہ تو کسب کر کے روٹی پیدا کرتا ہے اور دولت مند نہیں۔ ہم لوگ مالدار ہیں۔ بادشاہی ہمارا حق ہے۔ پیغمبر نے جواب دیا کہ بادشاہی خدا کی ہے جسے چاہے دے۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی ہے کہ طالوت تم سب سے علم اور جسم میں بڑھ کر ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ امیر کے انتخاب میں دولت مندی نہیں بلکہ علمی اور جسمانی فضیلت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمیشہ علم کے مقابلے میں دولت کی زیادہ قدر ہوتی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے ؎

کسبِ کمالِ اہلِ جہاں کسبِ زر بود — علامہ آں بود کہ زرش بیشتر بود

سرمایہ داروں کی غریب کشی

سرمایہ دارانہ ذہنیت کی ایک اور مضرت جو قرآن مجید سے ثابت ہوتی ہے اور جو ہر روز خود ہمارے تجربے میں بھی آتی ہے یہ ہے کہ سرمایہ دار لوگ فقرا اور مساکین کی امداد کرنا تو درکنار، ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں کہ غریب آدمیوں کے منہ کا لقمہ بھی چھین لیں اور اپنے خزانے کو معمور کریں۔ بڑے بڑے کارخانہ دار امیر جو بھوکے ننگے اور بیمار مزدوروں کے پسینے کی کمائی سے روزانہ ہزاروں روپے منافع حاصل کرتے ہیں۔ رات دن اسی خیال میں رہتے ہیں کہ ان مزدوروں کی روزانہ مزدوری اور کم ہو جائے۔ اور خود اُن کے خزانے اور زیادہ بھر جائیں۔ عام طور سے کارخانوں میں جو مرد عورت بوڑھے اور بچے کام کرتے ہیں۔ ان میں سے نوے فی صدی کی صحت خراب ہوتی ہے اور ان کو

دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ تاہم کارخانہ دار ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی حیلے سے ان مسکینوں کی اجرت کم ہو جائے۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہی ذہنیت کارفرما ہے۔

وھل اتٰک نبؤا الخصم اذ تسوروا	کیا آئی ہے آپ کے پاس خبر جھگڑنے والوں کی
المحراب ○ اذ دخلوا علیٰ داود	جب وہ دیوار پر چڑھ کر عبادت خانے میں اتر آئے
ففزع منھم قالوا لا تخف خصمٰن	جب وہ داؤدؑ کے پاس پہنچے تو وہ ان سے ڈرا۔
بغیٰ بعضنا علیٰ بعض فاحکم	انھوں نے کہا آپ ڈریں نہیں ہم دو جھگڑنے والے
بیننا بالحق ولا تشطط واھدنا	ہیں۔ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے آپ ہمارے
الیٰ سواء الصراط ○ ان ھٰذا	درمیان درست فیصلہ کردیں اور زیادتی نہ کریں
اخی۔ لہٗ تسع وتسعون نعجۃ	اور ہمیں سیدھا راستہ دکھائیں یہ میرا بھائی ہے
ولی نعجۃ واحدۃ۔ فقال اکفلنیھا	اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس
وعزنی فی الخطاب ○ قال لقد	صرف ایک دنبی ہے یہ مجھے کہتا ہے کہ اپنی مجھے دیدو
ظلمک بسؤال نعجتک الیٰ	اور باتوں میں مجھ پر غلبہ کیا ہے حضرت داؤدؑ نے
نعاجہ وان کثیرا من الخلطاء	کہا کہ اس نے اپنی دنبیوں میں شامل کرنے کے لئے
لیبغی بعضھم علیٰ بعض	تیری دنبی کو مانگ کر تجھ پر ظلم کیا ہے فی الواقعہ اکثر
الا الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت	شرکت والے ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں سوائے
وقلیل ما ھم۔	ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے
(۳۸ - ۲۱ تا ۲۴)	اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

ان آیات کے اسبابِ نزول سے یہاں بحث نہیں۔ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس قصے میں اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کا ذکر ہے جو اوپر بیان ہو چکی۔

فریقین میں سے ایک ننانوے دنبیوں کا مالک ہے دوسرے کے پاس صرف ایک دنبی ہے۔ ننانوے دنبیوں والا اس ایک دنبی والے سے اس کی ایک دنبی بھی لے لینا چاہتا ہے۔ دولتمند لوگ

غریبوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے ہیں یہ قصہ گویا اس کی ایک تمثیل ہے۔ سرمایہ دار لوگ ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں۔ ننانوے ہو گئے تو رات دن یہی فکر ہے کہ ایک اور مل جائے تو پورے سو ہو جائیں سو ہو گئے تو پھر ہزاروں کی فکر میں اور پھر لاکھوں کی فکر میں پڑ جاتے ہیں۔

ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ

ہمچناں در بندِ اقلیمِ دگر

ان لوگوں کی حرص کا جہنم ہر وقت ہل من مزید کے نعرے لگاتا رہتا ہے۔ غریب سے غریب آدمی کے پاس بھی جو کچھ ہو اُسے چھین لینا چاہتے ہیں۔ عام سرمایہ دار یہی کچھ کرتے ہیں جو ایسا نہیں کرتے وہ خدا کے بندے بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ صرف خال خال۔

(باقی آئندہ)

چند نایاب مصری کتابیں

ان دنوں عام مصری کتابیں بھی حد درجہ گراں ہو گئی ہیں اور مخصوص اور کم یاب کتابیں تو کسی قیمت پر بھی نہیں ملتیں۔ مکتبۂ برہان میں اتفاقی طور پر چند گراں قدر نایاب کتابیں آ گئی ہیں۔ قیمت کا معاملہ خط و کتابت سے طے کیجیے۔

کتاب الام امام شافعیؒ۔ مکمل، جلدیں تمام جلدیں عمدہ حالت میں ہیں۔

(طبع میری)

زرقانی شرح موطا امام مالکؒ کامل۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ برہان دہلی، قرول باغ

بیت المقدس پر اجمالی نظر

از جناب منشی عبدالقدیر صاحب دہلی

ارضِ فلسطین کی بزرگی اور تقدس مسلمانوں کے نزدیک زیادہ تر بیت المقدس کی وجہ سے ہے۔ یوں بھی صدر مقام اور بڑا شہر ہے۔ اس میں اس کثرت سے زیارت گاہیں ہیں کہ کوئی زائر یہودی عیسائی یا مسلمان بغیر گائڈ (رہبر) کے ان کی زیارت سے مشرف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ صرف گائڈوں ہی کو معلوم ہے کہ کس زیارت گاہ کی چابیاں کہاں سے اور کس کے پاس سے ملیں گی۔ زیارت گاہیں عام طور پر حفاظت کی غرض سے نہ صرف مقفل رکھی جاتی ہیں بلکہ ان پر پہرہ بھی رہتا ہے۔

برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا میں بیت المقدس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ۳۳ صدیوں کا پرانا شہر ہے۔ اس مقام نے قدرت اور انسان کے ہاتھ سے تکلیفیں ہی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔

بیت المقدس کا محلِ وقوع:۔ بیت المقدس ایک پہاڑ موریہ یا صیہون پر واقع ہے جو بحیرہ روم کی سطح سے ۲۶۰۰ فٹ اور جھیل مردار کی سطح آب سے ۳۸۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ بلحاظ فاصلوں کے دریائے اردن سے ۱۸ میل الخلیل سے ۲۲ میل۔ نابلس سے ۴۰ میل۔ اریحا سے ۲۵ میل۔ بحیرۂ روم سے ۳۳ میل۔ جھیل مردار سے ۱۵ میل یافا سے ۴۰ میل۔ ناصرہ سے ۹۰ میل لد سے ۳۰ میل۔ تل ابیب سے ۴۰ میل۔ غزہ سے ۶۰ میل۔ جنین سے ۷۰ میل۔ حیفا سے ۱۱۰ میل۔ عکا سے ۱۱۵ میل۔ طبرہ سے ۸۵ میل۔ صفد سے ۱۳۰ میل۔ بیت اللحم سے ۶ میل بیر السبع سے ۵۵ میل ہے۔

بیرونِ فلسطین کے مقامات سے:۔ راس الناقورہ سے ۱۳۰ میل۔ بیروت سے ۲۰۰ میل۔ دمشق سے ۱۷۰ میل عمان سے ۷۰ میل۔ کوہِ طور سے ۲۰۰ میل مصر سے ۲۶۰ میل۔ مدینہ منورہ سے ۶۰۰ میل۔ الصور (لبنان) سے ۱۰۰ میل۔ بغداد سے ۴۵۰ میل کے فاصلہ پر یورپ ایشیا اور افریقہ کے درمیان وسطی حیثیت رکھتا ہے۔

واقعات کا مختصر خاکہ یوں کھینچا ہے کہ یہ مقام زلزلہ سے تباہ ہو کر کھنڈرات کا پہاڑ بن چکا ہے۔ انسان اسے کئی بار پیوند زمین کر چکے ہیں۔ بیس مرتبہ محصور ہو چکا ہے۔ اٹھارہ دفعہ دوبارہ تعمیر ہو چکا ہے اور دو زمانے ہڈایان اور بخت نصر کے عہد میں اس کی مکمل بربادی کے ہو چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تاریخ کی تدوین باقاعدہ نہ تھی۔ اس پر چھ دور مذاہب کی تبدیلی کے گزرے ہیں یعنی یہاں کے باشندے اپنا آبائی دین چھوڑنے اور نیا مذہب اختیار کرنے پر مجبور ہوتے رہے۔ اس پر ایسا زمانہ بھی گزرا کہ اس کی وادیاں پر کردی گئیں اور ایسا بھی کہ اس کو زمین کے برابر ہموار کر دیا گیا۔ اس کے گلی کوچے اور عمارتیں تباہ کی گئیں اور اس کے باشندے قتل کر دیئے گئے یا جلاوطن کر دیئے گئے لیکن یروشلم اپنی ہی جگہ پر ہے اس کی روح غیر فانی ہے۔

دنیا میں اس وقت کوئی اور ایسا مقام نہیں ہے جس نے اس کثرت سے انقلابات دیکھے ہوں موجودہ زمانہ بھی انقلابی دور ہے اور کچھ عجب نہیں کہ اس مرتبہ اس میں ایسا انقلاب رونما ہو جو بین الاقوامی بن جائے اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں عبرتناک انقلاب کی لپیٹ میں آجائیں۔ یہودیوں کا وطن قرار دیا جانا ایک نہایت ہی ناممکن العمل اعلان ہے اور امنِ عالم کو تہ و بالا کرنیوالا ہے۔

اس کا ابتدائی قدیم نام جیبس (Jebus) ہے۔ انگریز اسے یروشلم۔ یوروشلم (Jerusalem) کہتے ہیں۔ جس کا تلفظ جِرُوزلَم ہے جو اصل میں عبرانی ہے اور شلیم اور ایلیا بھی کہتے ہیں۔ تقدیس کے باعث اسے صلح یا امن کا گھر (City of Peace.) کہتے ہیں۔ اور شلیم کے معنی سلامیؑ کا گھر (City of Salim.) ہے۔ عرب بَیْتُ الْمُقَدَّس یعنی متبرک مکان یا بَیْتُ الْمَقْدِس یعنی پاک ترین مقام کہتے ہیں۔ ضلع کا نام اَلْقُدس ہے۔ انسانی یاد میں دنیا کا کوئی مقام بیت المقدس سے قدیم اب تک دریافت نہیں ہوا۔

بیت المقدس تیرہ سو سال مسلمانوں کے قبضے میں رہا ہے اس عرصہ میں اس پر تھوڑے تھوڑے عرصہ کیلئے بارہا عیسائیوں کا قبضہ بھی رہ چکا ہے جیسا کہ اس کی مختصر روئداد انقلاب سے معلوم ہوگی۔ عیسائیوں نے اس کو واپس لینے کے لئے چونکہ صلیبی جنگیں لڑی ہیں اس لئے عیسائی فلسطین کو صلیبوں کی

سرزمین (Crusaders land) کہتے ہیں۔ بعض مورخین کا اندازہ ہے کہ صلیبی جنگوں میں ساٹھ لاکھ عیسائی قتل ہو چکے ہیں۔ جنگِ عظیم میں جو مارے گئے ان کی تعداد اس میں شامل نہیں۔ صلیبیوں کے مقابلے میں جو مسلمان تھے۔ اہلِ مغرب انھیں (Sarecen.) کہتے ہیں مراد اس سے عرب ہیں۔

یہودیوں اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا کا وسط بیت المقدس ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بیت المقدس کے نام سے کہیں نہیں آیا۔ البتہ احادیث اور دوسری اسلامی روایتوں میں البیت المقدس کے نام سے ذکر آیا ہے۔ انجیل اور توریت میں بھی اس کا ذکر بہت جگہ ہے اس لحاظ سے یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے فضیلت والا اور عظمت و بزرگی والا مقام ہے۔ یہ دنیا کا سب سے قدیم شہر ہے اور اس میں اس کثرت سے نبی اور پیغمبر ہوئے کہ اسے نبیوں یا رسولوں کا گھر بھی کہا جا سکتا ہے چنانچہ فلسطین کا ہر فلاح اپنے تئیں کسی نہ کسی پیغمبر کی نسل سے بتاتا ہے۔

دو ہزار سال پہلے اس پر رومن حکمراں تھے۔ ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء تک لاطینیوں کے قبضے میں رہا پھر مسلمانوں کے قبضے میں ۱۹۱۷ء تک رہا۔ اب برطانیہ قابض ہے۔ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت یحییٰؑ اور حضرت ذکریاؑ کے مقبرے ہیں۔ جنگِ عظیم میں جو مارے گئے ان کا قبرستان اور یادگار بھی ہے۔ مسجد عمر و قبۃ الصخرہ یہیں ہے اس کے جنوب غرب میں وادی الربال بہتی ہے جو کدرون ندی سے ملتی ہے۔ زین (Zion) اور موریا دو پہاڑیاں جنوبی حصے میں ہیں اُن پر سے وادی حمون Hammon دکھائی دیتی ہے۔ ان پر رومن کیتھولک اور یونانی گرجوں کے بشپ رہتے ہیں۔ کدرون ندی وادی النار میں سے گزرتی ہے اور جھیل مردار میں گرتی ہے۔ یہ اکثر خشک بھی ہو جاتی ہے۔ یافا گیٹ سے چونکہ جنرل ایلنبائی داخل ہوا تھا اس لئے اسے بہت اہمیت دی گئی ہے۔ شہر میں پانی برکت العروب کی ندی سے بذریعہ نل آتا ہے یہ شہر سے چودہ میل ہے اس کا ذخیرۂ آب سلیمانی تالاب Soloman Pool میں ہے۔ دوسرا ذخیرہ آب لفطہ پر ہے۔ جبلِ زیتون کے پاس سکوپس Scopus. چوٹی پر یونیورسٹی قائم کی ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد مشہور یہودی لیڈر ڈاکٹر حییم ویزمن پریسیڈنٹ یہود کمیٹی نے ۱۹۱۸ء میں رکھا تھا اور لارڈ بالفور نے ۱۹۲۵ء میں اس کا افتتاح کیا تھا۔ اسی یونیورسٹی کے

ماتحت تل ابیب میں زراعتی ریسرچ ہوتی ہے اس میں گیارہ ایکڑ زمین ہے اور متعلقہ کتب خانہ میں ۱۳۶۰۰۰ کتب موجود ہیں۔ برطانیہ نے جنگ عظیم کے بعد جدید دفتری عمارتیں اور واٹر ورکس قائم کیا ہے ریلوے سٹیشن ہے۔ پہلے قافلوں کے ذریعہ اور اب ریل سے لاکھوں عیسائی زائر سالانہ آتے جاتے ہیں۔ یہودیوں کے زمانہ میں دارالسلطنت رہ چکا ہے۔ بلحاظ آبادی سب سے بڑا شہر تھا مگر اب دوسرے درجہ پہ ہے۔ اول نمبر تل ابیب ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کی آبادی ۶۲۷۰۰ تھی جس میں ۳۳۹۷۱ یہودی تھے ۱۹۳۱ء میں ۹۰۵۰۰ ہو گئی اب ایک لاکھ سے زائد ہے۔ یہاں مئی سے اکتوبر تک موسم خشک رہتا ہے اس کے بعد بارش ہوتی ہے۔ ہر تین سال میں دو سال برف بھی پڑتی ہے۔ بارش کی سالانہ اوسط ۲۶ - انچ ہے۔ ہر موسم خوشگوار ہے۔ شہر کے گرداگرد پختہ فصیل ہے آبادی فصیل کے باہر چاروں جانب روز افزوں ترقی پر ہے۔

بیت المقدس کی عظمت

(۱) حضرت ابراہیمؑ اسی مقام پر اپنے بیٹے کو قربانی کے لئے لے گئے تھے۔

(۲) حضرت یعقوبؑ نے اسی مقام پر خواب میں باتیں کیں اسی لئے اس وقت اس کا نام "بیت ایل" یعنی "خدا کا گھر" رکھا گیا۔

(۳) حضرت داؤدؑ نے اس کی بنیاد رکھی۔

(۴) حضرت سلیمانؑ نے خدا کے حکم اور الہام کے مطابق یہاں مسجد ہیکل یا مسجد الاقصیٰ تعمیر کی۔

(۵) یہی مسجد اور یہی شہر ہزارہا انبیاء علیہم السلام کا قبلہ مصلی اور زیارت گاہ رہا ہے۔

(۶) حضرت عیسیٰؑ اور ہزارہا پیغمبروں کے مزارات اسی شہر اور اس کے مضافات و نواح میں موجود ہیں۔

یہاں مسیحؑ کی قبر کے نام سے ایک گرجا ہے اس میں ایک بڑا پتھر ہے۔ جس پر بقول عیسائیوں کے مسیحؑ کی نعش کو غسل دیا گیا تھا۔ ایک صندوق سنگ مرمر کا ہے جس میں مسیحؑ کی لاش کا رکھا جانا بتایا جاتا ہے۔ اس گرجے میں یونانی۔ لاطینی اور ارمنی سب شریک ہیں اور ہر سال وقت مقررہ پر مسیحؑ کے مصلوب ہونے اور دوبارہ زندہ ہونے کا سوانگ بناتے نعش نکالتے اور بڑا ماتم کرتے ہیں۔ ہم مسلمان وہاں کے کل مقدس مقامات کو مانتے ہیں بجز اس گرجا کے کیونکہ ہمیں

حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے سے انکار ہے۔ دراصل یہ مقبرہ یہود اسکریوطی کا ہے جو ان کی جگہ دفن ہوا اور حضرت عیسیٰؑ کے شبہ میں سولی پر چڑھایا گیا۔

کوہِ زیتون (Mt. Olives) بیت المقدس کے بالکل قریب ہے یہاں حضرت عیسیٰؑ عبادت کیا کرتے تھے اور یہیں سے یہودی انھیں گرفتار کرکے پلاطوس کے پاس لے گئے تھے اس کے اور شہر کے درمیان ایک نالہ ہے جسے کدرون کہتے ہیں عیسائی اسے بھی متبرک خیال کرتے ہیں

(۷) یہاں الصخرہ وقبۃ الصخرہ ہے۔ مسجد عمر ہے۔ حرم شریف ہے۔

(۸) یہودیوں کی سب سے متبرک جگہ دیوارِ گریہ ہے جس پر ہاتھ رکھکر اور کھڑے ہوکر روتے ہیں دراصل یہ دیوار حرم شریف کی دیوار ہے۔

(۹) صخرہ کے علاوہ ایک اور بڑا پتھر ہے جس کی نسبت کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے تکیہ لگاکر بیٹھے تھے یہ پتھر بیچ میں سے ٹوٹا ہوا ہے۔

(۱۰) ایک صندوق ہے جس میں ایک سوراخ ہاتھ جانے کے قابل ہے اس کے اندر قدمِ رسولؐ مبارک بتاتے ہیں۔

(۱۱) ایک سبز پتھر ہے جو ۱۴ اسکوائر مربع ہے جس میں ۱۸ سوراخ کیل کے لائق بنے ہوئے ہیں اس کی یہ خاصیت بتاتے ہیں کہ زمانہ گذر جانے کے بعد اس میں سے ایک کیل غائب ہو جاتی ہے چنانچہ اس میں سے ۱۴½ کیل غائب ہیں اور ۳½ باقی ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے غائب ہوجانے کے بعد دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۱۲) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہیں سے معراج ہوئی تھی اسی لئے اسے آپ کی آسمانی سیرگاہ کہا جاتا ہے۔

(۱۳) ۱۷ ماہ تک بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ رہ چکا ہے اسی لئے اسے قبلۂ اولیٰ کہتے ہیں۔

فتح بیت المقدس جنگِ یرموک کے بعد مسلمانوں کا کل لشکر فلسطین کی سرزمین کے فتح کرنے کے واسطے روانہ ہوا اس لشکر کے سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص اور افواجِ شام کے سپہ سالار ابوعبیدہ تھے۔

عمرو بن العاص رضؓ نے ۱۶ھ میں بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا تو عیسائی قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے۔ ابو عبیدہؓ شام کے بہت سے شہر تسخیر کرنے کے بعد فارغ ہو چکے تھے وہ بھی اپنے لشکر سمیت آگئے اور محاصرہ میں شریک ہو گئے انھوں نے یروشلم کے بڑے بڑے سرداروں کو یہ خط لکھے :۔

صحت اور خوشی ان لوگوں کو ہے جو راہِ راست پر چلتے اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ تم اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔ اور جب تم ایمان لاؤ گے تو ہمیں حرام ہے کہ تمہیں ماریں یا تمہارے بال بچوں کو ہاتھ لگائیں اور اگر تم ایمان نہیں لاتے تو ہم کو خراج دو اور ہماری حمایت میں رہنا اختیار کرو اور جو یہ بھی نہ مانو گے تو میں تمہارے مقابلہ میں ایسے لوگ لاؤں گا جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے کو عزیز رکھتے ہیں اور ہم بغیر فتح کے یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔

بہت صلاح و مشورہ کے بعد بالآخر پادری سفرونیس Sophronius نے صلح منظور کی اور کہا کہ یہ پاک مقام ہے اس کو میں خلیفۃ المسلمین کے سوائے اور کسی کے سپرد نہیں کردنگا اور عارضی صلح کے لئے معززین شہر کو جھنڈے کے ہمراہ مسلمانوں کے پاس بھیجا اور صلح چاہی۔

ایک اور روایت ہے کہ جب تک حضرت عمرؓ خود بنفسِ نفیس چار ہزار سواروں کے ہمراہ بیت المقدس تشریف نہ لے آئے، فتح نہ ہوئی۔ دوسری روایت اس طرح ہے کہ عیسائیوں نے یہ شرط پیش کی کہ حضرت عمرؓ یہاں خود تشریف لائیں اور صلحنامہ ان ہی کے ہاتھ سے لکھا جائے۔ چنانچہ حضرت عبیدہؓ نے خط لکھا کہ بیت المقدس کی فتح آپ کی تشریف آوری پر منحصر ہے اس خط کے ملنے پر حضرت عمرؓ بمشورہ حضرت علیؓ خلافت کے کام کو حضرت عثمانؓ کے سپرد کر کے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور دمشق تشریف لے گئے یہاں بیت المقدس کے رؤسار کا ایک گروہ معاہدہ کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ معاہدۂ صلح لکھا گیا جس پر عیسائی عمائدین اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کے دستخط ہو گئے تو آپ بیت المقدس کو تشریف لے گئے۔

اسی سلسلہ میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ صلح نامہ کی تکمیل بیت المقدس میں ہوئی اور وہ

اس طرح کہ سفرونیس حاکم شہر نے اپنے سفیر کی امان چاہی۔ جب آپ نے امان دیدی تو سفیر بلا روک ٹوک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ہم سے صلح کر لی جائے اور خراج لیکر باجگذار بنا لیا جائے۔

کوئی بھی روایت صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ صلح ہوئی اور حضرت عمرؓ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ اس وقت حدودِ شہر بیت المقدس میں بارہ ہزار یونانی اور پچاس ہزار اصلی باشندے آباد تھے۔ حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ کل یونانی تین دن کے اندر شہر سے نکل جائیں اور شہر کے اصلی باشندے خراج ادا کریں۔ چنانچہ ۵ دینار امراء پر، چار دینار متوسط الحال پر اور تین دینار ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر فی کس سالانہ کے حساب سے یہ ٹیکس لگایا گیا ہے۔ بہت بوڑھے اور نابالغ اور عورتیں اس ٹیکس سے مستثنیٰ رکھے گئے۔

جب حضرت عمرؓ اس مقدس شہر میں داخل ہوئے تو اس وقت ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس متبرک پہاڑ کا محلِ وقوع معلوم کریں جسے الصخرہ کہا جاتا ہے اور جس پر مسجد الاقصیٰ واقع تھی جہاں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار ہو کر معراج میں آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے، آپ نے وہاں کے راہب سے فرمایا کہ وہ ان کی رہبری کرے اور وہ مقدس جگہ دکھائے۔ راہب سب سے پہلے آپ کو کلیسائے نشور (Church of The Resurrection) میں لے گیا اور کہا کہ یہی حضرت داؤدؑ کی مسجد ہے آپ نے فرمایا کہ تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ خدا کے رسول حضرت محمدؐ نے مجھے جو جگہ بتائی یہ اس کے مشابہ نہیں ہے پھر وہ کلیسائے صیہون (Church of Zion) میں لے گیا اور کہا کہ یہ حضرت داؤدؑ کی مسجد ہے آپ نے پھر فرمایا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اسی طرح راہب آپ کو ہر گرجا میں لے گیا آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ آخر کار راہب آپ کو اس دروازہ سے لے گیا جس کا نام اب بَابُ الْمُحَمَّدْ ہے۔ سیڑھیوں پر سے کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے بعد وہ ایک تنگ راستے میں داخل ہوئے جہاں حضرت عمرؓ گھٹنوں کے بل چل کر وسطی بد رو کے پاس آئے یہاں پر کھڑے ہو کر آپ نے الصخرہ کی جانب نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ قسم ہے اس خدائے بزرگ و برتر کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہی وہ جگہ ہے جو اللہ کے رسولؐ نے مجھے بتائی تھی۔ اس کے بعد

آپ نے اس پر ایک مسجد تعمیر کیے جانے کا حکم دیا۔ عبدالملک بن مروان نے بیت المقدس کی مسجد حرام کی جسے اب مسجدِ عمر کہا جاتا ہے ہجری ۶۹ میں تعمیر شروع کی۔ یہ مسجد تین سال میں تیار ہوئی اور اس پر ملکِ مصر کی سات سالہ مالگذاری کی رقم صرف ہوئی۔

حضرت عمرؓ نے کئی دن بیت المقدس میں قیام کیا۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت بلالؓ سے اذان دینے کے لئے فرمایا آپ نے فرمایا کہ میں عزم کر چکا ہوں کہ رسول اللہ کے بعد کسی کے لئے اذان نہ دوں گا لیکن آج اور صرف آج آپ کا ارشاد بجا لاؤں گا۔ اذان دینی شروع کی تو تمام صحابہ کو رسول اللہ کا عہد مبارک یاد آ گیا اور سب پر رقت طاری ہو گئی۔ ابو عبیدہؓ و معاذ بن جبلؓ روتے روتے بیتاب ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کی ہچکی بندھ گئی اور دیر تک سب پر ایک خاص اثر رہا۔

ایک دن مسجد اقصیٰ میں گئے اور کعب احبار کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ نماز کہاں پڑھی جائے۔ مسجدِ اقصیٰ میں ایک پتھر ہے جو انبیاء سابقین کی یادگار ہے اس کو صخرہ کہتے ہیں یہودی اس کی اسی طرح تعظیم کرتے ہیں جس طرح مسلمان حجر اسود کی۔ حضرت عمرؓ نے قبلہ کی نسبت پوچھا تو کعب نے کہا کہ صخرہ کی طرف۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں یہودیت کا اثر باقی ہے اور اسی کا اثر تھا کہ تم نے صخرہ کے قریب جوتی اتار دی۔

بیت المقدس کا معاہدہ | ممتاز باشندگانِ شہر اور مسلمانوں کے مابین فتح بیت المقدس کے بعد جو عہد نامہ لکھا گیا اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

> "یہ ایک تحریر (اقرار) ہے منجانب عیسائی باشندگانِ بیت المقدس جو مرتب کی گئی
>
> حضرت عمر بن الخطابؓ خلیفۃ المسلمین کے نام
>
> جب آپ ہم پر غالب آئے ہم نے آپ کی اطاعت منظور کی اور ہم نے اپنے تئیں اپنے بچوں، اپنے ہم مذہبوں اور اپنے مقبوضات کو آپ کے حوالہ کر دیا اور عہد کیا کہ چھوٹے بڑے گرجوں۔ خانقاہوں اور راہبوں کے حجروں میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی نہ ان میں سکونت کی جائیگی نہ ڈھائے جائیں گے ان میں کوئی ایسا شخص جو مسلمانوں کا مخالف ہو

رہ نہ سکیگا ان میں ہر وقت مسلمانوں کو داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا مسافروں اور سیاحوں کے لئے ان کے دروازے کھلے رکھیں گے اگر کوئی مسافر مسلمان ان میں رہنا چاہے گا تو اسے تین دن بطور مہمان کے کھانا اور جگہ دیں گے۔ اسے اپنے گرجاؤں میں کسی راز کے معلوم کرنے سے نہیں روکیں گے اور اس سے کوئی بات پوشیدہ نہ رکھیں گے اسے اپنی کسی عبادت میں شریک نہیں کریں گے۔ کسی کو عیسائی مذہب کی دعوت نہیں دیں گے۔ نہ کسی طرح کا جبر کریں گے اپنے کسی ہم مذہب کو اسلام قبول کرنے سے نہیں روکیں گے۔ مسلمانوں کی ہر جگہ تعظیم کریں گے ان کو اگر اپنی مجلسوں میں بٹھائیں گے تو بلند مقام پر بٹھائیں گے اور خاطر مدارات کرینگے۔ لباس۔ پٹکے۔ صافے۔ زیر پایا سر کی مانگ میں مسلمانوں کی مشابہت نہیں کریں گے ان کی زبان میں کچھ نہیں لکھیں گے نہ اپنے آپ کو ان کے خطابوں سے پکاریں گے۔ سواری میں گھوڑوں پر زین نہیں کسیں گے اپنی تلواروں کو پیٹیوں کے ساتھ نہیں لٹکائیں گے۔ تیر کمان، تلوار یا لٹھ لیکر نہیں نکلیں گے۔ اپنی انگوٹھی پر عربی رسم الخط میں کچھ نہیں کھدوائیں گے۔ شراب نہیں بیچیں گے اپنی پیشانیاں منڈوائیں گے اور ان پر کپڑا باندھیں گے۔ کمر میں زیادہ چوڑا پٹکا استعمال نہیں کریں گے۔ اپنی عبادت گاہوں کے باہر صلیب نہیں لگائیں گے۔ شارع عام میں یا مسلمانوں کے راستوں میں یا ان کی کاروباری جگہوں میں اپنی صلیبوں کو نہیں دکھائیں گے۔ گھنٹے زور سے نہیں بجائیں گے اپنے مردوں پر آواز بلند نہیں کریں گے مسلمانوں کی گذرگاہوں یا شارع عام میں چراغاں یا ہیچ قسم آرائشگی وغیرہ نہیں کریں گے اپنی میتوں کو مسلمانوں کے قریب نہیں لے جائیں گے۔ غلام جو مسلمان ہو جائے گا اسے پھر اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔ نہ اس کے گھر کی طرف نگاہ کریں گے اور ایلیا (بیت المقدس) میں ہمارے ساتھی یہودی رہنے نہیں پائیں گے۔ ؎

حضرت عمرؓ نے اس معاہدہ کی تصدیق کرتے وقت حسب ذیل اضافہ فرمایا:۔

؎ اس پر گفتگو کی بڑی گنجائش ہے (برہان)

ہم مسلمانوں میں سے کسی کو اذیت نہیں دیں گے یہ ہم آپ سے اپنی طرف سے اور اپنے ہم مذہبوں کی جانب سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ ہم مذکورہ بالا شرائط کو تسلیم کرتے ہیں اور ہم ان میں سے کسی کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اگر کریں تو ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی جائے اور ہم اختیار دیتے ہیں کہ جو سخت سے سخت سزا دیں ہم اس کے سزاوار ہوں گے۔

اس تحریر پر خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور معاویہ بن ابوسفیان نے بطور گواہ دستخط کئے یہ عہد نامہ ۱۵ھ میں لکھا گیا۔

خلاصہ تاریخ بیت المقدس | دنیا میں بیت المقدس ہی وہ مقام ہے جس نے قدرت اور انسان کے ہاتھوں ہمیشہ دکھ اٹھائے ہیں نہایت ہی مختصر خاکہ یوں کھینچا جا سکتا ہے کہ زلزلے سے تباہ ہو کر یہ مقام کھنڈرات کا پہاڑ بن چکا ہے اور انسانوں نے بھی اسے بار بار پیوند زمین کیا ہے۔ بیس مرتبہ محصور ہو چکا ہے۔ چھ دور مذاہب کی تبدیلیوں کے گذر چکے ہیں۔ اٹھارہ بار دوبارہ آباد کیا جا چکا ہے دو بار مکمل بربادی ہو چکی ہے۔ ایسا زمانہ بھی گذرا ہے جبکہ اس کی وادیاں پُر کر دی گئیں اور ایسا وقت بھی اس مقدس شہر نے دیکھا ہے کہ اس کی عمارتوں کو ڈھا دیا گیا اس کے باشندوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور زمین پر ہل چلا کر ہموار کر دیا گیا۔ باوجود اس کے یروشلم اپنی جگہ پر موجود ہے اور اس کی تقدیس میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی روح قیامت تک غیر فانی ہے۔

دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں جس نے ۲۳ صدی سے اس کثرت کے ساتھ آلام و انقلاب دیکھے اور برداشت کئے ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے اسرائیلیوں اور یہودیوں کے زمانہ میں جو انقلابات رونما ہوئے وہ کچھ کم لرزہ خیز نہیں۔ ان کے تذکرہ سے بخوفِ طوالت ہم احتراز کرتے ہیں اور صرف مجملاً سنہ عیسوی سے اب تک کے اختصار کے ساتھ حالات پیش کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

۳۳ء بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا گیا وہ دوبارہ زندہ ہوئے اور آسمانوں پر اٹھا لئے گئے۔

۴۳ء۔ عیسائیت قبول کرنے کے بعد پولوس (St, Paul) اول مرتبہ اس شہر میں داخل ہوا۔

۶۹ء۔ واسپین کے بیٹے شاہنشاہ طیطوس نے جس نے یہودیوں کے خلاف جنگوں میں کامیابیاں حاصل کیں فتح کیا۔ معبد کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ ہیکل کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا اور اس مقام پر ہل چلوا دیئے۔ اس کی بنیادوں سے مدت تک آگ کے شعلے نکلتے رہے یہ یہود کی بدسلوکی کی وجہ سے قہر الٰہی کا ظہور تھا۔

۱۳۵ء معبد دوبارہ بن کر تیار ہوا۔ پھر گرایا گیا اور اس پر ہل چلوائے گئے۔

۱۳۶ء شاہنشاہ ہڈرین نے پہلے تو اس شہر کا نام ایلیا رکھا مگر بعد میں کیپی تولینا قرار دیا۔

۳۳۶ء۔ عیسائی حکومت قائم ہوئی مشہد (Martyrion) اور کلیسائے نشور (Church of Resurrection) تعمیر کرائے۔

۶۱۴ء بروایت دیگر خسرو ثانی شاہ ایران نے طویل محاصرہ کے بعد فتح کیا۔ اس جنگ میں انیس ہزار عیسائی قتل ہوئے۔

۶۲۸ء۔ شاہ ہرقل (Heraclius) نے شاہ خسرو کو شکست دے کر قبضہ کیا اور یروشلم میں اصلی صلیب لے گیا۔

۶۳۷ء۔ بطریق سوفروں (Sophronius) نے ستر دن (بروایت دیگر چار ماہ) کے محاصرہ کے بعد اس مقدس شہر کو مسلمانوں کے حوالہ کیا۔ اس فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کو گرجاؤں میں آزادی سے عبادت کرنے کی اجازت دی جو وہاں جنگ عظیم یعنی برطانیہ کے قبضہ سے پیشتر تک جاری رہی۔ اس موقع پر مسلمانوں اور عیسائیوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے طے پایا تھا کہ بیت المقدس میں آئندہ کوئی نیا گرجا تعمیر نہ کیا جائے گا اور عیسائی لباس پہنے، صافے اور سر کی مانگ میں

مسلمانوں کی مشابہت نہیں کریں گے۔ عیسائیوں میں آڑی مانگ نکالنے کا طریقہ اسی وقت سے رائج ہے مسلمان ان کے برعکس ناک کی سیدھ میں مانگ نکالا کرتے تھے۔ اس فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے یہاں دس روز قیام فرمایا تھا اور اپنے دستِ مبارک سے مسجدِ عمر کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ اب اسی کو مسجد اقصیٰ کہتے ہیں۔

سنہ ۶۴۰ء مسجد عمر کی تعمیر ختم ہوئی۔ اس پر ملکِ مصر کی سات سالہ مالگذاری صرف ہوئی۔

سنہ ۶۹۱ء عبدالملک نے مسجد عمر پر گنبد بنوایا جس کی تعمیر اس کی ابتدائی حکومت کے سال سنہ ۶۸۴ء سے شروع ہوئی تھی۔

سنہ ۸۰۰ء شاہنشاہ شارلمان (Charlemagne) والی فرانس نے چند سفیر اس مقدس شہر میں خیرات تقسیم کرنے کی غرض سے بھیجے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے شاہنشاہ مذکور کو مزار مقدس (Holy Sepulchre) اور کیلوری کی چابیاں تحفتاً ان ہی سفراء کے ہاتھ بھیجیں۔ اس کے علاوہ ایک خوشنما شامیانہ پانی کی ایک گھڑی اور ایک ہاتھی دے کر ان کو اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

سنہ ۹۲۰ء تمرم ابوحرب باغی نے کچھ دن تک اس پر قبضہ رکھا۔

سنہ ۹۶۹ء خلیفہ معز (فاطمی خاندان) نے اس پر قبضہ کیا مزار مقدس نذرِ آتش ہو کر خاکستر ہو گیا۔

سنہ ۱۰۳۵ء رابرٹ شاہ نارمنڈی (فرانس) نے حج کیا۔

سنہ ۱۰۵۴ء کیمبرائے فرانس کے شاہ لیتھبرٹ نے حج کیا۔

سنہ ۱۰۶۵ء جرمنی کے بشپوں نے حج کیا۔

سنہ ۱۰۷۷ء ملک شاہ کی فوجوں نے تاخت و تاراج کیا۔

سنہ ۱۰۸۴ء ترکمان سردار ارتق نے بغاوت کی اور قابض ہوا۔

سنہ ۱۰۹۵ء صلیبی جنگیں عیسائیوں کی مذہبی جنگیں تھیں جو انھوں نے مسلمانوں کے خلاف دو صدی تک برابر جاری رکھیں۔ ان جنگوں کے مقصد دو تھے اول یہ کہ عیسائی حاجیوں کی معبد مقدس کی زیارت میں جانیں محفوظ ہوں۔ دوسرے فلسطین پر عیسائی حکومت قائم ہو لیکن بعد میں قسطنطنیہ اور مصر بھی

ان کی دستبرد سے نہ بچے اور بہت سخت معرکوں کے جولانگاہ رہے۔ آخر چودھویں صدی میں ترکوں نے صلیبی جنگوں کو مدافعتی جنگوں میں تبدیل کر دیا۔

عیسائی مورخ ان جنگوں کے آغاز کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ جب سلجوقیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا تو عیسائیوں کے لئے حج مشکل اور خطرناک ہو گیا۔ اس بنا پر پوپ اربن ثانی اور پیٹر دی ہرمٹ نے مسلمانوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ ان کی اس پکار کو شاہوں اور عوام نے یکساں اہمیت دی۔ چنانچہ والٹر پینی لیس اور پیٹر ۱۰۹۶ء میں ایک صلیب لے کر ایک غیر منظم انبوہ کے ساتھ فلسطین کی جانب روانہ ہوئے۔ اس میں بہت سے شاہزادے اور کنرڈ ثالث اور لوئس ہفتم بھی شریک تھے یہ کثیر انبوہ قسطنطنیہ پر جمع ہوا اور ایشیائے کوچک کے راستے لڑتا بھڑتا انطاکیہ پہنچا۔ اسے فتح کیا۔ پھر چالیس ہزار صلیبی مجاہدوں کے ساتھ بیت المقدس کی فصیل تک پہنچکر سخت جنگ کے بعد مسلمانوں سے ۱۵ر جولائی ۱۰۹۸ء کے روز فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان مجاہدوں نے دس ہزار مسلمانوں کو شہید کیا اور عیسائی حکومت قائم کر لی۔ بوٹلن (بلجیم) کے گاڈفرے کو صلیبیوں نے یہاں کا بادشاہ بنایا۔ اس کے بھائی بالڈون کو بالائی عراق کا اور بوہمنڈ کو انطاکیہ کا بادشاہ تسلیم کیا۔ گوڈفرے ۱۱۰۰ء میں مر گیا تو اس کی جگہ بالڈون ہوا۔ بوہمنڈ دشمنوں کے ہاتھ اسیر ہوا اور جو مہم انطاکیہ واپس لینے کے لئے بھیجی گئی تھی وہ سب کی سب تباہ ہو گئی۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ اس دور میں عیسائیوں نے مسلمانوں اور یہودیوں سے جزیہ بھی لیا۔

۱۰۹۸ء فاطمی خلیفہ نے بیت المقدس دوبارہ فتح کیا۔

۱۱۴۷ء دوسری صلیبی جنگ لوئس ہفتم (فرانس) اور کنرڈ ثالث سے ہوئی اور وہ ناکام و نامراد رہے۔ یورپ نے اس شکست کا اعلان ۱۱۴۹ء میں کیا اس جنگ میں عیسائیوں کا بے اندازہ نقصان ہوا۔

۱۱۷۴ء سلطان صلاح الدین بن یوسف بن ایوب سلطان مصر نے دمشق فتح کیا اور ۱۱۸۳ء میں حلب پر قبضہ کیا اس کے بعد براہ گیلیلی دو بڑے معرکے عیسائیوں کے ساتھ طبریہ اور حطین پر ہوئے اور اکتوبر ۱۱۸۷ء میں یروشلم پر قابض ہو گیا اور صخرہ پر جو سونے کی صلیب تھی سلطان نے اسے اپنے ہاتھ سے

اتار پھینکا اور اس کی جگہ اپنا ہلالی جھنڈا نصب کیا۔ مسجد کو اسی حال پر دوبارہ بنوایا۔ یورپ میں عیسائیوں نے اس فتح کی خبر کو تعجب اور غصہ سے سنا۔ اس کے بعد رچرڈ اول شیر دل شاہ انگلستان۔ فلپ آگسٹس ثانی والی فرانس اور فریڈرک والی جرمنی کثیر فوج کے ساتھ تیار ہوئے۔ جرمنی والے ایشیائے کوچک کی راہ سے روانہ ہوئے۔ شاہنشاہ فریڈرک راستے ہی میں ڈوب کر مرگیا۔ باقی دونوں سمندر کے راستہ سے عکا پہنچے جہاں صلاح الدین ایوبی نے ایسی شکست فاش دی کہ کسی کو بیت المقدس تک پہنچنے کی ہمت اور توفیق نہ ہوئی۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ۱۱۸۹ء میں عکا کو صلیبیوں نے گھیر لیا اور ۱۱۹۱ء میں مسلمانوں نے اسے فتح کیا۔

عکا میں جب یہ یورپ کے صلیبی مجاہد بتعداد کثیر مع رچرڈ کے بیمار ہوگئے تو سلطان نے ازراہِ ہمدردی ان کو بہت سی اشیاء بھیجیں اور کہلا بھیجا کہ ان کو استعمال کرو اور تندرست ہو کر مجھ سے جنگ کرو۔ ایسا نہ ہو کوئی ارمان باقی رہ جائے۔ یہ تیسری صلیبی جنگ تھی اسے شاہنشاہوں کی جنگ سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ یہ جنگ ۱۱۹۲ء میں ختم ہوئی۔ اسی سنہ میں عیسائیوں کو سلطان نے حج کی اجازت عطا کی۔

اس جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ۱۱۸۸ء میں انگلستان میں ایک بھاری ٹیکس لگایا گیا جو کمائی کا دسواں حصہ تھا اس کا نام عشر صلاح الدین تھا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے رچرڈ شیر دل سے کہا تھا کہ یروشلم ہم مسلمانوں کو اتنا ہی عزیز ہے جتنا نصاریٰ کو ہو سکتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے ہمارے رسول مقبولؐ کو معراج حاصل ہوئی اور بروز قیامت ہماری امت محمدیہ کے لئے یہیں میدانِ حشر ہوگا۔

۱۱۹۸ء سے ۱۲۰۴ء تک ہنری ششم نے چوتھی بار حملہ کیا مگر شکست فاش کھائی۔ اس جنگ میں ۱۲۰۲ء میں ایک فرانسیسی لڑکے اسٹینے کی سرکردگی میں جوانوں کے علاوہ بارہ بارہ اور چودہ چودہ سال کے تیس ہزار لڑکے بھی صلیبی مجاہد بن کر یورپ کے تمام ملکوں سے اکٹھے ہوئے اور نعرے مارتے ہوئے مارسلیز سے جہازوں پر روانہ ہوئے اسی طرح وینس سے بھی۔ یہ بجائے یروشلم جانے کے قسطنطنیہ پہنچے۔ اسے

تباہ کیا اور لاطینی حکومت قائم کر لی۔ ۱۲۰۴ء میں بالڈون آف فلینڈرز کو بادشاہ بنایا۔ ان لڑکوں کا حشر بہت ہی برا اور افسوسناک ہوا۔ جہاں وہ گئے غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے۔ دو جہاز سارڈینیا کے قریب تباہ ہوئے۔ باقی اسکندریہ پہنچے انہی ایام میں ایک اور لڑکے مسمی نکولس (جرمنی) نے ایک لشکر تیار کیا اور براہ اٹلی مہم لے کر روانہ ہوا۔ ان کا حشر زیادہ برا نہیں ہوا۔ کچھ تو راستے میں مر گئے۔ دو لشکر مفقود الخبر ہو گئے بہت سے گھروں کو واپس لوٹ گئے اور باقی ماندہ نے اطالوی شہروں اور قصبوں میں ملازمت اختیار کر لی یہ چوتھی صلیبی جنگ تھی۔ اسے بچوں کی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔

۱۲۱۷ء۔ پانچویں صلیبی جنگ اینڈریو شاہ ہنگری سے ہوئی۔

۱۲۱۹ء۔ ایک معاہدہ کی تکمیل کے سلسلے میں شاہنشاہ فریڈرک ثانی کے حوالہ ہوا۔ یہ بھی صلیبی جنگ ہی تھی مگر اس میں شاہِ ملک کو یار بنا کر دس برس کے لئے عیسائیوں نے یہ شرط لکھوائی کہ یافا سے تلمیس تک کے علاقہ کا فریڈرک بادشاہ رہے۔ اس سے پادری ناراض ہو گئے اور بیچارے فریڈرک کو بہت جلد اٹلی واپس چلا جانا پڑا۔

۱۲۲۸ء چھٹی صلیبی جنگ فریڈرک ثانی کی قیادت میں ہوئی۔ ۱۲۲۹ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ سلطان کامل نے بیت المقدس عیسائیوں کے حوالہ کر دیا۔

۱۲۳۹ء مسلمانوں نے عیسائیوں سے پھر واپس لے لیا۔ یہ ساتویں صلیبی جنگ تھی جو فرانس کے بادشاہ لوئس سے ہوئی۔ اس میں لوئس گرفتار ہو گیا اور چار لاکھ طلائی سکہ دے کر ۱۲۵۰ء میں قید سے رہا ہوا اور وطن واپس چلا گیا۔

اس کے بعد آٹھویں صلیبی جنگ شاہِ فرانس اور ایڈورڈ اول شاہ انگلستان سے ہوئی اس میں ساٹھ ہزار عیسائی قتل ہوئے بالآخر سخت ہزیمت کھائی۔

۱۲۴۳ء نویں صلیبی جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی اور بیت المقدس پر عیسائی قبضہ ہو گیا

۱۲۴۴ء عیسائیوں کو غزہ پر سخت شکست ہوئی اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا بغیر جنگ قبضہ ہو گیا۔

۱۲۴۸ء میں دسویں صلیبی جنگ ہوئی۔ صلیبی افواج لوئس نہم کے زیر کمان تھیں یہاں تک کی

جنگوں کا جولانگاہ عکا رہا یہ جنگ بھی عیسائیوں کے لئے تباہ کن رہی کیونکہ اس میں لوئس بے شمار فوج کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ اسے آٹھ لاکھ اشرفی بطور زرفدیہ ادا کرنا پڑا۔ باوجود اس کے ۱۲۷۰ء میں وہ پھر روانہ ہوا مگر ٹیونس میں مر گیا اس مہم میں ایڈورڈ اول شاہ انگلستان بھی شریک تھا جو چند ماہ بعد عکا پہنچا۔ یہ شاہنشاہوں میں آخری مجاہد تھا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ پھر ۶۷-۱۳۶۵ء پیٹر آف سائپرس مجاہد بن کر مصر اور شام میں مسلمانوں سے لڑتا رہا اور قتل ہوا۔ اس کے بعد بہت سے پوپوں نے مذہبی جنگ کے لئے تبلیغ کی مگر یورپ میں کہیں جرأت پیدا نہ ہوئی۔ چنانچہ ۱۴۵۳ء میں جبکہ محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ تو یورپ قسطنطنیہ واپس لینے میں ناکام رہا۔ اگرچہ اس نے مذہبی جنگ کا اعلان کیا یہاں تک کی کل مذہبی جنگیں عیسائیوں کے حق میں مفید نہیں رہیں۔ پوپ کا اقتدار انہی جنگوں کی ناکامی کے باعث ختم ہوا۔

ان جنگوں سے اہلِ یورپ نے بہت سے فائدے بھی حاصل کئے۔ مثلاً قند۔ روئی اور بہت سی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کا اول اول یورپ میں رواج ہوا۔ ان کے علاوہ بہت سے علوم اور جغرافیہ دانی عربوں سے حاصل کی۔

یہاں تک کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس بارہ صلیبی جنگیں مسلمانوں کے خلاف محض بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی غرض سے عیسائیوں نے لڑیں اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ انگلستان اور فرانس نے لیا۔

۱۵۱۷ء سلطان سلیم شاہ اول (ترکی) نے قبضہ کیا۔ ترکوں نے فلسطین شام اور مصر پر بھی قبضہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس مقدس شہر پر جنگِ عظیم تک ترکوں ہی کا قبضہ رہا۔ اس دوران میں چند ماہ کے لئے نپولین بونا پارٹ اور محمد علی پاشائے مصر کے زیرِ حکومت چند سال تک رہا۔

۱۵۴۲ء بروایت دیگر ۱۵۴۲ء سلطان سلیم اول بن سلیم شاہ نے شہر کی موجودہ فصیل جس کا گھیر ڈھائی میل ہے تعمیر کرائی۔ اس میں سات دروازے رکھے جن میں سے ایک کا نام باب الحرام ہے پیمائش وفنی کے لحاظ سے یہ شہر پناہ ۱۲۲۵۰ فٹ طویل ہے۔ اس کے علاوہ قبۃ الصخرہ کی بھی مرمت کرائی۔

۱۸۳۲ء سلطان ترکی نے محمد علی پاشا کو وہابیوں کی سرکوبی کے لئے اور بغاوت فرو کرنے کی غرض سے مامور کیا جس نے نہ صرف وہابیوں کو تباہ کیا بلکہ حجاز فلسطین و شام پر بھی اپنا تسلط قائم کیا۔

وہابیوں کو الریاض (نجد) کی جانب بھگا دیا۔

۱۸۴۰ء خدیو مصر نے سلطان ترکی کو واپس دیدیا۔

۱۸۵۵ء ترکوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے جانے کی اجازت دی اسی وقت سے فلسطین میں عیسائیوں اور یہودیوں کی نوآبادیاں قائم ہوئیں۔

۱۸۵۹ء میں سلطان محمود ثانی نے فلسطین کا دورہ کیا اور زیارت کی۔

۱۸۶۲ء میں ایڈورڈ ہفتم بزمانہ ولیعہدی نے زیارت کی۔

۱۸۹۶ء۔ بیت المقدس میں امریکن مشن نے اندھوں کا سکول جاری کیا۔

۱۸۹۸ء۔ شاہ ولیم ثانی (جرمنی) نے زیارت کی۔

۱۹۱۷ء ۸ر اور ۹ر دسمبر کی درمیانی شب کو بغیر جنگ کئے ترکوں کے آخری سپاہی نے بیت المقدس خالی کر دیا۔ اس طرح چار سو سالہ عثمانی قبضہ کا خاتمہ ہوگیا اس کے بعد چند روز ترکوں نے اسے واپس حاصل کرنے کی غرض سے مضافات میں کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

۱۰ر دسمبر کی صبح کو جنرل شیا (Shea) کمان افسر ۶۰ ڈویژن بیت المقدس میں داخل ہوا دوپہر کے وقت وہاں کے حاکم نے جنرل مذکور کو چابیاں حوالہ کر دیں۔

۱۱ر دسمبر کو جنرل ایلنبائی جو مصری فلسطینی افواج (فورس ای) کا سپہ سالار اعظم تھا مع اپنے اسٹاف کے پاپیادہ باقاعدہ فاتحانہ طور پر باب یافا سے داخل ہوا (انا للہ وانا الیہ راجعون)

بقول بعض ذمہ دارانِ سلطنت برطانیہ یہ بھی ایک صلیبی جنگ تھی جسے بیت المقدس کی فتح کے بعد ظاہر کیا گیا۔ اس لحاظ سے اسے گیارہویں یا تیرہویں صلیبی جنگ قرار دینا چاہیے۔

انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ ایلنبائی کے داخلہ یروشلم سے سوا سات سو سال پہلے یروشلم نے کسی عیسائی فاتح یا برطانی سپاہی کو نہیں دیکھا تھا۔

برطانیہ کے ذمہ دار وزیر مسٹر چرچل اپنی مصنفہ تاریخ "دی گریٹ وار" میں لکھتے ہیں کہ

۸ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترک بیت المقدس سے دست بردار ہوگئے ان کے چار سو سالہ منحوس

قبضے کے بعد برطانی کمانڈر انچیف باشندگانِ بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔

دوسری جگہ لکھا ہے کہ ۹ دسمبر کو یروشلم کے باشندوں کی جماعت سفید جھنڈے لئے ہوئے شہر سے باہر آئی . . . . الخ

بیت المقدس کی اس فتح کے سلسلے میں مسٹر ٹلسن مصنف تاریخِ جنگ مجلد ۲۳ کے صفحات ۱۳۵ و ۱۳۶ پر فرطِ انبساط میں یوں رقمطراز ہے کہ

آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور اگر سینٹ لوئس اور ریمنڈ اور رچرڈ شاہ انگلستان اس حیرت افزا افواج کو دیکھتے تو ان کی روحیں متحیر ہو جاتیں کیونکہ اس کا بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجیری اور ہندی مسلمان، عرب قبائل ہندوستان کے ہزارہا فرقوں کے ماننے والے۔ افریقہ کے حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھیں جنھوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔

جنگِ عظیم اول میں شام، عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد وہاں کی کل تعداد کا ۵/۴ حصہ تھی۔

مسٹر جارج ٹاؤنسنڈ وارنر اپنی کتاب "گراؤنڈ ورک آف برٹش ہسٹری" کے ص ۷۵۱ پر رقمطراز ہے کہ

"بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ و تصرف میں آیا۔ جنرل ایلنبائی بڑے دن (کرسمس) سے ایک پندرھواڑے سے کم عرصہ میں باضابطہ طور پر بیت المقدس میں داخل ہوا۔

یہی مصنف ص ۷۵۷ پر لکھتا ہے۔

قریب قریب اسی وقت جنرل ایلنبائی نے فلسطین میں شاندار پیشقدمی کی۔ اس پیشقدمی کے انصرام کا سہرا خاص طور پر ہندوستانی افواج کے سر ہے۔

مسٹر لوول ٹامسن اپنی کتاب "عرب میں لارنس کے ہمراہ" کے ص ۱۸ پر احسان جتاتے ہیں کہ

ایلنبائی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لکھوکھا مسلمانوں کی متبرک سرزمین ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو مقاماتِ مقدسہ کی واپسی نصاریٰ میں بیداری کی محرک ہوئی اور بیت المقدس کی تسخیر ترکی کے زوال کی معاون ہوئی۔ ایسی حالت میں جبکہ اس سے پہلے دیگر مقاماتِ مقدسہ یعنی مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بغداد شریف سے ترک نکالے جا چکے تھے۔

ایک مستند راوی جس کا حوالہ جلال الدین السیوطیؒ نے دیا ہے وہ کہتا ہے کہ بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے لیکر ۱۰۹۹ء تک مسلمانوں کے قبضے میں موجود رہا۔ اس سنہ میں عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات یوم مسلمانوں کی بڑی تعداد کو بے دریغ تہ تیغ کر کے جامِ شہادت پلایا۔ انھوں نے مسجدِ اقصیٰ میں ستر ہزار مسلمانوں کو شہید کیا اور صخرہ میں سونے چاندی کے برتن اور بے شمار مال و دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھا نکال کر لے لیا گیا۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ

لیکن سلطان صلاح الدین کو خدا تعالیٰ نے بیت المقدس کی مکمل آزادی کے لئے مامور کیا کیونکہ وہ سب سے زیادہ مشہور شیر دل اور دہکتی ہوئی آگ کا پتلا تھا۔

۱۹۳۳ء ۲۶ ستمبر کو ابی سینیا یا حبش کی ملکہ ویزومنین نے شاہنشاہ ہیلے سلاسے اول کے جشن سے چلے آنے کے بعد زیارت کی۔ آپ اپنے تئیں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ شیب کی اولاد بتاتی ہیں۔

مسلمانوں سے پیشتر بیت المقدس پانچسو سال تک رومن اور بازنطینی تسلط میں رہا۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد جنرل ایلنبائی کو علاوہ دیگر اعزازات کے پچاس ہزار پونڈ حکومتِ برطانیہ نے انعام دیا اور جارج پنجم شاہ انگلستان و شاہنشاہ ہند نے ان کی خدمات کو بیحد سراہا۔

۱۹۲۰ء میں صلح کانفرنس نے فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب دیا تو سر رابرٹ سیموئیل پہلا ہائی کمشنر مقرر ہوا۔

۱۹۳۶ء موسمِ بہار میں عرب ہائی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ کمیٹی کے اعلان سے چھ ماہ تک یادگارِ زمانہ ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی آفندی تعلیم یافتہ جامع ازہر (مصر)

صدر مقرر ہوئے۔ انھیں حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۱ء میں مفتی تسلیم کیا تھا مفتی صاحب کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری ہوا تو آپ مسجد اقصیٰ میں معتکف ہوگئے۔ اگرچہ مسجد کا محاصرہ تھا مگر آپ بھیس بدل کر شام روانہ ہوگئے وہاں سے آپ لبنان میں مقیم ہوئے۔

یہودیوں نے بھی صیہونی ایجنسی قائم کی۔ یہ کمیٹی حکومت کا بایاں بازو ہے۔

یہودیوں کے داخلہ اور قومی وطن کے خلاف ۲ر نومبر ۱۹۴۵ء تک یہاں سینکڑوں فسادات اور ہڑتالیں ہوچکی ہیں اور یہ اب مستقل عذاب بن گیا ہے اور ٹرومین صدر امریکہ کے خط نے غم وغصہ کو پہلے سے بہت زیادہ کردیا ہے گو امریکہ و برطانیہ کی جانب سے مسئلہ فلسطین کے حل کے لئے ایک کمیٹی قائم ہوچکی ہے مگر امید نہیں کہ وہ کوئی تسلی بخش اور قابل قبول حل تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

مسجد اقصیٰ مسجد عمر یا مسجد الصخرہ یا مسجد الاقصیٰ یا الاقصیٰ کئی ناموں سے موسوم ہے مسجد کے احاطہ کو حرم شریف کہتے ہیں جو ۱۴۹۹ فٹ لمبا ہے اور ۵۹۵ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے دس دروازے ہیں، پانچ کھلے اور پانچ بند رہتے ہیں۔ اس احاطہ کے درمیان ایک پختہ سنگ مرمر کا تخت ہے یا چبوترہ جو غالباً ۵۰۴ مربع فٹ ہے۔ اس کی بلندی احاطہ کی سطح سے بارہ چودہ فٹ ہوگی۔ اس پر چڑھنے کے لئے اچھی اور کشادہ سیڑھیاں ہیں۔ اس تخت کے اردگرد بہت سے حجرے بنے ہوئے ہیں جن میں موذن وخدام رہتے ہیں یا سامان مرمت رکھا رہتا ہے لیکن سب سے زیادہ حسین وخوشنما وہ مسجد ہے جو اس تخت کے بیچوں بیچ ہے جس کو مسجد الصخرہ کہتے ہیں اس وجہ سے کہ اس کے اندر ایک پتھر لگا ہوا ہے جس کی نسبت خیال ہے کہ یہ پتھر اس وقت آسمان سے گرا تھا جب کہ پہلے پہل موت ہوئی تب سے یہیں پڑا ہے۔

کہتے ہیں کہ سب نبی اسی پر بیٹھکر خدا کے احکام لوگوں کو پہنچایا کرتے تھے پھر یہ اڑ کر جانے کو تھا کہ حضرت جبریلؑ نے اپنے ہاتھ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تک اس کو روک دیا پھر حضرت نے ہمیشہ کے لئے اس کو قائم رکھا (یہ روایت سند صحیح سے ثابت نہیں ہے) یہ مسجد ہشت پہل ہے۔ ہر پہلو ساٹھ فٹ ہے۔ اس کے پتھروں سے ثابت ہے کہ یہ ہیکل ہی کے پتھر ہیں۔ گنبد نوے فٹ

بلند ہے اور اس کا قطر چالیس فٹ ہے۔ مسجد کے نیچے ایک تہ خانہ بھی ہے جس میں مسجد سے ایک کھڑکی کے ذریعہ شمع یا ٹارچ لیکر نیچے اترتے ہیں۔ نیچے جا کر حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی بنیاد کے نشان معلوم ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک اس مسجد کی زیارت اور قصداً وہاں جا کر نماز پڑھنا نہایت ہی ثواب اور قبولیت کا کام ہے۔ مسلمان زائرین کے لئے ایک مسافرخانہ بھی ہے جسے تکیہ کہتے ہیں۔ یہاں کھانا پینا شیخ تکیہ کی معرفت سلطان المعظم کی طرف سے ملا کرتا تھا مگر اب جبکہ برطانیہ کا قبضہ ہوگیا ہے معلوم نہیں کہ تکیہ کا کیا حشر ہوا۔ یہ تو ضرور ہے کہ لنگر بند ہوگیا ہوگا اس لئے کہ مسلمانوں کے عہد میں یہ سارا بار خزانہ پر تھا۔ برطانی بجٹ میں ایسے امور کے لئے کہیں بھی کوئی مد نہیں۔

الصخرہ | الصخرہ کے معنی چٹان ہیں اور یروشلم کی وہ مقدس چٹان مراد ہے جس پر معبد بنایا گیا تھا اور اب اس پر قبۃ الصخرہ (چٹان کا گنبد) قائم ہے اور انگریزی داں حضرات اسے مسجد عمر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چٹان جنت سے آئی تھی۔ یہ چٹان زمین کا سنگِ بنیاد ہے۔ کل انبیاً علیہم السلام کا مصلی ہے اور کعبۃ اللہ کے بعد مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ مقدس اور پاک مقام ہے۔ امام جلال الدین السیوطی اپنی کتاب معبد یروشلم مرتبہ رینلڈص ۴۴ میں مندرجہ ذیل بیان اس شاندار صخرہ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ:۔

ابن المنصور نے ہم کو بتایا کہ صخرہ بیت المقدس حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بارہ ہزار ہاتھ بلند تھا اور ایک ہاتھ اس زمانہ میں پورے ہاتھ کے برابر ہوتا تھا یعنی آج کل کا ایک ہاتھ اور ایک بالشت اور ہاتھ کی چوڑائی اس پر ایک معبد تھا جو صندل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اس کی اونچائی بارہ میل تھی۔ اس پر سونے کی جالی بندھے ہوئے لعل اور موتیوں کی دو تسبیحوں کے درمیان تھی۔ جس کو بعلکا کی عورتوں نے رات کے وقت بنا تھا یہ جالی تین دن کام آتی تھی۔ جب سورج نکلتا تھا تو امواس (Emmaus) کے لوگ اس معبد کے سایہ میں رہتے تھے اور جب سورج ڈوبتا تھا تو بیت الرحمٰن کے لوگ سایہ میں رہتے تھے مگر اور دوسری وادیوں کے رہنے والے بھی اس کے سایہ میں ہوتے تھے

اس پر ایک بڑا لعل نصب تھا جو رات میں سورج کی طرح چمکتا تھا مگر جب روشنی پھیلنی شروع ہوجاتی تھی تو اس کی چمک ماند پڑجاتی تھی اور ۵۸۷ بروایت دیگر ۵۲۸ سال قبل مسیح جب تک بخت نصر نے (Nebuchadnezzar.) تمام چیزوں کو برباد نہیں کیا یہ سب کچھ برقرار تھا۔

بخت نصر نے جو کچھ ہاتھ لگا لوٹ لیا اور یونان لے گیا اور قتل عام کے علاوہ بے شمار یہودیوں اور یہودنوں کو بطور غلام اور لونڈی اپنے ہمراہ لیگیا گویا ایک طرح سے بقیۃ السیف یہودیوں کو جلاوطن کردیا۔

دوسری روایت سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ صخرہ بیت المقدس سربفلک تھا جس کی بلندی بارہ میل تھی اور اس کے اوپر آسمان کے درمیان بارہ میل سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا یہ سب چیزیں اسی حالت پر قائم تھیں کہ یونان یا روم نے اس پر قبضہ کرلیا یعنی بخت نصر کی تباہ کاریوں کے فوراً ہی بعد قبضہ کرلیا تو یونانیوں نے کہا کہ ہمیں اس عمارت سے جو پہلے یہاں تھی بہت بڑھ چڑھ کر بنانی چاہئے چنانچہ انھوں نے اس پر ایک عمارت تعمیر کی سطح زمین پر اس کا عرض اتنا تھا جتنا آسمان میں ارتفاع تھا۔ اس کو سونے سے منڈھ دیا اور چاندی پھیردی اور اس میں داخل ہوکر بت پرستی شروع کردی جس کی وجہ سے وہ عمارت ان پر اوندھ گئی اور وہ سب دبکر ہلاک ہوگئے اور کوئی بھی نہ بچا۔

جب شاہ یونان نے یہ حادثہ دیکھا تو موبد اعلیٰ اور اپنے وزرا اور یونان کے امرا کو طلب کرکے دریافت کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے دیوتا ہم سے خوش نہیں ہیں اور اسی لئے ہم پر نوازش نہیں کرتے۔ اس پر اس نے دوسرا معبد تیار کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ صرف کثیر سے وہ بن کر تیار ہوا تو پھر اس میں ستر آدمی داخل ہوئے اور حسب معمول بت پرستی کرنے لگے۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا کہ عمارت ان پر اوندھ گئی مگر ان کا بادشاہ شامل نہیں تھا۔

بادشاہ نے تیسری مرتبہ سب کو اکھٹا کرکے پھر استصواب کیا کہ تمہارا اب کیا خیال ہے انھوں نے پھر یہی کہا کہ ہمارا خدا ہم سے خوش نہیں کیونکہ ہم نے بیش قیمت چڑھاوے نہیں چڑھائے لہذا ایک تیسرا معبد ہم کو بنانا چاہئے چنانچہ تیسری مرتبہ عمارت پھر بن کر تیار ہوئی اور انھوں نے خیال کیا کہ

ہم نے اس کو مناسب بلندی تک پہنچا دیا ہے۔ بادشاہ نے تیاری کے بعد عیسائیوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ کوئی خامی ہو تو بتلاؤ۔ سب نے کہا کہ خامی کوئی نہیں البتہ اس کے چاروں طرف سونے چاندی کی صلیبیں نصب ہونی چاہئیں۔ پھر تمام لوگ اس کے اندر داخل ہوئے تاکہ مقدس کتابیں پڑھیں مگر اندر جا کر بت پرستی شروع کر دی۔ معاً یہ تیسری عمارت بھی ان پر آن پڑی اس پر بادشاہ نے مشورہ کے لئے پھر سب کو جمع کیا کہ اب ان کو کیا کرنا چاہئے۔ ان پر بہت خوف طاری تھا۔ اہلِ مشاورت میں سے ایک ضعیف آدمی جو سفید کپڑوں میں ملبوس اور سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھا اس کی کمر دوہری تھی اور عصا کے سہارے کھڑا ہوا تھا اس نے حضارِ نصاریٰ کو خطاب کر کے کہا کہ میری بات سنو اور توجہ سے سنو۔ کیونکہ میں تم میں سب سے عمر رسیدہ ہوں اور معتکف زہاد کے حلقہ میں سے تم کو صرف اس عمارت کے متعلق مطلع کرنے آیا ہوں کہ اس کے تمام قابض ملعون ہیں اور تقدس اس جگہ باقی نہیں رہا ہے بلکہ دوسری جگہ منتقل ہو گیا ہے اس لئے میں تم کو بتاتا ہوں کہ تم کلیسائے نشور (Church of Resurrection) بناؤ۔ میں تم کو وہ مقام دکھاتا ہوں لیکن تم آئندہ پھر کبھی مجھ کو نہیں دیکھ پاؤ گے۔ لہٰذا میں جو کچھ تم سے کہوں اسے نیک نیتی سے انجام دو۔ اس طرح اس نے ان سب کو دھوکا دیا اور ان کی لعنت کو زیادہ کر دیا اور ان کو چٹان کاٹنے کا حکم دیدیا تاکہ اس کے پتھروں سے اس جگہ گرجا بنائیں ان سے باتیں کرتے کرتے وہ ضعیف شخص غائب ہو گیا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ اس وجہ سے ان کی بے دینی میں اضافہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ یہ اسمِ اعظم ہے پھر انھوں نے مساجد منہدم کر دیں اور ستون و پتھر و دیگر اشیا اٹھا کر لے گئے اور اس سامان سے انھوں نے کلیسائے نشور اور وادی ہنون (Hinnon) کا گرجا تعمیر کیا۔

علاوہ ازیں اس ملعون بڈھے شخص نے ان کو حکم دیا کہ جب تم یہ دونوں عمارتیں بنا لو تو اس جگہ کو لے لو جس کے قابض ملعون ہیں اور جہاں سے برکت دور ہو گئی ہے اور اس کو کوڑے کرکٹ کے لئے ڈلاؤ بنا لو۔ اس طرح انھوں نے اپنے خدا کو خوش کیا۔ کوڑے کرکٹ کا انھوں نے

بہت اہتمام کیا یہاں تک کہ بعض موسموں میں تمام غلاظت اور گندگی قسطنطنیہ سے جہازوں میں بھر کر بھیجی جاتی تھی اور ایک مقررہ وقت پر صخرہ پر پھینک دی جاتی تھی یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے ہمارے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب سے بیدار کیا اور راتوں رات ان کو یہاں کی سیر کرائی جو انھوں نے یہاں کی غیر معمولی تقدیس اور اس کی بے مثال عظمت کی وجہ سے کی۔

ہم نے پڑھا ہے کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ اس صخرہ کو سفید مونگے کا بنا دے گا اور بڑا کر کے زمین و آسمان پر پھیلا دے گا پھر لوگ اس صخرہ پر سے جنت یا دوزخ میں جائیں گے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ زمین کسی اور طرح کی زمین میں بدل جائیگی اور آسمان سفید ہو جائیں گے مٹی چاندی بن جائے گی اور اس پر کسی قسم کی آلودگی نہیں رہیگی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے کہا یا رسول اللہ! اس دن یہ زمین کوئی اور زمین بن جائے گی اور یہ آسمان بدل جائے گا تو خلقت اس دن کہاں ہوگی۔ آنحضرت نے جواب دیا کہ پل صراط پر۔

(باقی آئندہ)

الحاضر العالم الاسلامی

معاملہ خط و کتابت سے طے ہو سکتا ہے۔ مکتبہ برہان میں اس بلند پایہ اور مایۂ ناز کتاب کا ایک نسخہ آ گیا ہے

مجلد چرمی

مکتبہ برہان دہلی، قرول باغ

راندیر

عرب جہازرانوں کی قدیم بستی

از جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ۔ ڈی لٹ (پیرس)

مجھے گجرات کے اکثر قدیم مقامات میں تاریخی دستاویزات، قدیم عمارات کے کتبات کی تلاش میں گھومنے کا موقع ملا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں میں راندیر بھی گیا جو گجرات کا ایک قدیم شہر ہے۔ اور دریائے تاپتی کے دائیں کنارے سورت سے تقریباً دو میل اوپر واقع ہے[۵۱]۔ جہاں قدیم زمانہ سے عرب آباد چلے آتے تھے اور یہ ان کا بڑا مرکز تجارت تھا بالخصوص نوائط لوگ آباد تھے۔ یوں تو گجرات کے اکثر حصوں میں قبل از بعثت نبوی عرب لوگ تاجر کی حیثیت سے آباد تھے اور ان کو گجرات کے بعض قدیم سنسکرت کتبات میں بلفظ "تاجیک" تعبیر کیا گیا ہے[۵۲]۔ اور ان کو بعد میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے گجرات کے غیر مسلم راجاؤں نے مساجد بنانے کی رعایتیں بھی دے رکھی تھیں[۵۳] چنانچہ آج بھی یہ بستی زیادہ تر تاجر لوگوں کی ہی کہلاتی ہے جن کی تجارت زیادہ تر دوسرے ممالک میں ہے جنھوں نے نہایت عمدگی سے زر کثیر خرچ کرکے بڑی بڑی عالیشان مساجد تعمیر کی ہیں یہ مسجدیں ایک طویل مضمون کی محتاج ہیں۔ مجھے اپنے راندیری احباب مسٹر غلام حسین اور سید علی میران رفاعی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کی مسجد جامع جو دیکھنے میں آج کل کی عمارت معلوم ہوتی ہے سب سے قدیم عمارت شمار ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تاریخ بنا "سنہ ۵۹۱ھ" از لفظ "انا فتحنا" نکلتی ہے اور اسے یوں کندہ کیا گیا ہے۔

---

۵۱ راندیر کے دیگر حالات کے لئے بمبئی گزیٹیر ج ۲ ص ۲۹۹ ملاحظہ ہو۔

۵۲ بمبئی گزیٹیر ج ۱ ص ۱۴۹ ۔ ۵۳ مسعودی ج ۱ ص ۸۴ و ۲۸۲۔

انّا فتحنا
۵۹۱ ھ

بتاریخ بنا قدیم مسجد ہذا معروف بڑی جامع مسجد راندیر

بنا کرد مسجد بجائے کنشت   بروایوانش انّا فتحنا نوشت

مگراس کے قرب میں ہی ایک قدیم قبرستان ہے جسے خطۂ تبع تابعین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی اس میں وہ لوگ مدفون ہیں جنھوں نے آنحضرت صلعم کے صحابہ کی زیارت کرنے والوں کی زیارت کی تھی پھر بھی حساب سے ہم اسے اسلام کی دوسری صدی تک منسوب کرسکتے ہیں۔ مجھے اتفاق سے دو قدیم کتبات کے مطالعہ کا موقع ملا جو عربی زبان میں ہیں اور دراصل سنگِ مرمر کی لوحِ مزار ہیں اور نسخی حروف میں آیاتِ قرآنی اور احادیث سے نہایت عمدگی سے مزین ہیں۔ اس قسم کے قدیم لوح مزار گجرات کے قدیم شہروں مثلاً سومنات۔ کنبایت وغیرہ میں بہت ملتے ہیں۔ ایک کتبہ تو اسی قبرستان "خطۂ تبع تابعین" کی ایک قبر سے ملا اور دوسرا مسجد جامع کی دیوار مشرقی کے شمالی کونہ سے دستیاب ہوا۔ یہ دونوں کتبات بہت اہم ہیں جن کا میں نے فوراً چربہ حاصل کرلیا۔ ان کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر . . . . ذیل میں ان حضرات کے نام اور ان کے سالہائے وفات درج کرتا ہوں جن کے مزارات کے یہ الواح ہیں

الف۔ وہ کتبہ جو مسجد سے حاصل ہوا یہ ہے[1]۔ ہم نے سطروں کو نمبروار درج کیا ہے۔

۱۔ ھذا قبر المرحوم المغفور الفقیر الی اللہ تعالیٰ

۲۔ معلم ابن حسن کھنبایتی برد اللہ مضجعہ وانّسٗ بالقران۔

۳۔ وحشتہ فی التاریخ یوم السبت سلخ من شھر شوال سنہ ثلاث وثلاثون وست مائتیہ

(ب) دوسرا کتبہ جو خطۂ تبع تابعین کی ایک قبر پر ہے یہ ہے۔

۱۔ ھذا قبر العبد المرحوم المغفور الراجی الی رحمۃ اللہ۔

۲۔ تعالیٰ ابوبکر عثمان علمکش؟ (یا علمگیر؟ یا علمگیر؟) تغمدہ اللہ برضوانہ وبرحمتہ

---

[1] مصلحتاً ان کتبات کی دوسری عبارات کو یہاں نہیں درج کیا ورنہ مضمون کی دوسری حیثیت ہوجاتی۔

۳- واسکنہ بحبوحتہ جنانہ توفی یوم السبت احدی وعشرون من شہر ذوالقعدہ

۴- سنۃ احدی وعشرین وسبعمائۃ وصلی اللہ علی محمد وآلہ

ان ہر دو کتبات میں دونوں مدفون شخصوں کے نام اوران کی تاریخ وفات بالکل واضح ہیں اگرچہ نہایت مشکل سے یہ بھی پڑھے گئے ہیں یعنی:- (۱) معلم ابن حسن جو کھنبایت کے باشندہ تھے انھوں نے ہفتہ کے روز مہینہ شوال کی آخیر تاریخوں میں ۷۲۳ھ میں انتقال کیا- (۲) ابوبکر عثمان علمکش نے (جو صحیح نہیں پڑھا گیا) بروز ہفتہ ۲۱ تاریخ ذوالقعدہ کو ۷۲۱ء میں وفات پائی -[1]

ان ہر دو کتبات میں الفاظ "معلم" "علمکش" اور "کھنبایت" ہماری دلچسپی کا باعث ہیں- اول شخص جو "معلم ابن حسن" کے نام سے مشہور تھا وہ تو جہاز کا کپتان (آج کل کی اصطلاح میں) تھا- اسی طرح مورخین نے واس کوڈے گاما ن کے جہاز کے کپتان کو "معلم ابن ماجد" لکھا ہے جو الجیریا کا باشندہ تھا- اسی طرح دوسرا لفظ علمکش یا علمگیر یا عالمگیر بھی جہاز کے محکمہ سے متعلق ہیں- اگرچہ اس کا درجہ معلم کے درجہ سے کم تھا- غرض ان کتبات کی رو سے ہم کسی قدر یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ راندیر قدیم زمانہ سے ہی عرب جہاز رانوں کا مرکز تھا-

اس کے علاوہ ان کتبات سے اسلامی ثقافت کے دیگر مآثر پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی علم ہوتا ہے کہ کھنبایت جو بالکل سمندر کے ساحل پر واقع ہے قدیم زمانہ سے مرکز تجارت چلا آتا ہے اور ایسے لوگوں سے معمور تھا جن کا پیشہ بھی جہاز رانی تھا- یہ بھی مسرت کا مقام ہے کہ ہنوز ایک خاندان راندیر میں آباد ہے جو "معلم" کے لقب سے مشہور ہے مجھے ان کے بعض افراد سے کھنبایت میں ملنے کا موقع ملا ہے یہ حضرات اپنے آپ کو قدیم عربوں کی اولاد کہتے ہیں -

---

[1] گجرات کے مشہور مقامات، احمد آباد- کھنبایت سے راقم بے شمار اہم تاریخی کتبات جمع کر چکا ہے جو ان سے ہی قدیم ہیں- احمد آباد کے تو طبع ہو چکے ہیں اور کھنبایت کے زیر ترتیب ہیں ان تمام کتبات میں بے شمار نکات ثقافت اسلامی کے آ گئے ہیں-

میرے محترم دوست سید میراں رفاعی صاحب نے ایک کتاب "خیفت الصورت" عنایت کی جن میں ان امور پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی یہ زیادہ تر متاخرین ملحار کے حالات پر مشتمل ہے- بہرحال میں آنمکرم کا ممنون ہوں-

ادبیات

تہذیبِ نو

از جناب ماہر القادری

الحذر! از فتنۂ تہذیبِ نو — تیرہ باطن، سست پیمان، تیز رو
مرد و زن شانہ بہ شانہ رو بہ رو — بزمِ عشرت در جہانِ رنگ و بو
ہمچو خوک و سگ بہ مستی بے قرار — از رہِ اخلاق و خود داری فرار
نغمہ و تصویر و اشعار و شراب — صنفِ نازک بے نقاب و بے حجاب
ہر تبسم گریۂ قلب و ضمیر — محوِ غفلت کودک و برنا و پیر
دانشِ بے دین و علمِ بے یقیں — لعنتِ خوش رنگ بر روئے زمیں
برق و بادِ آب را تسخیر کرد — دل مگر خالی ز سوز و سازِ درد
فطرتِ عیار و ذہنِ حیلہ جو — عصمتِ کردار رسوا کو بہ کو
مصلحت غارت گری را نام داد — ہر تصور رہنِ اغراض و فساد
با خدا گستاخ و از مذہب گریز — آدمی با آدمی گرمِ ستیز
رُبعِ مسکوں پُر ز شورِ جنگ گشت — لالہ رنگ از خونِ انساں کوہ و دشت
قریہ قریہ گشت ہمچو کارزار — روحِ چنگیز و ہلاکو شرمسار
در کشاکش طاقتِ روس و فرنگ — الاماں از جنگِ روباہ و پلنگ

فتنۂ ابلیس بر اوجِ شباب
از وجودش مشرق و مغرب خراب

تبصرے

God, Soul and Universe in Science and Islam.
از سر محمد یامین خاں ضخامت ۴۴ صفحات ٹائپ جلی قیمت ۸/ پتہ:۔ شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار لاہور۔

اس مختصری کتاب میں لائق مصنف نے پہلے یہ بتایا ہے کہ دوسرے مذاہب میں خدا کا تصور کیا تھا۔ اس کے بعد اس سے بحث کی ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مصنف نے اپنی بحث کی بنیاد سورۂ فاتحہ کی شروع کی تین آیتوں پر رکھی ہے اور "رب العالمین" اور "مالک یوم الدین" پر گفتگو کرتے ہوئے جدید علم فلکیات کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ "عالمین" کتنے ہیں اور کیسے کیسے ہیں؟ ان کی عظمت کا کیا عالم ہے اور حضرتِ انسان کے عالم کو ان عالموں کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ نیز خدا جو ان سب کا رب ہے تو از روئے سائنس اس کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح لفظ "مالک" اور "یوم الدین" کی تشریح و توضیح بھی افکار و نظریاتِ سائنس کی زبان میں کی ہے جو ایک عام قاری کے لئے دلچسپ اور مفید ضرور ہے لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہٗ کا مصداق نہ ہو اور نفس موضوعِ بحث سے غیر متعلق بھی ہو۔ عربی میں علامہ جوہر طنطاوی کی تفسیر بھی اسی انداز پر ہے کتاب کا ایک بڑا حصہ اسی بحث و گفتگو کی نذر ہو گیا ہے۔ اس کے بعد دعا توحید اور روح کے متعلق چند صفحات ہیں جو چند ابواب پر تقسیم ہو گئے ہیں اور پھر آخر کا باب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔ جیسا کہ مصنف نے شروع میں لکھا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب بغیر کسی کتاب کی مدد کے اپنے حافظہ اور معلومات پر بھروسہ کر کے لکھی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر موصوف کو فرصت اور وقت ملے اور وہ اطمینان سے اسلامیات پر کچھ لکھنا چاہیں تو ان میں اس کام کو انگریزی زبان میں انجام دینے کی بڑی اچھی صلاحیت موجود ہے۔

اسلامی نظام | از حکیم محمد اسحٰق صاحب سندیلوی تقطیع خورد ضخامت ۱۰۳ صفحات. کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ رپتہ :- دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن۔

ہر چند کہ یہ کتاب بقیمت کمتر ہے لیکن اس کے بحقیقت بہتر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اس وقت دنیا روز روز کے اجتماعی آفات ومصائب سے تنگ آکر ایک ایسے نظام کی تشنگی شدت سے محسوس کر رہی ہے جو بلا لحاظ رنگ ونسل اور بلا امتیاز ملک ووطن انسانیتِ عامہ کی فلاح وبہبود کا ضامن ہو اور جو رائج ہو کر ان تمام سرمایہ دارانہ، ملوکانہ اور جاگیردارانہ جراثیم کا قلع قمع کر کے رکھدے جنھوں نے اس وقت جدید تہذیب وتمدن کے مسامات سے انسانیت کے جسم میں داخل ہو کر اس کو پرانا ناسور اور انتہا درجہ گندہ ومتعفن بنا دیا ہے۔ اس ضرورت کو ہی محسوس کر کے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

اس میں فاضل مصنف نے پہلے حیات کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک حیاتِ طبعی اور دوسری حیاتِ عقلی۔ پھر دونوں کے خصائص اور لوازم پر گفتگو کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اسلام کے علاوہ اب تک جتنے نظام پیش کئے گئے ہیں وہ سب انسان کی حیاتِ طبعی سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ صرف اسلام کا نظام ایک ایسا ہے جو انسان کی زندگی کو عقلی زندگی بناتا ہے پھر چونکہ ہر نظام کا ایک مرکز ہوتا ہے اس بنا پر ضروری ہے کہ اسلامی نظام کا بھی ایک مرکز ہو اور چونکہ انسان کی خارجی زندگی اس کی فکری زندگی کے مظاہر عمل کا ہی نام ہے اس بنا پر یہ مرکز اولاً تو اس کے افکار کا مرکز ہوگا اور اس کے بعد وہی زندگی کا مرکز ومحور بن جائے گا۔ اسلام نے اس فکری نظام کا مرکز خدا کی ذات کو قرار دیا ہے۔ اس پر گفتگو کرنے کے بعد مصنف نے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ دلنشین پیرایہ میں بتایا ہے کہ توحید کا عقیدہ انسان میں کس قسم کے صفات پیدا کر دیتا ہے اور ان صفات کا ظہور اس کی خارجی زندگی میں کس طرح ہوتا ہے اور وہ اپنے ساتھ کیا کیا برکات لاتا ہے۔ آخر میں موصوف نے نمبر وار ثابت کیا ہے کہ اگر یہ نظام اپنی حقیقی روح کے ساتھ دنیا میں رائج ہو جائے تو بے شبہ اس سے عہدِ حاضر کی تمام اجتماعی مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔ فاضل مصنف اسلامی علوم میں درک وبصیرت رکھنے کے ساتھ عصرِ جدید کے دستوری اور آئینی نظامات اور ان کے اثرات ورجحانات سے بھی باخبر ہیں اس لئے ان کا اندازِ گفتگو

سیاسیات کے جدید طالب علم کے اسلوبِ فکر کے مطابق ہے۔ شروع میں آپ نے اسلامی نظام کو پیش کرتے ہوئے قومیت سے متعلق جو بات کہی ہے وہ نہایت قابلِ قدر ہے اور خود ہمارا اپنا بھی خیال یہی ہے لکھتے ہیں "نہ ہم مسلمانوں کو اس معنیٰ کے لحاظ سے کوئی قوم سمجھتے ہیں جو آج کل دنیا میں قومیت کے معنیٰ لئے جاتے ہیں۔ . . . . بلکہ ہم مسلمانوں کو ایک امت اور جماعت سمجھتے ہیں۔ جو ایک خاص نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کے علمبردار اور مبلغ ہونے کی بنا پر وجود میں آئی ہے اور یہی اس کا مشن ہے" (ص ۵)۔

گورستان | از جناب احسان دانش صاحب۔ تقطیع متوسط ضخامت ۹۸ صفحات طباعت و کتابت عمدہ۔ پتہ :۔ مکتبۂ دانش گنپت روڈ لاہور

جناب احسان دانش کا کلام درد و گداز، سوز و ساز اور غم کی نفسیاتی تشریح و تحلیل کے اعتبار سے یوں ہی مشہور ہے۔ پھر یہ نظم تو موصوف نے اپنی والدہ مرحومہ کے حادثۂ وفات سے متاثر ہو کر لکھی ہے اس بنا پر اس میں جتنا بھی درد ہو کم ہے۔ درد اور سوز و گداز کے علاوہ شاعر نے اس نظم میں زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بڑے دلنشین اور موثر انداز میں بیان کیا ہے جس سے موت کوئی بھیانک اور ڈراؤنی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ شروع میں ڈاکٹر زور، شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور نیاز صاحب فتحپوری وغیرہ کے دلچسپ دیباچے اور تبصرے ہیں۔ اس کی قیمت عہ ہے جو ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے

مقامات | از احسان دانش صاحب تقطیع متوسط کتابت و طباعت عمدہ ضخامت ۲۲۳ صفحات قیمت درج نہیں پتہ :۔ مکتبۂ دانش مزنگ لاہور۔

جناب احسان نے شروع شروع میں شاعرِ مزدور کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس زمانہ میں وہ اکثر و بیشتر نظم ہی لکھتے تھے اور اس کا موضوع عموماً مزدور کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا تھا۔ پھر انھوں نے تغزل کے میدان میں قدم رکھا اور اب "مقامات" میں وہ زیادہ تر اقبالؔ اور کہیں کہیں جوشؔ کے نقشِ قدم پہ چلتے نظر آتے ہیں چنانچہ اس مجموعہ میں پونے دو سو طویل و مختصر نظمیں، غزلیں، قطعات اور رباعیاں وغیرہ ہیں۔ جن کے موضوع اگرچہ مختلف ہیں لیکن سب میں احسان صاحب ایک خاص مفکرانہ انداز لئے ہوئے ہیں بعض جگہ "آورد" کا رنگ ظاہر ہونے لگتا ہے لیکن شاعر اپنی قدرتِ کلام اور رنگینیِ الفاظ کے ذریعہ اسے پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات کامیاب بھی ہو جاتا ہے کلامِ احسان کے شائقین کو اس کا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہئے۔

۱۹۴۲ء۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ
اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ
پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں
عہدِ خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات
صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں
قیمت ہے مجلد ۱۲؍

مسلمانوں کا عروج اور زوال ۔ ۱۲؍

۱۹۴۳ء۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن
پر بے مثل کتاب ۸؍ مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ
ورفتہ ترجمہ قیمت ۸؍

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی معمہ
کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے
تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت
چھ روپئے مجلد سات روپئے۔

خلافتِ بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے
بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات ۳؍ مجلد ۱۲؍

۱۹۴۴ء۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت
جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب۔ اندازِ
بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی
قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔
قیمت ۸؍ مجلد للعہ

۱۹۴۵ء۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن وسنت
کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین
اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ مقامِ عبدیت مع الالوہیت
مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور
اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح
کیا گیا ہے قیمت ۸؍ مجلد ۳؍

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ
کے حالات مبارکہ کا بیان قیمت ۸؍ مجلد ۸؍

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب
صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ۳؍

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنّفین دھلی

(۱) **محسن خاص**:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین**:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین**:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبا**۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱/ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۹ء:۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ۳ؕ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد سہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت :۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳ؕ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہم

۱۹۴۳ء:۔ نبی عربی صلعم ۔ تاریخِ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے ۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن ۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے ۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بیمثل کتاب قیمت عہ مجلد سہ

غلامانِ اسلام :۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد سہ

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق ۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ مجلد سہ

۱۹۴۲ء:۔ قصص القرآن حصہ اول ۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت صہ مجلد سہ

بین الاقوامی سیاسی معلومات :۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحی الٰہی ۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ۳ؕ

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

برہان

جلد ششدہم شمارہ (۳)

مارچ سنہ ۱۹۴۶ء مطابق ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۵ھ

فہرست مضامین

۱- نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۱۳۰
۲- اسلام اور نظام سرمایہ داری جذبۂ اکتناز کی مضرتوں پر ایک نظر	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ	۱۳۳
۳- سلطان محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات	پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ ایم۔ اے	۱۵۴
۴- بیت المقدس پر اجمالی نظر	جناب منشی عبدالقدیر صاحب دہلی	۱۸۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آغاز آفرینش عالم سے لیکر ختم نبوت تک سنتِ الٰہی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جب کبھی کسی قوم نے حق کو یکسر بھلا دیا اور وہ جھوٹ کو سچائی پر، گمراہی کو ہدایت پر، کجروی کو راست کرداری پر ترجیح دینے لگے۔ تو خدا نے اس کی ہدایت کے لئے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے رشد و ہدایت کے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کر کے فکر و عمل کی تاریک دنیا میں حق پرستی و حق شناسی کی شمع فروزاں کردی۔ اس طرح خیر کو اگر شر پر غلبۂ کامل حاصل نہ بھی ہوا تو دونوں میں یک گونہ توازن ضرور قائم ہو گیا اور حق باطل سے ممیز ہو گیا۔

جس طرح ہدایت کی مختلف قسمیں ہیں گمراہی کے مدارج و مراتب بھی مختلف ہیں۔ کوئی ان میں کم درجہ کی گمراہی ہوتی ہے کوئی شدید اور کوئی شدید ترین۔ ایک شخص اگر دہلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ پشاور جانیوالی ٹرین میں بیٹھ گیا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ گمراہ ہے۔ لیکن اس کی یہ گمراہی بہرحال اس شخص کی گمراہی سے کم درجہ کی ہے جو پشاور کو ہی کلکتہ کا دوسرا نام سمجھکر پشاور جا رہا ہے اور اپنی جگہ اس کو یقین کامل ہے کہ وہ اصل منزلِ مقصود کی طرف حرکت کر رہا ہے اس مثال سے واضح کرنا یہ ہے کہ کسی قوم کے لئے کوئی گمراہی اس سے زیادہ شدید نہیں ہو سکتی کہ اس کے عقیدہ و خیال میں زندگی کی قدریں اس طرح بدل جائیں کہ وہ دراصل مضر چیزوں کو اپنے لئے مفید سمجھنے لگے اور زہر ہلاہل کے جام کو شہد و انگبین کا پیالہ جان کر نوش جان کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

آپ قید ملک و وطن سے آزاد ہو کر پورے عالمِ انسانیت پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ تمام دنیا

آج اسی قسم کی سخت ہولناک ترین گمراہی میں مبتلا ہے۔ اخلاقیات کا نظام الٰہی معطل و بے کار ہوگیا ہے اور اس کی جگہ ایک اور ہی قسم کے مادی اندازِ فکر نے لی ہے جو چیزیں انسانیت عامہ کے فطری قانون کے مطابق اب تک بے شرمی و بے حیائی ظلم و سفاکی، درندگی و خونخواری اور عریانی و فحاشی سمجھی جاتی تھیں۔ اب عصرِ حاضر کے انسان نے اپنی تہذیب و تمدن کے لغت میں ان کو شرافت و شائستگی، روشن دماغی و آزاد خیالی اور عالی حوصلگی و وسعتِ مشربی کا نام دیا ہے اس کی نگاہ زندگی کے صرف مادی رخ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اب جب کبھی اس کو اپنے مادی حوائج کی دنیا میں انتشار و بے چینی اور اضطراب و پراگندگی نظر آتی ہے تو اس کے مداوا کے لئے اس کی نگاہیں بیساختہ ایک ایسے نظامِ اقتصادی و معاشی کی طرف اٹھ جاتی ہیں جو اگرچہ اصطلاحاً مذہب نہیں ہے لیکن اس کو جو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے اس نے اس نظام کو عواملِ مذہب سے بھی زیادہ قوی اور مضبوط بنا دیا ہے اور عام رجحان یہی ہوتا جارہا ہے کہ انسانیت کی عام فلاح و بہبود کا ذریعہ اب اگر کوئی ہے تو صرف یہی ایک نظام ہے۔

مذہب، کارل مارکس کی رائے میں افیون کی چسکی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا لیکن اب یہی نظامِ اقتصادی جو کارل مارکس کے فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہے دنیا کی مختلف قوموں کے لئے افیون کی ایک انٹی بن گیا ہے جس طرح ایک ماں اپنے بچہ کو افیون کی گولی کھلا کر سلا دیتی ہے اور اس سے بچہ کا رونا بند ہو جاتا ہے لیکن بچہ کی عام صحت پر اس کا بہرحال برا اثر ہوتا ہے جس کا خیال اس وقت تک نا سمجھ اور معصوم بچہ کو تو کیا ہوتا۔ خود ماں کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا اسی طرح آج کل کی دنیا کے وہ عوام جو بچہ کی طرح اقتصادی بھوک سے بے چین و بیقرار ہو کر چیخ رہے ہیں۔ انھوں نے خود اپنے لئے سوشلزم اور کمیونزم کی چسکی پسند کی ہے اس کا عارضی اثر یہ ضرور ہوگا کہ وہ رونا بند کر دیں گے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ افیون اپنے موجودہ خواص کے ساتھ ان کو اسی طرح دی جاتی رہی اور اس کے ساتھ کوئی بدرقہ شامل نہ کیا گیا تو عام صحت پر اس کا جو مضر اثر ہوگا وہ ان کے لئے کہیں زیادہ مہلک اور خطرناک ہوگا بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ چونکہ اس نظام کے پس پشت ایک عظیم الشان سیاسی طاقت بھی ہے اس بنا پر یہ عالمگیر نفوذ و اثر کے ساتھ پھیل رہا ہے اور مشرق و مغرب کی مختلف قومیں اپنے رنگ و نسل اور طبعی

مزاج کے اختلافات کے باوجود اسے اپنا رہی اور لبیک کہہ رہی ہیں۔

یہ گمراہی تو وہ ہے جو فکر و نظر کی راہ سے آرہی ہے اور جس نے انسان کو مرتبہ انسانیت سے گرا کر محض ایک معاشی حیوان بنا دیا اور اشیاء کے حسن و قبح کا معیار اور انسان کا اندازِ فکر ہی یکسر منقلب کر دیا ہے اس کے علاوہ اب دوسری قسم کی گمراہیوں کا جائزہ لیجئے جو عقیدہ و عمل کی عدم مطابقت سے پیدا ہو رہی ہیں تو صاف نظر آئیگا کہ آج انسانیتِ عامہ جن گمراہیوں میں مبتلا ہے وہ اس کے جسم کو امراضِ مزمنہ کی طرح لگ گئی ہیں اور انھوں نے پورے جسم کو گلا سڑا کر ایک نہایت متعفن اور بدبودار پھوڑے کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ بنگال میں تیس لاکھ انسان فقر و فاقہ سے مر گئے۔ اس حادثہ فاجعہ کا سبب نفع اندوزی اور احتکار ہے جس کو بلا تردد مردم خواری کا دوسرا نام کہا جا سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس جرم کا ارتکاب کیا مادہ پرستوں نے کیا تھا؟ کیا یہ کام ان لوگوں کا تھا جو خدا اور مذہب پر یقین نہیں رکھتے؟ آج عرصۂ ہستی کو کن لوگوں نے اپنی حرص و آز سے جہنم کدۂ آلام و مصائب بنا رکھا ہے؟ کیا یہ سب ان قوموں کا کیا کرایا نہیں ہے جو بہر حال کسی مذہب کی پیرو ہیں۔ اور کسی آسمانی کتاب پر ایمان بھی رکھتی ہیں؟ ان کے علاوہ روزمرہ کی زندگی کا کیا حال ہے؟ گناہ کا وہ کونسا پہلو اور معصیت کی وہ کونسی قسم ہے جو اب عام نہیں؟ اور جس سے ہر ایک طبقہ ہی کم و بیش ملوث نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ صرف یہ نہ دیکھئے کہ مسلمان قوم کا کیا حال رہ؟ بلکہ پوری کائناتِ انسانی کے اخلاقی اور روحانی زوال پر ایک نگاہ ڈالئے تو یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ آج عالمِ انسانیت ان تمام گنہگاریوں میں مبتلا ہے (بلکہ شاید کسی قدر شدت کے ساتھ) جن کی اصلاح کیلئے انبیاءِ کرام فرداً فرداً مختلف قوموں اور ملکوں میں تشریف لاتے رہے ہیں لیکن اب جبکہ نبوت ختم ہو چکی اور اللہ کی آخری کتاب بھی نازل ہو چکی ہے تو قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عالمگیر تباہ حالی اور عام اخلاقی و روحانی بربادی کا علاج کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ آپ جواب دینگے کہ وارثین علومِ نبوت اور قرآن مجید کی نشر و اشاعت کے ذریعہ! ہاں بیشک! بجا ارشاد ہوا! لیکن ابھی آپ کو اس پر غور کرنا ہے کہ ان وارثین علومِ نبوت کے اوصاف کیا ہونے چاہئے اور انھیں اسلام اور قرآن کو کس شکل میں اور کس طرح پیش کرنا چاہئے! اس سلسلہ میں انبیائے کرام کا جو طریق تبلیغ رہا ہے اور انھوں نے اپنی قوم کے مزاجِ طبیعی اور اس کے خواص کو پہچان کر جس طرح کلمۂ حق کو لوگوں تک قابلِ قبول طریقہ پر پہنچایا ہے اس کا بھی آپ کو جائزہ لینا ہوگا۔ چنانچہ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

۴

اسلام اور نظامِ سرمایہ داری

جذبۂ اکتناز کی مضرتوں پر ایک نظر قرآن مجید کی روشنی میں

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲-۱،۲)

(ترجمہ۔ کثرت کی خواہش نے تمہیں غافل کر رکھا حتی کہ تم قبروں میں جا پہنچے)

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد

(۲)

سرمایہ داری بطور سزا ہر چیز ایک حد تک اچھی ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ جائے تو اچھی نہیں رہتی۔ یہی حال دولت کا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے حساب دولت آدمی کو بطور سزا کے دیجاتی ہے روزانہ تجربے کی بات ہے کہ جو تکلیف آرام کے بعد آئے وہ زیادہ روح فرسا ہوتی ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اپنی دعاؤں میں عُسر بعد الیسر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ خداوند کریم جس بندے کو اس کی نافرمانیوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے اُسے دولت میں فراخی دیدیتا ہے تاکہ وہ چند روز خوب عیش کرلے اور خوش ہولے۔ اس کے بعد یک لخت اُسے پکڑ لیتا ہے اور یہ سختی جو خوش حالی کے بعد آتی ہے بےحد تکلیف دہ ہوتی ہے۔ فی الواقعہ یہ درست بات ہے کہ بعض ایسی چیزیں جنھیں حاصل کرکے ہم خوش ہوتے ہیں ہمارے لئے موجب خیر و برکت نہیں ہوتیں۔ اس کا برعکس بھی اسی قیاس پر ہے۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖ فَتَحْنَا	پس جب وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو انھیں
عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰى	دی گئی تھی۔ تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے

اِذَا فَرِحُوا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ	کھول دیئے حتیٰ کہ وہ خوش ہوگئے اس چیز پر جو
بَغْتَۃً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○	انھیں دی گئی۔ پھر پکڑا ہم نے ان کو یک لخت پس
فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا	وہ بالکل ناامید ہوگئے۔ پس کاٹی گئی جڑ اس قوم
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔	کی جو ظلم کرتے تھے اور سب تعریف اللہ کے لئے
(۶-۴۴ و ۴۵)	ہے جو جہانوں کا پروردگار ہے۔

جب آدمی خدا کو بھول جاتا ہے یعنی اُن تعلیمات کو بھول جاتا ہے جو پیغمبروں کے ذریعہ اس تک پہنچیں تو خدا اس کو سزا دینے کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ اس پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ دولت، اولاد، مکان زمینیں۔ نوکر چاکر۔ غرضیکہ ہر طرح کا سامانِ عیش و عشرت اس کو مل جاتا ہے۔ جب وہ اس فراوانی پر خوش ہو جاتا ہے تو یک لخت خدا اسے پکڑ لیتا ہے اور اس فراوانی کے بعد یہ عسرت عذابِ جہنم سے کم نہیں ہوتی۔ خداوند کریم ہر مسلمان کو ایسی پکڑ سے معافی دے اور یقیناً ہم سب پر خدا کی حمد و ثنا واجب ہے کہ اس نے ہم کو اس پکڑ سے محفوظ رکھا ہے والحمد للہ رب العلمین۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ	پس تجھے اچھے نہ لگیں ان کے مال اور نہ ان کی
اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی	اولاد۔ بات یہ ہے کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ ان چیزوں
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ	کے ذریعہ انھیں دنیا کی زندگانی میں عذاب دے
وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (۹-۵۵)	اور وہ کفر کی حالت میں ہی مرجائیں۔

یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ ان سرمایہ داروں کی دولت خیر و برکت کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ دولت ان کی نافرمانیوں کی سزا ہیں انھیں دی گئی ہے تاکہ اسی دولت کے ذریعہ انھیں عذاب دیا جائے اسی سورت میں یہ آیت دوبارہ نمبر (۸۵) پر بھی مکرر موجود ہے۔

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ	اور ناپ کو تول کو کم نہ کرو۔ میں تم کو مالدار
اِنِّیْٓ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ	دیکھتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ تم پر گھیرنے والا

عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ (۱۱-۸۴) عذاب آنے والا ہے۔

یہ قول ہے حضرت شعیب علیہ السلام کا۔ ان کی قوم تجارت کرتی تھی اور تجارت میں بددیانتی کرکے روپیہ اکٹھا کرتی تھی۔ ماپ تول کی کمی میں تجارت کی ہر طرح کی بدعنوانیاں اور بے ایمانی شامل ہیں۔ روزمرہ کے تجربے کی بات ہے کہ سرمایہ دار لوگوں کے پاس جو بے حساب دولت جمع ہوجاتی ہے یہ تجارت کے جائز منافع سے نہیں بلکہ تجارت میں گوناگوں بددیانتیوں سے جمع ہوتی ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کی سرمایہ داری عذاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

سرمایہ داری وجہ بغاوت | رزق کی بیحد وسعت عام طور سے خطرناک ہوتی ہے۔ سرمایہ داروں کو اس حقیقت سے آنکھ بند نہیں کرلینی چاہئے۔ کیونکہ سرمایہ داری کے اندر فساد کا بیج چھپا ہوتا ہے اور رزق کی کشادگی جیسا کہ ہمیں بظاہر نظر آتا ہے۔ عموماً خیر کا موجب نہیں ہوتی۔

وَلَوۡ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَلٰکِنۡ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ۔ اِنَّہٗ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ (۴۲ - ۲۷)

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے رزق کشادہ کرتا تو البتہ وہ دنیا میں سرکشی کرتے لیکن اللہ اتارتا ہے اندازے کے ساتھ جتنا وہ چاہتا ہے یقیناً وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے اور دیکھنے والا ہے۔

جو کچھ خدا جانتا ہے وہ ہم نہیں جانتے وہ اپنے بندوں کی فطرت اور سرشت سے واقف ہے اس لئے رزق میں کشادگی کا نہ ہونا بھی حکمت سے خالی نہیں۔ اس لئے رزق کی تنگی پر شکوہ بھی بیجا ہے۔ یہاں سے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ اندازے سے زیادہ دولت کے اندر ہمیشہ بغاوت اور سرکشی کا بیج موجود ہوتا ہے۔

وَلَوۡلَاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلۡنَا لِمَنۡ یَّکۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُیُوۡتِہِمۡ سُقُفًا مِّنۡ فِضَّۃٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیۡہَا یَظۡہَرُوۡنَ ۙ وَلِبُیُوۡتِہِمۡ اَبۡوَابًا وَّسُرُرًا

اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت ہوجائیں گے تو ہم ان لوگوں کو جو اللہ سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے گھروں کے چھت اور اوپر چڑھنے کی سیڑھیاں چاندی کی بناتے۔ اور ان کے گھروں کے

عَلَیۡهَا یَتَّکِـُٔوۡنَ ۙ وَ زُخۡرُفًا ؕ وَ اِنۡ — دروازے بھی اور تخت جن پر وہ تکیہ کرتے ہیں اور
کُلُّ ذٰلِکَ لَمَّا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا — سونا بھی اور یہ سب کچھ صرف دنیا کی زندگانی کا
وَ الۡاٰخِرَۃُ عِنۡدَ رَبِّکَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۔ — سامان ہے اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک
(۴۳ - ۳۳ تا ۳۵) — صرف پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

ان آیات سے چند در چند نکات نکلتے ہیں۔ (۱) بیحد دولت مندی یعنی سرمایہ داری کافروں کا حصہ ہے۔ مسلمانوں کا نہیں۔ (۲) خدا کفار کو اس سے بھی زیادہ دولت دیتا۔ حتی کہ ان کے گھروں کی چھت۔ دروازے۔ سیڑھیاں اور تخت غرضیکہ سب کچھ چاندی اور سونے کے ہوتے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو کوئی مسلمان نہ رہتا۔ سب کافر ہو جاتے۔ (۳) جیسا کہ شروع مضمون میں لکھا گیا ہے مسلمان بے حد دولت مند اور سرمایہ دار بن ہی نہیں سکتا۔ بشرطیکہ وہ دولت کے حاصل کرنے اور خرچ کرنے میں اسلامی احکام کی پابندی کرے۔ (۴) بیحد دولت کفار کے لئے ہے کیونکہ ان کا اگلے جہان میں کوئی حصہ نہیں۔ (۵) متقی مسلمان کے لئے چونکہ اگلے جہان کی بے حساب نعمتیں موجود ہیں، اس لئے وہ متاعِ حیاتِ دنیا سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

جہاد سے جی چرانا | قرآن مجید سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی کرنے سے گریز کرنے والے اکثر دولت مند لوگ ہی ہوتے ہیں۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ملک اور قوم کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے اور جان و مال کی قربانیاں دینے والے بالعموم غریب لوگ ہیں سرمایہ دار ہمیشہ جہد و جہاد کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ جس سیاسی اور اقتصادی نظام کے اندر وہ سرمایہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو کیونکہ نظام کی ہر تبدیلی میں ان کی سرمایہ داری کے لئے خطرات موجود ہیں۔

وَ اِذَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ اَنۡ اٰمِنُوۡا — اور جب اتاری جاتی ہے کوئی سورت کہ ایمان
بِاللّٰہِ وَ جَاہِدُوۡا مَعَ رَسُوۡلِہِ اسۡتَاۡذَنَکَ — لاؤ اللہ کے ساتھ اور جہاد کرو اس کے رسول کے
اُولُوا الطَّوۡلِ مِنۡہُمۡ وَ قَالُوۡا ذَرۡنَا — ساتھ مل کر تو اجازت مانگتے ہیں تجھ سے ان میں سے

نکن مع القاعدین ہ رضوا بان	دولت مند لوگ اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دو (گھر
یکونوا مع الخوالف وطبع علیٰ	بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ وہ اس بات پر خوش ہیں کہ
قلوبھم فہم لا یفقھون ہ لٰکن	پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہیں۔ ان کے
الرسول والذین اٰمنوا معہ	دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے پس وہ نہیں سمجھتے۔
جاھدوا باموالہم وانفسہم	لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان
واولٰئک لھم الخیرات و	لائے انھوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے
اولٰئک ھم المفلحون۔	ساتھ جہاد کیا اور انہی لوگوں کے لئے خیر و برکت
(۹ - ۸۶ تا ۸۸)	ہے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

جہاد کا حکم آیا تو دولت مند لوگوں نے رسولِ کریمؐ سے کہا کہ ہمیں جہاد پر جانے کے لئے مجبور نہ کیجئے۔ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اپنے گھروں میں رہیں۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ لوگ حقیقتِ حال کو نہیں سمجھتے۔ جس دولت کو وہ بچانا چاہتے ہیں وہ ان کے لئے باعثِ خیر و برکت اور موجبِ فوز و فلاح نہیں ہو سکتی۔ خیرات و برکات تو صرف انہی لوگوں کا حصہ ہے جو اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانیاں دیتے ہیں اور رسول کے ساتھ ہو کر کفار سے جہاد کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان سب کا انکار عام طور سے سرمایہ داروں نے ہی کیا۔ وجہ ظاہر ہے بے اندازہ دولت جمع کرنے کے دو ہی ذریعے ہیں ایک یہ کہ حصولِ دولت میں جائز و ناجائز وسائل میں تمیز نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ زکات و صدقات وغیرہ سے پہلو تہی کی جائے۔ پیغمبر اسی جذبۂ زر اندوزی سے منع کرتے تھے۔ اس لئے سرمایہ دار لوگ ہر زمانے میں نبیوں کی مخالفت کرتے رہے۔ قرآن مجید میں شاید ہی کسی نبی کا ذکر ہو جس میں یہ نہ بتایا گیا ہو کہ دولت مندوں اور سرداروں یعنی سرمایہ داروں نے اس کی پرزور مخالفت کی اور اپنی دولت کے غرور میں ہمیشہ انکار و جحود پر اڑے رہے۔

وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا	اور ہم نے کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ اس
قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ	بستی کے دولت مندوں نے اسے یہ نہ کہا ہو کہ جو
کافرون ٭ وقالوا نحن اکثر اموالا	پیغام تم لائے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں ان
واولادًا وما نحن بمعذبین ٭	لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس مال زیادہ ہے اور
قل ان ربی یبسط الرزق	اولاد بھی۔ ہمیں عذاب نہیں ہوگا۔ انھیں کہو کہ میرا
لمن یشاء ویقدر ولکن اکثر	پروردگار جسے چاہتا ہے رزق میں کشائش کر دیتا ہے
الناس لا یعلمون۔	یا تنگی کرتا ہے لیکن بہت لوگ (حقیقتِ حال کو)
(۳۴ – ۳۴ تا ۳۶)	نہیں سمجھتے۔

سرمایہ داری باعثِ جحود یہاں سے معلوم ہوا کہ تمام انبیا علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے یہی سرمایہ دار تھے۔ انھیں اپنی کثرتِ مال واولاد پر غرور تھا اور انھیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ خدا جس نے ہمیں اتنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ کبھی ہم کو عذاب میں بھی مبتلا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ رزق کی کشادگی یا تنگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے تم حقیقتِ حال کو نہیں سمجھتے نہ خدا کی حکمتوں پر تمہاری نظر ہے۔

واصبر علیٰ ما یقولون واھجرھم	اور صبر کر اس بات پر جو وہ کہتے ہیں اور چھوڑ دے
ھجرًا جمیلا ٭ وذرنی والمکذبین	ان کو چھوڑ دینا اچھا۔ اور چھوڑ دے مجھے اور
اولی النعمۃ ومھلھم قلیلا ٭	ان دولت مند جھٹلانے والوں کو۔ اور ان کو
ان لدینا انکالًا وجحیما ٭ و	تھوڑی سی ڈھیل دے۔ تحقیق ہمارے پاس بیڑیاں
طعامًا ذا غصۃ وعذابًا	ہیں اور جہنم کی آگ۔ اور گلے میں اٹکنے والا کھانا
الیما ٭ (۷۳ – ۱۰ تا ۱۳)	اور درد دینے والا عذاب

یہ خطاب ہے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ان نازونعمت میں پلے ہوئے اور عیش وعشرت میں زندگی بسر کرنے والوں اور آیاتِ خداوندی کے جھٹلانے والوں کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ان کے انکار وجحود کا بدلہ میرے پاس ہے اور ایک دن یہ بدلہ ان کو مل کر رہیگا۔

وکذٰلک جعلنا فی کل قریۃ	اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے لوگوں کو
اکٰبر مجرمیھا لیمکروا فیھا	وہاں کا مجرم بنایا تاکہ وہ اس میں مکر کریں اور وہ
وما یمکرون الا بانفسھم وما	نہیں مکر کرتے مگر اپنی جانوں کے ساتھ۔ اور
یشعرون (۶-۱۲۴)	نہیں سمجھتے۔

یعنی ہمیشہ کافروں کے سردار (یعنی دولت مند لوگ) حیلے نکالتے ہیں۔ تاکہ عوام الناس پیغمبر کے مطیع نہ ہو جائیں جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ سحر کے زور سے سلطنت لیا چاہتا ہے (موضح القرآن)

فلولا کان من القرون من	پس کیوں نہ ہوئے تم سے پہلی امتوں میں صاحب
قبلکم اولوا بقیۃ ینھون عن	شعور لوگ جو ملک میں فساد پھیلانے سے منع
الفساد فی الارض الا قلیلا	کرتے بجز چند آدمیوں کے جنھیں ان میں سے ہم نے
ممن انجینا منھم واتبع الذین	بچا لیا۔ اور ظالم لوگ جو دولت انھیں دی گئی
ظلموا ما اترفوا فیہ وکانوا	اسی کے پیچھے لگے رہے اور جرائم کے خوگر ہوئے
مجرمین (۱۱-۱۱۶)	

سرمایہ داری باعثِ ہلاکتِ قوم اس سے پہلے امم مہلکہ کے قصے بیان ہوئے تو وجہ اس کی یہ ہوئی کہ جو امتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں ان میں ایسے سمجھ دار لوگ نہ ہوئے جو دوسروں کو ملک میں فساد پھیلانے سے منع کرتے۔ بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ان میں سے ہم نے عذاب سے بچا لیا تھا۔ وہ تو البتہ جیسے خود کفر و شرک سے تائب ہو گئے تھے اوروں کو بھی منع کرتے رہے اور انہی دونوں عمل کی برکت سے وہ عذاب سے بچ گئے تھے اور جو لوگ نافرمان تھے وہ اس مال و دولت اور ناز و نعمت کے پیچھے پڑے رہے جو انھیں دی گئی تھی اور اس طرح وہ جرائم کے خوگر ہو گئے (بیان القرآن تھانوی)

اس سے معلوم ہوا کہ قوموں کی تباہی کا باعث ہی سرمایہ دار لوگ تھے۔ ہر نبی کی امت کا جرائم پیشہ طبقہ دولت مندوں کا طبقہ ہی رہا ہے۔

وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا	اور ہم عذاب نہیں کرتے جب تک پیغمبر نہ بھیجیں
واذا اردنا ان نہلک قریۃ	اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک
امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا	کریں تو ہم حکم کرتے ہیں اس کے دولتمندوں کو
فحق علیہا القول فدمرنٰہا	پس وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ پس اس
تدمیرا ہ وکم اھلکنا من	بستی پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے پھر ہم
القرون من بعد نوح۔ وکفی	اس کو ہلاک کرتے ہیں پوری طرح۔ اور ہم نے کتنے
بربک بذنوب عبادہ خبیرًا	قرنوں کو نوح کے بعد ہلاک کیا اور کافی ہے تیرا
بصیرا ہ من کان یرید العاجلۃ	پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا
عجلنا لہٗ فیہا ما نشاء لمن نرید	اور دیکھنے والا۔ جو شخص ارادہ کرتا ہے دنیا (کے مال)
ثم جعلنا لہٗ جہنم یصلہا	کا۔ ہم اس کو جلدی دیتے ہیں دنیا میں جو کچھ چاہتے
مذموما مدحورا ہ ومن	ہیں اور جسے چاہتے ہیں۔ پھر کرتے ہیں ہم اس
اراد الاخرۃ وسعی لہا	کے لئے دوزخ۔ داخل ہوگا اس میں بدحال اور
سعیہا وھو مومن فاولئک	راندہ ہوا۔ اور جو کوئی ارادہ کرتا ہے آخرت کا۔
کان سعیہم مشکورا۔	اور سعی کرتا ہے اس کے لئے جو اس کی سعی ہے اور
(۱۷- ۱۵ تا ۱۹)	ایمان والا بھی ہے۔ پس یہی لوگ ہیں کہ ان کی
	سعی کی قدردانی کی جاتی ہے ۔

یہاں سے بھی ثابت ہوا کہ قوموں کی ہلاکت کا باعث ان کے دولت مند لوگ ہوتے ہیں
ان آیات میں بظاہر یہ مقام بہت مشکل نظر آتا ہے کہ "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو اس بستی کے دولت مند لوگوں کو حکم کرتے ہیں کہ وہ نافرمانی کریں اور جب نافرمانی عام ہو جاتی ہے تو وہ بستی عذاب کی مستوجب ہو جاتی ہے پس ہم اس بستی کو پوری طرح ہلاک کر دیتے ہیں"۔
اسی لئے بعض مفسرین نے امرنا کے معنی کثرنا کئے ہیں۔ یعنی جب ہم کسی قوم کو ہلاک کرنیکا

ارادہ کرتے ہیں تو اس قوم کے دولت مندوں کو تعداد میں اور مال میں بڑھا دیتے ہیں۔ پس جب دولت مندوں کی تعداد زیادہ ہوگئی اور ان کی دولت بھی زیادہ ہوگئی تو وہ نافرمانیاں شروع کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ ہوتا ہے قوم کی ہلاکت۔ اَمَرَ۔ زیادہ ہوگیا یا زیادہ کر دیا کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

لیکن یہ مشکل صرف ظاہری مشکل ہے۔ فی الواقعہ کوئی مشکل نہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اندازِ کلام و خطاب ایک خاص نوع کا ہے چونکہ حقیقت میں ہر فعل ہر عمل۔ ہر خواہش اور ہر ارادے کا خالق خدا ہے اور ان کا فاعلِ حقیقی بھی وہی ہے اس لئے بعض اُن چیزوں کو بھی خدا خود اپنے آپ سے منسوب کرتا ہے جو دوسروں کی ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں بارہا بار خدا نے کہا ہے کہ میں بندوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہوں اور پھر وہ کچھ نہیں سمجھتے اور فسق و فجور میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح بارہا یہ بھی کہا گیا ہے کہ خدا بندوں کو گمراہ کرتا ہے۔ لیکن ہر ایسے موقع پر آپ دیکھیں گے کہ خود قرآن نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ گمراہ کرنا یا دل پر مہر لگا دینا یا کھلی آنکھوں اور کانوں کو اندھا اور بہرا کر دینا یا دلوں کی بیماری کو زیادہ کر دینا خود انسانوں کے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا قانون ہے کہ جو شخص دیدہ و دانستہ برے کام کرے گا۔ اس کے دل کی روشنی کم ہو جائے گی۔ پس اس قانون کے ماتحت جس شخص کا دل سیاہ ہوگا خدا اسے یوں بیان کرے گا کہ میں نے اس کا دل سیاہ کر دیا۔ یا اس کے دل پر مہر لگا دی وغیرہ وغیرہ۔ اس مبحث پر چونکہ ایک مستقل مضمون زیر نظر ہے اس لئے یہاں صرف اشارہ ہی کافی سمجھا گیا۔

ان آیات میں ہی دیکھئے کہ سب سے پہلے یہ بات کہی گئی ہے کہ جب تک ہم رسول نہیں بھیجتے اس وقت تک کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے۔ مطلب یہ ہوا کہ خداوند کریم اپنے بندوں کی اصلاح اور تہذیب کے لئے اپنا پیغام نبیوں کے ذریعہ ان کے پاس بھیجتا ہے۔ نبی لوگوں کو نیکی کا رستہ بتاتے ہیں۔ برے کاموں کے نتائج سے ڈراتے ہیں۔ اور اعمالِ صالحہ کی تعلیم دیتے ہیں — اس کے بعد اگر لوگ جان بوجھ کر عناد تکبر اور تقلید آبا کی وجہ سے نافرمانی کریں تو نتائج کے وہ

خود ذمہ وار ہیں۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا کہ بالعموم نافرمانی کرنے والے دولت مند لوگ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی بیان ہو چکا کہ ان لوگوں کو زیادہ دولت بھی ان کی بداعمالیوں کی سزا کے طور پر دی جاتی ہے۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سرمایہ داروں کے تمام ارادوں اور کوششوں کا منتہائے مقصود سوائے زراندوزی کے اور کچھ نہیں ہوتا وہ خدا سے صرف دولت مانگتے ہیں اور کچھ نہیں مانگتے عاقبت کی طرف سے وہ بالکل بیفکر ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جسے چاہے اور جس قدر چاہے دولت دیدیتا ہے۔ ان لوگوں کا اگلے جہان کی نعمتوں میں کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف جن لوگوں کی نگاہ اگلے جہاں پر ہوتی ہے اور وہ اس کے لئے کوشش بھی کرتے ہیں ان لوگوں کی سعی کو خدا دونوں جہانوں میں مشکور فرماتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ خدا کا قانون ہے کہ

(۱) وہ نافرمان لوگوں کو ان کی نافرمانی کی سزا میں دولت دیتا ہے۔

(۲) وہ دنیا طلب اور عاقبت فراموش لوگوں کو دولت دیتا ہے

(۳) ایسے لوگ اپنی دولت کے غرور میں خدا کو بھول جاتے ہیں اور نافرمانیاں عام ہو جاتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

یہی بات ہے جسے قرآن کی زبان میں یوں کہا گیا ہے کہ جب خدا کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے دولت مند لوگوں کو حکم کرتا ہے اور وہ نافرمانیاں کرتے ہیں اور ان نافرمانیوں کی وجہ سے قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

من کان یرید حرث الاخرۃ نزدلہٗ	جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اسے اس کی
فی حرثہ ومن کان یرید حرث	کھیتی میں زیادہ دیتے ہیں اور جو کوئی دنیا کی کھیتی
الدنیا نوتہ منھا۔ وما لہٗ فی الاخرۃ	چاہتا ہے ہم اس کو اس میں سے دیتے ہیں اور اس
من نصیب۔ (۴۲-۲۰)	کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔

سرمایہ داری باعث عاقبت فراموشی

یہاں سے بھی یہی معلوم ہوا کہ دولتِ دنیا کی زیادتی دنیا طلبی اور عاقبت فراموشی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے سرمایہ دار نعیم عقبیٰ سے محروم ہوتے ہیں جس شخص کی نظر عاقبت پر ہو اس میں جذبہ زراندوزی کا موجود ہونا ممکن ہی نہیں۔

متاعِ ایں جہاں فانی و معیوب نعیمِ آں جہاں باقی و مرغوب
چرا کس دولتِ باقی گزارد بہ نعمتہائے فانی سر درآرد

والذین یؤتون ما اٰتوا وقلوبھم	وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ دیئے گئے اور ان کے
وجلۃ انھم الی ربھم راجعون	دل ڈرتے ہیں اس سے کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف
اولٰئک یسارعون فی الخیرات وھم	پھر جانے والے ہیں۔ یہ لوگ جلدی کرتے ہیں
لھا سٰبقون ۔ ولا نکلف نفساً	بھلائیوں میں اور وہ بھلائیوں کی طرف آگے
الا وسعھا ولدینا کتٰب ینطق	بڑھ جانے والے ہیں اور ہم کسی کو اس کی طاقت
بالحق وھم لا یظلمون ۔ بل	سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے اور ہمارے پاس
قلوبھم فی غمرۃ من ھذا ولھم	کتاب ہے جو سچ سچ بولتی ہے اور ان لوگوں پر
اعمال من دون ذٰلک ھم	ظلم نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے دل اس حقیقت سے
لھا عاملون ۔ حتیٰ اذا اخذنا	غفلت میں ہیں۔ اور ان کے لئے عمل ہیں اس سے
مترفیھم بالعذاب اذا ھم	علاوہ جنھیں وہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب ہم نے
یجئرون ۔ لا تجئروا الیوم	ان کے دولتمندوں کو عذاب میں پکڑا تو اس وقت
انکم منا لا تنصرون ۔	وہ زاری کرتے ہیں۔ آج زاری مت کرو۔ تم کو
(۲۳ - ۶۰ تا ۶۵)	ہم سے مدد نہیں مل سکتی۔

یہاں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا۔ ایک وہ جو جانتے ہیں کہ ایک دن ہم کو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے اس لئے وہ خدا سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو کچھ خدا نے انھیں دیا ہے اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں ایسے لوگ اور بھی بھلائیوں کے کام کرتے ہیں اور بڑھ بڑھ کر۔

دوسرے وہ لوگ جن کے دلوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے وہ خدا کے سامنے حاضر ہونے پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ دوسری طرح کے کام کرتے ہیں نہ بھلائیوں کی طرف دوڑتے ہیں اور نہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں حتی کہ ایک دن ناگہاں ہم ان کے سرمایہ داروں کو عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں اس وقت وہ چیختے چلاتے اور زاری کرتے ہیں لیکن اس وقت زاری کام نہیں دیتی

یہاں سے معلوم ہوا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے سرمایہ دار بن ہی نہیں سکتے۔ یہ طبقہ انہی لوگوں میں ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں زکوٰۃ وصدقات اور دیگر خیرات وغیرہ کے خرچ سے جان چراتے رہتے ہیں۔

زین للذین کفروا الحیوۃ الدنیا	زینت دی گئی کافروں کے لئے دنیا کی زندگانی
ویسخرون من الذین اٰمنوا	اور وہ ٹھٹھے کرتے ہیں ایمان لانے والوں کے
والذین اتقوا فوقھم یوم القیمۃ	ساتھ۔ اور جو لوگ پرہیزگار ہیں وہ ان سے
واللہ یرزق من یشاء بغیر	بالاتر ہوں گے قیامت کے دن۔ اور اللہ رزق
حساب۔ (۲-۲۱۲)	دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ بے شمار۔

اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) کفار کے لئے دنیاوی زندگی کو مزین کیا جاتا ہے اور انھیں دنیوی معاش آراستہ و پیراستہ معلوم ہوتی ہے۔

(۲) دنیا کی زندگی کی ان زینتوں کی وجہ سے کافر غریب مسلمانوں پہ ہنستے ہیں۔ آج بھی تمام روئے زمین پر یہی کچھ ہو رہا ہے۔

(۳) غریب نادار مسلمان ان سرمایہ داروں کے مقابلے میں قیامت کے دن زیادہ خوش وقت ہوں گے کیونکہ انھیں نعیمِ جنت سے حصہ ملے گا اور انھیں عذابِ جہنم سے۔

(۴) دولتِ دنیا کے بل بوتے پر اپنے آپ کو معزز سمجھنا اور غریبوں کو ذلیل سمجھنا حماقت ہے کیونکہ دولت سے عزت نہیں بلکہ ایمان وتقویٰ سے عزت ہے۔ دولت کی تقسیم خدا کے ہاتھ میں ہے

جسے چاہتا ہے بے حساب دیدیتا ہے یہ تقسیم خدا کی حکمت پر مبنی ہے۔

دولتِ دنیا کی ایک بڑی مضرت یہی ہے کہ اس پر مغرور ہوکر آدمی غریب لیکن نیک لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور خداوند تعالیٰ کے احکام کے مقابلے میں تکبر کرتا ہے اور یہ تمسخر اور تکبر آخر الامر اسے تباہ کر دیتا ہے۔

سرمایہ داری باعثِ تکذیب رسالت جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانے میں یہی دولت مند سرمایہ دار رئیس سردار اور اشراف لوگ تھے جنھوں نے رسالت کی تکذیب کی۔ احکامِ خداوندی کے ساتھ تکبر سے پیش آئے۔ ہر سیاسی سماجی مذہبی اور اخلاقی اصلاح کے رستے میں روڑے اٹکائے اور آخر کار قوموں اور ملکوں کی بربادی کا باعث بنے۔ آج بھی یہ لوگ یہی کچھ کر رہے ہیں۔

وکذلک ما ارسلنا من قبلک فی	اور اسی طرح جب کبھی ہم نے کسی بستی میں تجھ سے پہلے
قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا	کوئی پیغمبر بھیجا تو وہاں کے دولت مندوں نے اسی
انا وجدنا اباءنا علیٰ امۃ وانا	کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رستے پر پایا اور
علیٰ اثرھم مقتدون ۰ قال	ہم انہیں کے نقشِ قدم پر چلیں گے پیغمبر نے جواب
اولو جئتکم باھدیٰ مما وجدتم	دیا کہ جس رستے پر تمہارے باپ دادا تھے اس سے
علیہ اباءکم۔ قالوا انا بما ارسلتم	بہتر رستہ اگر میں تمہیں بتاؤں (تو پھر؟) انھوں نے
بہ کافرون۔ فانتقمنا منھم	کہا کہ (پھر بھی) جو پیغام تم لائے ہو ہم اس سے منکر
فانظر کیف کان عاقبۃ	ہیں۔ پس ہم نے ان لوگوں سے بدلہ لیا اور تو دیکھ
المکذبین۔ (۴۳ - ۲۳ تا ۲۵)	کہ ان جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھٹلانے والے دولت مند لوگ تھے۔

(۲) اسی طرح آنحضرتؐ سے پہلے بھی جتنے نبی آئے ان کی تکذیب بھی انہی سرمایہ دار لوگوں نے کی۔

(۳) سرمایہ دار لوگ اپنے باپ دادا کے رستے سے ہٹنا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اسی رستے کی بدولت

وہ سرمایہ دار بنے ہوئے تھے اور دوسرا رستہ اختیار کرنے میں سرمایہ داری سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔

(۴) یہ لوگ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ نبی کا بتایا ہوا رستہ ان کے آبا واجداد کے رستے سے صحیح تر ہے نبی کی تکذیب پر قائم رہے۔ کیونکہ وہ اپنی سرمایہ داری چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

(۵) عاقبت الامر انہی سرمایہ داروں کی وجہ سے قوم ہلاک ہوئی۔

وقال الکفرون ھذا ساحر کذاب	اور کافروں نے کہا یہ تو کوئی جھوٹا جادوگر ہے
اجعل الآلھۃ الٰھا واحدا۔ ان ھٰذا	اس نے تو سب معبودوں کو ایک معبود بنا ڈالا
لشیٔ عجاب۔ وانطلق الملاء منھم	یقیناً یہ بڑے تعجب کی بات ہے اور ان کے سردار
ان امشوا واصبروا علیٰ الھتکم	یہ کہتے ہوئے چلے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر قائم
ان ھٰذا الشیٔ یراد (۳۸-۴ تا ۶)	رہو۔ یقیناً اس شخص کا کوئی خاص ارادہ ہے۔

نبی کے معجزوں کو جادوگری بتایا، نبی کو جھوٹا کہا اور سرداروں (یعنی سرمایہ دار دولت مندوں) نے اپنے لوگوں کو کہا کہ چلو اس شخص کے پاس مت ٹھہرو ورنہ اس کی باتیں سنو۔ یہ شخص یقیناً کسی مقصد کے لئے یہ باتیں بنا رہا ہے۔ یعنی اس کا ارادہ ہے کہ ہم لوگوں کی جگہ یہ خود سرمایہ دار رئیس بن جائے۔

قال یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من	اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس
الٰہ غیرہ۔ افلا تتقون ٥ قال	کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں۔ کیا تم نہیں ڈرتے
الملاءُ الذین کفروا من قومہ انا	اس کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا کہ
لنرٰک فی سفاھۃ وانا لنظنک	ہم تجھے بیوقوفی میں دیکھتے ہیں اور ہم خیال کرتے
من الکاذبین ٥ (۷-۶۵ و ۶۶)	ہیں کہ تو جھوٹا ہے۔

یہ حضرت ہود علیہ السلام کا قصہ ہے۔ جب انھوں نے قوم عاد میں توحید کی تبلیغ شروع کی تو کافر سرداروں (یعنی سرمایہ داروں) نے آپ کی تکذیب کی اور انھیں کہا کہ (نعوذ باللہ) آپ بیوقوف ہیں اور جھوٹے۔

قال الملأ الذين استكبروا من	اس کی قوم کے سرداروں نے جو تکبر کرتے تھے
قومه للذين استضعفوا لمن آمن	ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور ناتوان گنے
منهم اتعلمون ان صٰلحا مرسل	جاتے تھے کہا کیا تمہیں یقین ہے کہ صالحؑ اپنے
من ربه - قالوا انا بما ارسل به	پروردگار کی طرف سے بھیجا ہوا ہے انھوں نے
مومنون ۵ قال الذين استكبروا	جواب دیا کہ ہم اس کی رسالت پر ایمان لائے ہیں
انا بالذی آمنتم به کافرون	تکبر کرنے والوں نے کہا کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو
(۷ - ۷۵ و ۷۶)	ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہ قصہ ہے صالح علیہ السلام کا۔ جو قوم ثمود پر مبعوث ہوئے تھے۔ یہاں سے بھی دو باتوں کا پتہ ملتا ہے۔ ایک یہ کہ سرمایہ دار لوگ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتے ہیں اور غریب ناتوان لوگ نبیوں پر ایمان لانے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ دوسری یہ کہ سرمایہ دار لوگ غریب مسلمانوں پر ہنستے ہیں اور انھیں تمسخر کے رُو سے کہتے ہیں کہ اچھا تمہیں یقین ہو چکا کہ یہ سچا نبی ہے اور اسے خدا نے بھیجا ہے۔ لو اگر تمہارا اس پر ایمان ہے تو ہم اس سے منکر ہیں۔

قال الملا الذين استكبروا من	اس کی قوم کے سرداروں نے جو تکبر کرتے تھے
قومه لنخرجنك يا شعيب والذين	کہا کہ اے شعیب ہم تجھے اور تجھ پر ایمان لانے
آمنوا معك من قريتنا او	والوں کو اپنی بستی سے نکال دینگے یا تم ہمارے
لتعودن فی ملتنا۔ قال اولو	مذہب میں واپس آجاؤ گے شعیب نے کہا کہ اگر
كنا كارهين ۵ (۷-۸۸)	ہم واپس نہ آنا چاہیں (تو بھی؟)

یہ قصہ شعیب علیہ السلام کا ہے جو مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آپ کی قوم کے لوگ تجارت میں خرید و فروخت کے وقت ناپ تول میں بے ایمانی کیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے انھیں اس سے منع کیا۔ تو سرمایہ دار لوگ جو اس بے ایمانی کے ذریعے زراندوزی کیا کرتے تھے آپ کو شہر بدر کرنے پر تیار ہو گئے۔

یہاں بھی آپ نے دیکھ لیا کہ جذبہ زراندوزی ہی ان کم بختوں کو ایمان سے مانع ہوا اور اسی جذبے کے ماتحت وہ تکذیبِ رسالت پر اتر آئے ورنہ بات بالکل سیدھی سادی تھی۔

قال الملأ من قوم فرعون ان	قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ یہ بڑا
هذا لسحر عليم ه يريد ان	علم والا جادوگر ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ تم
يخرجكم من ارضكم فماذا	کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ پس تم کیا
تامرون ٥ (٧-٩-١٠ و١١)	حکم دیتے ہو۔

فرعون کی قوم نے جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے معجزاتِ عصا و یدِ بیضا دیکھے تو سردار لوگ فوراً بول اٹھے کہ یہ تو کوئی بڑا لائق جادوگر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہیں اپنی جادوگری سے مرعوب کر کے تمہارا ملک حاصل کرنا چاہتا ہے۔

یہاں بھی سرمایہ داروں نے جو ملک پر حکومت کر رہے تھے اپنی سرمایہ داری اور سرداری کو خطرے میں دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے انکار کیا اور انھیں جادوگر ٹھہرایا۔

قال الملأ الذين كفروا من قومه	پس اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ
ما نرىك الا بشرا مثلنا وما نرىك	ہم تجھ کو اپنی طرح کا آدمی دیکھتے ہیں اور دیکھتے
اتبعك الا الذين هم اراذلنا	ہیں کہ سوائے ہمارے رذیل اور ظاہری سمجھ والے
بادی الرای - وما نرى لكم علينا	لوگوں کے اور کسی نے تیری پیروی نہیں کی اور ہمیں
من فضل بل نظنكم كاذبين	اپنے اوپر تمہاری کوئی بڑائی نظر نہیں آتی بلکہ ہم
(۱۱-۲۷)	تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ ہے۔ یہاں بھی سرمایہ داروں نے ہی نبوت کا انکار کیا اور ان غریب لوگوں کو جو حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ رذیل اور کم سمجھ بتایا۔

غریبوں کو رذیل سمجھنے والی ذہنیت ہی دولت مند لوگوں کی بربادی کا باعث بنتی ہے۔

ويصنع الفلك - وكلما مر عليه	اور نوحؑ کشتی بناتا تھا اور جب اس کی قوم کے

ملأ من قومه سخروا منه قال	سردار اس کے پاس سے گذرتے تو اس سے ٹھٹھے
ان تسخروا منا فانا نسخر منکم	کرتے۔ نوح نے کہا اگر تم ہم سے ٹھٹھے کرتے ہو
کما تسخرون ۰ (۱۱ - ۳۸)	تو ہم بھی اسی طرح تم سے (ایک دن) ٹھٹھے کریں گے

سرمایہ دار لوگ ہمیشہ اپنی دولت کے غرور سے پیغمبروں کی ہنسی اڑاتے رہے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سردار ٹھٹھے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ نہ نزدیک دریا ہے نہ سمندر اور یہ عقلمند آدمی کشتی بنا رہا ہے۔

فقال الملؤ الذین کفروا من	اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا۔ یہ تو
قومہ ما ھذا الا بشر مثلکم یرید	تمہاری طرح کا ایک آدمی ہے۔ یہ تم پر بڑائی
ان یتفضل علیکم (۲۳ - ۲۴)	حاصل کرنا چاہتا ہے۔

یہ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے یہاں بھی قوم کے سرداروں نے اپنی سرداری اور سرمایہ داری کو خطرے میں دیکھا اور خیال کیا کہ شاید یہ آدمی خود سردار اور سرمایہ دار بننا چاہتا ہے۔

وقال موسیٰ ربنا انک اتیت	اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار۔ تو نے
فرعون وملاہ زینۃ واموالا فی	فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگانی
الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن	میں آرائش اور اموال دیئے کہ لوگوں کو تیری راہ
سبیلک ربنا اطمس علی اموالھم	سے گمراہ کریں۔ اے ہمارے پروردگار میٹ
واشدد علی قلوبھم فلا یؤمنوا	ڈال ان کے مالوں کو اور ان کے دلوں کو
حتی یروا العذاب الالیم	سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں حتی کہ دردناک
(۱۰ - ۸۸)	عذاب دیکھیں۔

معلوم ہوا کہ یہی سرمایہ دار لوگ دنیاوی زیب و زینت اور مال و متاع پر مغرور ہو کر نہ صرف خود گمراہ ہوتے ہیں بلکہ اور لوگوں کو بھی اپنی دولت کے ذریعے راہِ حق سے گمراہ کرتے ہیں۔

آج بھی یہی سرمایہ دار سردار اپنی دولت کے ذریعہ دنیا والوں کو راہِ راست پر آنے سے روک رہے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں قوم اور ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔

وقال الملا من قومہ الذین کفروا | اور اس کی قوم کے کافر سرداروں نے جو قیامت
وکذبوا بلقاء الاخرۃ واترفنٰھم | کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور جنھیں ہم نے دنیا
فی الحیوۃ الدنیا ماھذا الا | کی زندگانی میں دولت دی تھی۔ کہا کہ یہ تو تم
بشر مثلکم یاکل مما تاکلون | جیسا ہی ایک آدمی ہے اور وہی کچھ کھاتا پیتا ہے
ویشرب مما تشربون۔ | جو تم کھاتے پیتے ہو۔

یہاں بھی وہی سرمایہ دار سردار جنھیں اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے لوگوں کو یہ کہکر گمراہ کر رہے ہیں کہ یہ شخص پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے یہ تو ہماری طرح کا ہی ایک انسان ہے، ہماری طرح ہی کھاتا پیتا اور رہتا سہتا ہے۔

غریبوں کی گمراہی کا باعث۔ دولت مند لوگ صرف خود ہی بدراہ نہیں ہوتے بلکہ ان کی دیکھا دیکھی غریب آدمی بھی بے دین ہو جاتے ہیں۔

وقالوا ربنا انا اطعنا سادتنا | اور انھوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے
وکبراء نا فاضلونا السبیلا۔ | سرداروں اور بڑوں کی فرماں برداری کی۔ پس
(۳۳ - ۶۷) | انھوں نے ہم کو راہ سے گمراہ کر دیا۔

یہ عوام کی معذرت ہے جو وہ قیامت کے دن کے عذاب دیکھکر کریں گے اور کہیں گے کہ افسوس ہم نے خدا کی اور خدا کے رسول کی فرمانبرداری نہ کی اور ان بڑے بڑے سرمایہ دار سرداروں کی اطاعت کی۔

یقول الذین استضعفوا | کہیں گے وہ لوگ جو ناتوان گنے جاتے تھے ان
للذین استکبروا لولا انتم | لوگوں کو جو تکبر کرتے تھے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم
لکنا مؤمنین (۳۴-۳۱) | ایمان لے آتے۔

معلوم ہوا کہ یہی تکبر کرنے والے تونگر نا تواں لوگوں کی گمراہی کا باعث بنے۔

سرمایہ دار دوزخی قرآن مجید میں اکثر ایسے مقامات پر جہاں دوزخیوں کا مذکور ہے وہاں ان کے

دولت مند ہونے کا ذکر بھی ہے۔

ذرنی ومن خلقت وحیداً ہ و	چھوڑ مجھ کو اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا
جعلت لہٗ مالاً ممدوداً ہ وبنین	کیا۔ اور دیا اس کو پھیلا ہوا مال اور حاضر رہنے
شھوداً ہ ومھدت لہٗ تمھیداً ہ	والے بیٹے اور اس کے لئے بچھونا بچھایا۔ پھر یہ
ثم یطمع ان ازید ہ کلا انہ	طمع کرتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں
کان لاٰیٰتنا عنیداً ہ سارھقہٗ	یہ ہماری نشانیوں سے عناد کرنے والا ہے اسے
صعوداً۔ (۷۴۔ ۱۱ تا ۱۷)	میں صعود پر چڑھاؤں گا۔

یہ دوزخی دولتمند شخص ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے پھیلا ہوا مال دیا۔ یعنی سرمایہ دار بنایا اور یہ ہمیشہ زیادتی کی خواہش کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے اسے میرے لئے چھوڑ دو۔ میں اس منکر کو دوزخ کی پہاڑی پر چڑھاؤں گا۔ یہ ہمیشہ اپنی دولت کے غرور میں آیاتِ الٰہی کا انکار کرتا رہا۔

واصحٰب الشمال ما اصحٰب الشمال	اور بائیں طرف والے۔ کون ہیں بائیں طرف والے
فی سموم وحمیم وظل من یحموم	گرم ہواؤں اور گرم پانی میں اور دھوئیں کے
لا بارد ولا کریم ہ انھم کانوا قبل	سایہ میں جو نہ ٹھنڈا ہے نہ حرمت والا۔ تحقیق
ذٰلک مترفین (۵۶۔ ۴۱ تا ۴۵)	یہ پہلے نازپروردہ دولتمند تھے۔۔

یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ اصحاب الشمال کی اکثریت الٰہی نعمتوں میں پلے ہوئے سرمایہ داروں کی ہوگی۔

ما اغنیٰ عنی مالیہ۔ ھلک عنی	میرا مال مجھے کام نہ آیا۔ مجھ سے میرا جاہ و جلال
سلطٰنیہ (۶۹۔ ۲۸ و ۲۹)	جاتا رہا۔

یہ دوزخی کا قول ہے۔ ماقبل ومابعد کی آیات کا مضمون یہ ہے " اور جس کا اعمالنامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا وہ کہے گا اے کاش مجھے اعمال نامہ نہ دیا جاتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش کہ موت قصہ ہی تمام کر دیتی۔ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا۔ جاہ وحشمت مجھ سے چھین لئے گئے (حکم ہو گا کہ) اسے پکڑو اور طوق پہناؤ۔ پھر اسے دوزخ میں لے جاؤ۔۔۔

یہ آدمی اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی رغبت نہیں دلاتا تھا (نہ خود کھلاتا تھا) آج یہاں اس کا کوئی دوست نہیں۔"

یہ یاد رہے کہ اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ صرف انہی دولت مندوں کے متعلق ہے جو زکات و صدقات نہیں دیتے اور نہ مسکینوں کی پرورش کرتے ہیں جیسا کہ ان آیات سے بھی ظاہر ہے۔

تدعوا من ادبر وتولّٰی ۝ وجمع	(دوزخ کی آگ) بلاتی ہے اس شخص کو جس نے
فاوعٰی ۝ انّ الانسان خلق	پیٹھ دی اور منہ پھیر لیا۔ مال جمع کیا اور بند رکھا
ھلوعا ۝ اذا مسہُ الشرّ جزوعا	تحقیق آدمی بے صبر پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے
واذا مسہ الخیر منوعا ۝	برائی ملتی ہے تو اضطراب کرتا ہے اور جب
الّا المصلّین ۝ الذین ھم علٰی	بھلائی ملتی ہے تو بخل کرتا ہے مگر وہ نمازی جو
صلاتھم دائمون ۝ والذین	اپنی نماز پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور وہ لوگ
فی اموالھم حقٌ معلوم ۝ للسّائل	جن کے مالوں میں سائل اور محروم کے لئے حصہ
والمحروم (۷۰- ۱۷ تا ۲۵)	مقرر ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ جو مال جمع کرتے رہتے ہیں اور اس میں سے زکات و صدقات وغیرہ نہیں دیتے، دوزخ کی آگ کا ایندھن بنیں گے۔ انسان فطرتاً ہی بے حوصلہ ہے۔ جب بدحال ہوتا ہے تو چیختا چلاتا ہے اور جب اسے خوش حالی دی جاتی ہے تو کنجوس بن جاتا ہے البتہ وہ لوگ اس وعید سے مستثنیٰ ہیں جو نماز کے پابند ہیں اور جن کے مالوں میں غریبوں اور مسکینوں کا حصہ ہوتا ہے۔

وما نقموا الّا ان اغنٰھم اللہ	اور یہ انھوں نے صرف اس بات کا بدلہ دیا
ورسولہٗ من فضلہ	ہے کہ ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے
(۹- ۷۴)	رزقِ خداوندی سے مالدار کر دیا۔

یہ ان منافقین کا قصہ ہے جو دین کی مخالفت میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے مشورے کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں نے ان کو اپنے فضل سے دولتمند بنایا۔

یہ اس نعمت کا بدلہ دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے بدلے دولت مند لوگ ہی دیا کرتے ہیں۔

عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ دار لوگ جو دن بھر روپیہ جمع کرنے اور رات بھر روپیہ گننے میں لگے رہتے ہیں۔ اطمینان قلب سے قطعاً محروم ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات میں اسی حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

ویلٌ لکل ھمزۃٍ لمزۃ ۰ الذی	افسوس ہے ہر عیب نکالنے والے غیبت کرنے والے
جمع مالاً وعددہ ۰ یحسب ان	پر جس نے جمع کیا مال اور اسے گنتا رہا خیال
مالہ اخلدہ ۰ کلا لینبذن	کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ رہیگا۔ ہرگز نہیں بلکہ
فی الحطمۃ ۰ وما ادرٰک ما الحطمۃ	ڈالا جائیگا حطمہ میں اور تو کیا جانے حطمہ کیا ہے
نار اللہ الموقدۃ ۰ التی تطلع	اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے۔ جو دلوں پر چڑھ
علی الافئدۃ ۰ (۱۰۴۔ ۱تا۷)	آتی ہے۔

دوزخ میں تو یہ آگ دولت مندوں کے دلوں پر جو عذاب لائے گی وہ دور کی بات ہی۔ لیکن دنیا میں ان لوگوں کے دل فی الواقعہ آٹھ پہر جلتے رہتے ہیں۔ خداوند کریم ایسے بے برکت مال سے ہر مسلمان کو بچائے آمین۔

یہ بات پہلے بھی کئی بار لکھی جا چکی ہے کہ مندرجہ بالا تمام وعید صرف ان سرمایہ دار لوگوں کے متعلق ہیں جو اپنے اموال سے خدا کا حصہ نہیں نکالتے اور جو جذبۂ زراندوزی میں خدا کو اور روز جزا کو بھول جاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا ایسی دولت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ جو جائز ذرائع سے حاصل کی جائے اور جس میں سے زکات اور صدقات وغیرہ پورے پورے ادا کردیئے جائیں۔

برہان کے چند نمبروں کی ضرورت

دفتر کو مارچ ۱۹۴۲ء اور جون ۱۹۴۲ء کے پرچوں کی ضرورت ہے جو صاحب فروخت کرنا چاہیں مطلع فرمائیں، ان کی خدمت میں قیمت پیش کردی جائے گی۔

سلطان محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات

از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم اے

سلطان محمد بن تغلق ان عظیم المرتبت سلاطین میں سے ہے جن پر کسی ملک کی تاریخ کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ جمشیدی و کیخسروی تو اس کی سرشت میں تھی[1] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

"جامہ جہانبانی و قبارِ جہانداری بر قد و قامتِ او دوختہ بود، یا اورنگ سلطنت و تختِ بادشاہی از برائے جلوس او در آفرینش آمدہ" [2]

مورخوں نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں اگر ارسطو، نظام الملک طوسی یا احمد حسن زندہ ہوتے تو اس کی صلاحیتِ جہانبانی کو دیکھکر حیرت میں رہ جاتے[3]۔ علم و فضل، شجاعت و شہامت، فہم و ذکاوت، سلیقۂ جہانداری، انصاف پروری و عدل گستری، بلند ہمتی و عالی حوصلگی، شہسواری و صف شکنی۔ غرض جس اعتبار سے دیکھئے سلطان ایک ممتاز شخصیت کا حامل نظر آتا تھا۔ ان فضائل و محاسن کے باوجود اگر وہ ناکام رہا تو یہ اس کی خطا نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری عوام کی اس پست ذہنیت پر ہے جو اس کے تابناک تخیل کا ساتھ نہ دے سکی۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اُسے غلط سمجھا اور اس سے کہیں زیادہ مورخوں نے مسخ کیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کے عہدِ حکومت کے حالات ان متعصب مورخوں کے ہاتھوں سے لکھے گئے جو اس کے مذہبی افکار و رجحانات سے

---

[1] "تاریخ فیروز شاہی" ضیاء الدین برنی ص ۴۵۷ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۸۶۲ء ایڈیشن)
[2] ایضاً ص ۴۵۸ [3] ایضاً ص ۴۶۲۔

بنیادی اختلاف رکھتے تھے [۱]۔ چنانچہ انھوں نے اس قدر رنگ آمیزی کی کہ اس کے اصلی خط وخال ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ محاسن، معائب میں بدل گئے اور مظالم کا شہرہ اس بلند آہنگی سے کیا گیا کہ اس کا نام سنتے ہی نظروں کے سامنے ایک ایسی تصویر پھرنے لگی جس کے چہرہ کے گرد، آگ اور خون کا ہالہ رقص کرتا تھا [۲]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس کے افکار و اعمال کا صحیح جائزہ نہ لے سکے۔ لیکن جوں جوں تاریخی تحقیقات اور انکشافات میں ترقی ہوگی۔ محمد بن تغلق کے کارنامے صحیح تاریخی پس منظر کے ساتھ ہمارے سامنے آجائیں گے اور ہم اس کی عظمت اور بلندی کا صحیح اندازہ کرسکیں گے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مذہبی معاملات میں ندرتِ فکر و عمل کو بہت کم برداشت کیا گیا ہے۔ جو لوگ حریتِ فکر و ضمیر کے ساتھ مذہب کے مطالعہ کی کوشش کرتے ہیں ان کو سب و شتم کے ایک سیلاب کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ محمد بن تغلق کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ علماء اس سے برافروختہ ہوگئے۔ قاضیوں نے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ بعضوں نے

---

[۱] محمد بن تغلق کے تین معاصر مورخ ہیں۔ برنی۔ ابن بطوطہ۔ عصامی۔

برنی کو فلسفہ سے نفرت تھی۔ سلطان پر فلسفہ کا پورا اثر تھا اس لئے برنی کو سلطان سے بھی ایک خاص نفرت پیدا ہوگئی تھی۔

ابن بطوطہ قاضی تھا۔ عصامی نے لکھا ہے کہ سلطنت کے قاضیوں نے سلطان کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا تھا۔ ممکن نہیں کہ ابن بطوطہ اس سے متاثر نہ ہوا ہو (ا) اس نے اپنی قید کا حال لکھا ہے ممکن ہے یہ اسی کی وجہ سے ہو۔ (ب) قید سے رہا ہونے کے بعد ابن بطوطہ نے باوجود اصرار سلطان کی ملازمت نہیں کی۔ (س) معبر میں ابن بطوطہ نے جلال الدین احسان شاہ کی بیوی کی بہن سے شادی کی۔ جلال الدین، سلطان کے نہایت مشہور اور کامیاب باغیوں میں سے تھا ــــ ان سب اثرات نے ابن بطوطہ کو سلطان کا بے حد مخالف بنادیا تھا۔

عصامی کا جہاں تک تعلق ہے اس کا رجحان اس سے ظاہر ہے کہ اس نے اپنی کتاب فتوح السلاطین سلطان علاء الدین حسن، بانیٔ حکومت بہمنی کے نام معنون کی ہے۔ علاء الدین کی بغاوت کو جائز ثابت کرنے کے لئے وہ سلطان محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات پر خوب اعتراضات کرتا ہے اور الحاد و زندقہ کا الزام لگاتا ہے۔

[۲] تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی ص ۴۶۰

اُسے کافر اور ملحد کہا۔[۱] عوام ایک طرف تو مذہبی حلقہ کی اس مخالفت سے متاثر ہوئے دوسرے اس کی نئی اسکیموں کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیل گئی۔ لوگ ایک سانس میں اس کے تبحر علمی اور سیرت کی تعریف کرتے تھے اور دوسرے ہی سانس میں مذہبی طبقہ سے سختی پر اظہارِ غم و ناراضگی کرتے تھے۔ ان متضاد کیفیات کے باعث معاصرین سلطان کا صحیح کیرکٹر نہ سمجھ سکے اور وہ ان کی نظروں میں ایک معمہ اور عجوبہ روزگار بن کر رہ گیا۔

عقلیت پسندی سلطان محمد بن تغلق عقلیت پسند مسلمان تھا۔ اس نے مذہب کا مطالعہ فلسفہ اور منطق کی روشنی میں کیا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا ــــ

"حق منحصر در عقلیات است و از نقلیات آنچہ موافق عقلہا بودے قبول نمودے ونقلیات صرف را قبول نہ داشتے۔"[۲]

مذہب کا اس تنقیدی انداز میں مطالعہ چودھویں صدی کے ہندوستان میں کیونکر قبول ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عوام میں اس کے مذہبی رجحانات کے خلاف ایک عام جذبہ پیدا ہوگیا۔ برنی، جس کو فلسفہ اور علوم عقلی سے سخت نفرت تھی[۳] سلطان کی اس عقلیت پسندی کی جگہ جگہ مذمت کرتا ہے ایک جگہ لکھتا ہے۔

"معقولات فلاسفہ کہ مایہ قساوت و سنگدلی است تمامی دل او را گرفتہ بود و منقولات کتب سماوی و احادیث انبیاء را کہ معدنِ رقت و مسکینت و خوف عقاب گوناگوں عقوبت است در خاطرش مدخلے نماندہ بود۔"[۴]

اس بے راہ روی کی وجہ برنی نے یہ بتائی ہے کہ ابتدائی زمانہ میں محمد بن تغلق کو چند ایسے لوگوں کی صحبت ملی تھی جو "بداعتقاد" اور "فلسفی" تھے۔ ان کا اثر سلطان کے دل و دماغ نے

---

[۱] فتوح السلاطین۔ عصامی۔ (قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری نمبر ۸۹۵) ص ۲۷۹ (الف) بحوالہ ڈاکٹر مہدی حسین ص ۱۷۴۔
[۲] طبقات اکبری۔ از مولانا نظام الدین احمد ص ۱۰۰ (مطبوعہ لکھنؤ)
[۳] "ضیاء الدین برنی" - از مسٹر حسن برنی۔ ص ۱۴۔ (مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی)۔
[۴] تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی۔ ص ۴۶۵۔ (مطبوعہ کلکتہ)

بہت جلد قبول کرلیا اور اس کے ذہنی محرکات فلسفہ کے تابع ہوگئے۔ کہتا ہے۔

"بہ سعد منطقی بدمذہب، وعبید شاعر بداعتقاد، ونجم انتشار فلسفی صحبت ومجالست افتاد وآمد وشد مولانا علیم الدین کہ اعلم فلاسفہ بود، درخلوت اوبسیار شد وآں ناجوانمرداں کہ مستغرق ومبتلا ومعتقد معقولات بودند۔ ۔ ۔ علم معقولات را۔ ۔ ۔ ۔ درخاطر سلطان محمد چناں بنشاندند کہ منقولات کتب سماوی واحادیث انبیا کہ عمدۂ ایمان وستون اسلام ومعدن مسلمانی ومنبع نجات ودرجات است چنانچہ باید وشاید جائے نماند۔ ۔ ۔ ۔ "[۵۱]

محمد بن تغلق کی خود نوشت سوانح عمری کے جو چند اوراق دستیاب ہوئے ہیں[۵۲] ان سے سلطان کی مذہبی زندگی کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہوگئے ہیں۔ اس کی علمی تحقیقات میں دلچسپی، علماء کی زمانہ سازی، فلاسفروں سے میل جول، الحاد وبے دینی کے خیالات کا پیدا ہونا اور پھر خیالات کا درست ہونا۔ یہ سب باتیں ان مختصر سے صفحات میں موجود ہیں۔ لکھتا ہے۔

"چوں مردم بالطبع طالب علم اند نفس بے طلب علم قرار نمی یافت"

اس فطرتی میلان نے تحقیقاتِ علمی کی طرف رجوع کردیا۔ طلبِ علم میں جب قدم اٹھایا تو سب سے پہلے جس طبقہ سے واسطہ پڑا وہ فلاسفہ کا تھا خود کہتا ہے۔

"اتفاقاً باطائفہ از متفلسفہ برظن آنکہ محق اند محافظت افتاد"

ان لوگوں کی صحبت اور میل جول سے تلاش وتحقیق کی جس منزل پر پہنچا وہ یہ تھی

"از گفتارِ ایشاں مقدماتے دردل جائے گرفت چوں مقدار مغالطات بسیار گشت

---

۵۱ تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی ص ۴۶۵۔

۵۲ Memoirs of mohd. bin Tughlaq. (British Museum Add. 25, 785 یہ چند صفحات "طبقاتِ ناصری" کے ایک قلمی نسخہ کے خاتمہ پر چسپاں تھے۔ ڈاکٹر آغا مہدی حسین نے سب سے پہلے ان کا انکشاف کیا ملاحظہ ہو۔
Rise and Fall of Mohd. bin Tughlaq. P. IX.

تا بہ حدے کہ در وجود صانع شکوک و شبہات[۱] مزاحم و معارض شد۔"

اس فلسفیانہ تلاش و جستجو نے الحاد اور بے دینی کی راہیں دکھا دیں۔ اسی زمانہ میں اس ایک دن شیخ شہاب الدین حق گوؒ سے کہا کہ ولایت کے خاتمہ کی طرح نبوت کے خاتمہ کو عقل تسلیم نہ کرتی جس پر شیخ کو بہت غصہ آیا۔[۲] لیکن یہ دور زیادہ عرصہ نہیں رہا اور ایک زمانہ آیا کہ

"صفات باری جل ذکرہ روشن گشت و چوں دل بر وحدت واجب الوجود قرار گشت و تصدیق نبوت کہ واسطہ وصول بندگان است الی اللہ تعالیٰ مقرر شد۔"

اور سلطان پھر صحیح راہ پر آگیا۔

محمد بن تغلق نے ابتدائی زمانہ میں غلط راستے پر پڑ جانے کا ذمہ دار تمام تر زمانہ ساز علما ٹھیرایا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ علمار وقتی فائدے اور عارضی منفعت کی خاطر نہ صرف اظہار حق سے با بلکہ سلطان کا فلسفہ کی طرف میلان دیکھ کر اسی گروہ کے ہم زبان ہو گئے۔ لکھتا ہے۔

"وعلمار روزگار بہ حکم الضرورت تبیح المحظورات بعضے زبان از گفتن حق بستہ بودند و از غایت حرص دست شراز آستین بے دینی کشیدہ و بہ طمع مناصب باطل باآں گروہ ہم داستاں گشتہ"

مذہبی علم اور معلومات | تلاش اور تحقیق کا یہ دور بہت جلد ختم ہو گیا۔ سلطان نے چونکہ مذہب پر نہایت وسیع النظری اور آزادی کے ساتھ غور و فکر کیا تھا اس لئے اسلامی احکامات کی حرمت اور اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ اس کے دل میں قائم ہوگئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ نہ صرف خود مذہب کا پا ہوگیا بلکہ کوشش یہ کی کہ عوام میں بھی صحیح اسلامی تعلیم پھیلائی جائے۔

---

[۱] مذہب کی فلسفیانہ تحقیق کے سلسلہ میں یہ چیز کوئی غیر معمولی نہیں۔ جو لوگ مذہب کا مطالعہ نہایت آزادی کے ساتھ فلسفہ کی روشنی میں کرتے ہیں وہ الحاد کی منزل سے بھی ضرور گزرتے ہیں۔ امام الغزالیؒ نے "المنقذ من الضلال" میں بتایا ہے کہ تلاش حق میں کس طرح وہ الحاد اور بے دینی کی راہوں سے گذرے ہیں لیکن آخر سب کی زبان سے یہی نکلا ع

بگذر از عقل و بیاویز بہ موج یم عشق ۔۔۔ کہ دریں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست (اقبال)

[۲] گلزار ابرار۔ از محمد غوثی (در عہد جہانگیر بادشاہ) ص ۴۶۔

شہاب الدین دمشقی نے لکھا ہے کہ سلطان کو قرآن مجید حفظ تھا۔ اور ہدایہ کا کامل متن زبانی پڑھا[۵۱]۔ بعض مرتبہ جب کسی کو نصیحت کرنی ہوتی تھی تو قرآن پاک کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنا ایک ذاتی واقعہ لکھا ہے[۵۲]۔ ایک مرتبہ قرض داروں نے اسے بہت پریشان کیا۔ سلطان کو خبر ہوئی تو ابن بطوطہ کو سمجھایا کہ جس قدر میں دیا کروں اس سے زیادہ خرچ مت کیا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فلا تجعل یدک مغلولۃ ولا تبسطھا کل البسط ۔ وکلوا واشربوا ولا تسرفوا ۔

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا وکان بین ذالک قواما ۔

پابندی مذہب | برنی نے لکھا ہے کہ سلطان نماز کا بہت پابند تھا[۵۳]۔ فرشتہ لکھتا ہے۔

"پنج وقت نماز گزاردے و بہ نوافل و مستحبات قیام نمودے و ہیچ مسکرے نہ خوردے

واز زنا و جمیع عیوب اجتناب نمودے"[۵۴]

روزہ کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ بیماری میں بھی روزہ قضا نہ ہوتا تھا۔ ٹھٹھ قیام کے زمانہ میں سلطان نے باوجود علالت یوم عاشورہ کا روزہ رکھا[۵۵]۔ معمولی معمولی باتوں میں احکام شریعت کا خیال رہتا تھا۔ اگر کسی جانور کے متعلق یہ شبہ ہو جاتا کہ وہ صحیح طور سے ذبح نہیں ہوا تو اسے پھنکوا دیتا تھا[۵۶]۔ شراب خود تو کبھی پی ہی نہیں۔ لیکن اگر امراء میں سے کوئی پی لیتا تھا تو سخت سزائیں دیتا تھا صبح الاعشیٰ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے ایک امیر کی ساری جائداد محض اس وجہ سے ضبط کر لی کہ وہ شراب پیا کرتا تھا۔[۵۷]

نماز کی تاکید | سلطان محمد بن تغلق صرف خود ہی نماز کا پابند نہیں تھا بلکہ رعایا کو بھی اس نے

---

۵۱ مسالک الابصار۔ از شہاب الدین دمشقی ۔۔۔۔ ۵۲ عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ۔ مترجمہ خان بہادر محمد حسین۔ (مطبوعہ دہلی) ص ۲۳۳۔ ۵۳ تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی (مطبوعہ کلکتہ) ص ۴۶۰
۵۴ تاریخ فرشتہ۔ از فرشتہ۔ (جلد اول مطبوعہ نولکشور) ۵۵ تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۵۲۲
۵۶ عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) ص ۱۷۶۔ ۵۷ صبح الاعشیٰ از قلقشندی (انگریزی ترجمہ مطبوعہ علی گڈھ)
An Arob Account of India in the 14th Century "by. O. Spies P.64.

نماز کی بہت تاکید کی۔ ابنِ بطوطہ نے لکھا۔

"یہ بادشاہ نماز کے معاملہ میں بہت تاکید کرتا تھا اور اس کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے۔ ایک دن اس نے نو آدمی اس بات پر قتل کرڈالے ان میں سے ایک آدمی مطرب تھا۔ اس کام پر بہت سے آدمی لگائے ہوئے تھے کہ جماعت کے وقت جو شخص بازار میں مل جائے اس کو پکڑ لاؤ۔ یہانتک کہ سائیس جو دیوان خانے کے دروازہ پر گھوڑے لئے رہتے تھے ان کو بھی پکڑنا شروع کیا حکم تھا کہ ہر شخص نماز و شرائط اسلام کو سیکھے۔ تمام لوگ بازاروں میں نماز کے مسائل یاد کرتے پھرتے تھے اور کاغذوں پر لکھواتے تھے۔" [۵۱]

معلوم ہوتا ہے کہ ان شاہی احکامات کا عوام پر بہت اثر ہوا۔ حد یہ ہے کہ ناچنے گانے والی عورتیں تک نماز کی پابند ہوگئیں۔ ابنِ بطوطہ نے امیر سیف الدین ابن مہنی کی شادی میں دیکھا کہ جوں ہی اذان ہوئی ہر ایک ڈوم وضو کر کے نماز کے لئے کھڑا ہو گیا [۵۲]

احترامِ شرع سلطان محمد بن تغلق احکامِ شرع کی پابندی کی سخت تاکید کرتا تھا۔[۵۳] خود پابندیٔ شریعت کا یہ عالم تھا کہ جن لوگوں کو قتل کا حکم دیتا تھا ان کے قتل کے جواز کا فتوی پہلے فقہاء سے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ چاہے یہ فتوی مفتیوں کو اپنے منطقی دلائل سے بدحواس کر دینے کے بعد ہی لیا گیا ہو، تاہم اس سے شریعت کے احترام کا پتہ چلتا ہے۔ بدایونی نے لکھا ہے۔

"در امور سیاسی چنداں اہتمام داشت کہ چہار مفتی را در درون خود جا دادہ تا ہر کرا بہ تہمتے می گرفت، اولاً در بابِ سیاست او بہ مفتیان رد و بدل حسب مقدور می کرد وگفتہ بود کہ شما در گفتن کلمۃ الحق از جانب خود بہ تقصیر راضی می باشید۔ اگر کسے ناحق کشتہ شود فروگذاشت از شما خواہد بود۔ دخون آں کس در گردن شما است۔

---

[۵۱] عجائب الاسفار۔ از بطوطہ ص ۱۲۸ ۔ [۵۲] ایضاً ص ۵۱

[۵۳] " " " ص ۱۳۹ و ۹۷

وبعد از مباحثہ بسیار اگر ملزم می شدند ہر چند نیم شب ہم می بود، حکم بہ کشتن می کرد واگر خود الزام می یافت بہ مجلس دیگر می انداخت و برائے دفع سخن ایشاں جوابے می اندیشید و آمدہ تقریر می کرد و بعد از انکہ مفتیان را مجال حجت نمی ماند ہماں زمان اورا بہ قتل می رسانید والا در ساعت خلاص می داد" سلہ ۵

ابنِ بطوطہ، جس نے افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے لکھتا ہے کہ اس نے سلطان محمد بن تغلق سے زیادہ منصف بادشاہ نہیں دیکھا [۵۲]۔ اس کی عدل گستری اور انصاف پروری امیر و غریب سب کے لئے یکساں تھی۔ ایک مرتبہ اس کے بہنوئی امیر سیف الدین نے بغیر اجازت محلِ شاہی میں داخل ہونا چاہا۔ امیر حاجب نے روکا۔ اس نے امیر حاجب کو مارا۔ وہ بادشاہ کے پاس خون آلود کپڑوں میں پہنچا۔ بادشاہ نے فوراً امیر سیف الدین کو قاضی کمال الدین کے دیوان میں پہنچوا دیا۔ سلہ ۵۳

سلطان خود اپنے معاملہ میں بھی شریعت اور انصاف کا اسی قدر خیال کرتا تھا اور بعض اوقات ملزم کی حیثیت سے قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ایک ہندو امیر نے بادشاہ پر دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اس کے بھائی کو بلا سبب مار ڈالا۔ بادشاہ بغیر کسی ہتھیار کے "پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید" وہاں جا کر سلام اور تعظیم کی۔ قاضی کو پہلے سے حکم تھا کہ جب سلطان آئے تو کھڑا نہ ہو۔ قاضی نے حکم دیا کہ بادشاہ امیر کو راضی کرے ورنہ قصاص کا حکم ہوگا بادشاہ نے ہندو امیر کو راضی کر لیا۔ قاضی نے سلطان کو بری کر دیا [۵۴]۔

یافت مورے بر سلیمانے ظفر　　　سطوت آئین پیغمبر نگر
پیش قرآں بندہ و مولا یکے است　　　بوریا و مسند و دیبا یکے است
(اقبال)

سلہ ۵۱ منتخب التواریخ - از مولانا عبد القادر بدایونی - نیز تاریخ مبارک شاہی - از یحییٰ بن احمد ص ۱۱۶ و ۱۱۵ بدایونی کے اس بیان کا ایک اور اہم نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ سلطان محض خون آشامی کے لئے قتل و خون نہیں کرتا تھا غیظ و غضب کے عالم میں جو قتل کئے جاتے ہیں ان میں اتنی دیر اور بحث و مباحثہ انسانی فطرت برداشت ہی نہیں کر سکتی۔

سلہ ۵۲ عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ ص ۹۷۔ ۵۳ ایضاً ص ۱۳۵ ۵۴ ایضاً ص ۱۳۸۔

ایک طرف سلطان کی شان وشوکت عظمت وجلال کا تصور کیجئے اور دوسری طرف شریعت کے اس احترام کا کہ مجرم کی طرح سے عدالت کے کٹہرے میں حاضر ہوتا ہے۔ ابنِ بطوطہ نے اس قسم کے کئی اور واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے سلطان کی تعظیم شریعت کا پتہ چلتا ہے۔

علماء سے تعلقات

محمد بن تغلق خود عالم متبحر تھا۔ اس لئے علم کی قدر بھی جانتا تھا۔ صبح الاعشیٰ میں لکھا ہے کہ دو سو فقیہ سلطان کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے اور وہ ان سے دورانِ طعام میں مختلف مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا[51]۔ علماء کو دور دور سے بلاتا تھا اور اپنے دربار میں انتہائی عزت اور احترام سے رکھتا تھا۔ جو علماء اس کے دربار میں نہ آسکے ان کے لئے سلطان نے نذریں بھیجیں۔ چنانچہ قاضی مجدالدین ولی شیرازی[52] کی تعریف سن کر شیراز ہی میں ان کے پاس دس ہزار روپیہ بھیجدیا[53]۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے قاضی عضدالحی کو بلانے کا واقعہ ماثرالکرام میں لکھا ہے سلطان نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی تصنیف متن مواقف کو اس کے نام معنون کردیں[54]۔ کتابوں کا اسے بیحد شوق تھا۔ قلقشندی نے ابن الحکیم الطیاری کے حوالہ سے لکھا ہے۔

ان شخصاً قدم لہ کتبا فحثی لہ	ایک شخص نے محمد بن تغلق کے سامنے چند کتابیں
حتیٰ من جوھر کان بین یدیہ	پیش کیں تو بادشاہ نے جواہرات جو اس کے سامنے
قیمتھا عشرون الف مثقال	رکھے ہوئے تھے اٹھا کر اس کے حوالہ
من الذھب[55]	کئے۔ ان جواہرات کی قیمت سونے کے ۲۰ ہزار مثقال تھی۔

اس کے عہد میں مولانا عبدالعزیز اردبیلی جو امام ابنِ تیمیہؒ[56] کے شاگرد رشید تھے دہلی تشریف

---

۵۱ صبح الاعشیٰ۔ از قلقشندی (انگریزی ترجمہ مطبوعہ علی گڈھ) ص ۴۷۔

۵۲ قاضی مجدالدین شیراز کے نہایت نامور قاضی تھے۔ حافظ نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

دگر مربی اسلام شیخ مجدالدین   کہ قاضی بہ ازو آسماں نہ دارد یاد

۵۳ عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ ص ۱۲۱۔   ۵۴ ماثرالکرام۔ از آزاد بلگرامی ص ۱۸۵ و ۱۸۴ (مطبوعہ آگرہ) نیز اخبار الاخیار از مولانا عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۴۲ (مطبوعہ دہلی) ۵۵ صبح الاعشیٰ۔ ج ۵ ص ۹۵ (عربی)

۵۶ امام ابن تیمیہؒ (۱۳۲۷-۱۲۶۲ء) حدیث کے امام تھے ان کے متعلق کہا گیا ہے "کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیہ فلیس بحدیث" (جس حدیث کو ابن تیمیہؒ نہ جانتے ہوں وہ حدیث نہیں ہے) ان کے تجدیدی کارنامے بہت عظیم الشان ہیں ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا شاگرد کس پایہ کا عالم ہوگا۔

ئے اور اس کے دربار میں باریاب ہوئے۔ مولانا عبدالعزیز نے ایک دن محمد بن تغلق کو ایک حدیث سنائی۔ سلطان اس قدر خوش ہوا کہ جوشِ مسرت میں مولانا عبدالعزیز کے قدم چوم لئے۔[51]

صوفیا سے عقیدت محمد بن تغلق پر صوفیائے کرام کا خاص اثر تھا۔ اس کے مذہبی تصورات و تخیل کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ اور شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے کافی حد تک متاثر کیا تھا۔[52] سلطان المشائخ کی خانقاہ میں وہ اکثر حاضر ہوا کرتا تھا۔ محمد غوثی نے تو یہ لکھا ہے کہ وہ اُن کا مرید ہو گیا تھا۔[53] بعض انگریز مورخوں نے ان ہی تعلقات کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے شہزادہ محمد سے غیاث الدین تغلق کے معاملہ میں سازش کر لی تھی۔[54] جو لوگ حضرت شیخ کے حالات سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس قسم کے الزامات کی اصلیت کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت شیخ کی شخصیت ان چیزوں سے بہت بالاتر تھی۔ دہلی کے تخت پر عجیب عجیب ہنگامے ہوئے لیکن انھوں نے کبھی اس طرف دیکھنا بھی پسند نہ کیا۔ مزک نے صحیح لکھا ہے کہ یہ الزام تاریخی شواہد کے قطعاً خلاف ہے[55]

شیخ نظام الدین اولیاؒ کے علاوہ دیگر بزرگوں سے بھی سلطان نہایت عقیدت سے پیش آیا۔ ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ محمد بن تغلق نے شیخ رکن الدین کو ۱۰۰ گاؤں بطور جاگیر دیئے تھے[56] سلطان شیخ کی عزت بھی بہت کرتا تھا اور ان کے کہنے پر عمل بھی کرتا تھا۔ ملتان میں

---

[51] عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ ص ۱۲۰۔ [52] "Rise and Fall of Mohd. bin Tughlaq" — Dr. Mehdi Hussain. P.23.

[53] گلزار ابرار۔ از محمد غوثی۔ ص ۴۶

[54] Sir W. H. Sleeman: "Rambles and Recollections of an Indian Official" II, P.145. & Cooper: "The Handbook of Delhi" P. 97.

[55] H. Mzik: "Die Reise des Arabers Ibn Batuta durch Indian und China" (Hamburg, 1911)

[56] عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ ص ۱۶۵۔

بہرام ایبہ کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد اس نے چاہا کہ ملتان کے ان سب باشندوں کو جنہوں نے اس بغاوت میں ایبہ کا ساتھ دیا تھا تہ تیغ کر دے لیکن جب شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے اس سے سفارش کی تو اپنے ارادہ کو ترک کر دیا۔[۱]

ایک مرتبہ ہانسی میں شیخ قطب الدین منورؒ کی خدمت میں فرمان جاگیر کمال الدین صدر جہاں کے ہاتھ روانہ کیا۔ لیکن شیخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[۲] کچھ لوگوں نے سلطان کو شیخ قطب الدین منورؒ کی جانب سے بدظن کر دیا۔ سلطان نے شیخ کو ملنے کے لئے بلایا۔ شیخ نے مصافحہ کے وقت سلطان کا ہاتھ بہت زور سے دبایا۔ سلطان پر اس کا بہت اثر ہوا اور کہنے لگا۔ "جتنے مشائخ سے میں نے مصافحہ کیا ہے سب کے ہاتھ لرزتے تھے لیکن شیخ قطب الدین نے میرا ہاتھ خوب مضبوطی سے پکڑا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بزرگ ان لوگوں میں سے نہیں۔ حاسدوں نے مجھے غلط خبر دی۔ مجھے ان کی پیشانی سے دینی رعب اور ادب نظر آیا" ـــــ سلطان نے اس کے بعد آپ کی خدمت میں فیروز اور برنی کی وساطت سے ایک لاکھ تنکہ روانہ کیا۔ آپ نے انکار کیا۔ بڑے اصرار کے بعد دو ہزار تنکہ قبول کیا۔[۳] پھر شیخ قطب الدین کو اس عقیدت سے ہانسی روانہ کیا کہ۔ (میر خورد نے اس موقع پر سعدی کے یہ شعر لکھے ہیں)۔

گر قدم بر چشم ما خواہی نہاد　　دیدہ در رہ می نہم تا میروی

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست　　تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

خواجہ کریم الدین سمرقندی کو جو شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے اور امیر حسن اور امیر خسرو کے خاص دوست تھے۔ سلطان نے نہایت عزت سے دربار میں بلایا اور شیخ الاسلام کے عہدہ پر مامور کیا۔[۴] ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ سلطان شیخ صدر الدین کہرانی کی خانقاہ میں خود حاضر ہوا اور لنگر کے خرچ کے واسطے دیہات قبول کرنے کی درخواست کی[۵]

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۴۷۹۔ [۲] سیر الاولیا۔ از میر خورد ص ۲۱۹ و ۲۲۰ مطبوعہ لاہور۔ [۳] ایضاً ص ۲۲۳ ۲۲۱

[۴] ایضاً ص ۲۶۷۔ [۵] عجائب الاسفار از ابن بطوطہ ص ۵۳۔

مسالک الابصار کے مصنف کا بیان ہے کہ دو لاکھ خلعت جو ہر سال بادشاہ کے کارخانے میں تیار ہوتے تھے ان میں سے خانقاہوں اور مسجدوں کے شیوخ کو بھی بھیجے جاتے تھے۔ [۵۱]

شیخ علاء الدین اور محمد بن تغلق محمد بن تغلق، حضرت بابا فرید گنج شکر کے پوتے شیخ علاء الدینؒ کا مرید تھا۔[۵۲] شیخ علاء الدین بڑے جلال اور مرتبہ کے بزرگ تھے۔ برنی ان کے متعلق لکھتا ہے۔

"شیخ علاء الدین نبیرۂ شیخ فریدالدین راصلاح مشخص وتعبد مجسم آفریدہ بود۔۔۔ در تفسیر نوشتہ اند کہ بعضے ملئکہ مقدس بہ محض عبادت خدائے جل وعلا مجبول اند واز آفرینش جز تعبد، ہیچ مشغولی ندارند۔ شیخ علاء الدین نیز ہم ازاں قبیل آفریدہ شدہ بود" [۵۳]

میر خورد نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ظالموں کے ہاتھ سے تنگ آکر روضہ متبرکہ کے جماعت خانہ میں پناہ لیتا تو آپ کے ڈر کی وجہ سے کسی کی مجال نہ تھی کہ مظلوم کو زور و تعدی سے لے جائے۔ خواہ وہ بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہو۔ [۵۴]

تعمیرات مزارات محمد بن تغلق نے صوفیا و مشائخ سے اسی عقیدت کی بنا پر ان کے مزارات تعمیر کرائے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے روضۂ مبارک پر ایک عالی شان گنبد بنوایا۔ جو بقول میر خورد لطافت اور صفائی میں اپنی نظیر آپ ہے۔[۵۵] حضرت شیخ علاء الدین کے مزار پر بھی سلطان ہی نے عمارت تعمیر کرائی۔[۵۶] بداؤں میں زیارت میراں ملہمؒ[۵۷] پر ایک کتبہ ہے جس پر لکھا ہوا ہے۔

۵۱۔ مسالک الابصار۔ از شہاب الدین دمشقی۔

۵۲۔ سیر الاولیا۔ از میر خورد ص ۱۷۴۔ نیز عجائب الاسفار۔ از بطوطہ ص ۴۴۔ ابنِ بطوطہ نے آپ کا نام غلطی سے فریدالدین لکھدیا ہے۔

۵۳۔ تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی ص ۳۴۷۔

۵۴۔ سیر الاولیا۔ از میر خورد۔ ص ۱۷۴۔ ۵۵۔ ایضاً ص ۱۳۶۔ ۵۶۔ ایضاً ص ۱۷۴۔ نیز۔ گلزار ابرار محمد غوثی ص ۵۳۔

۵۷۔ میر ملہم شہیدؒ۔ آپ سالار مسعود غازی کے رفیقوں میں سے ہیں۔ حضرت بدرالدین شاہ ولایت بداوں آپ کی زیارت مزار کے لئے برہنہ پا تشریف لاتے تھے ملاحظہ ہو تذکرۃ الواصلین۔ از مولوی رضی الدین بسمل بدایونی (مطبوعہ لکھنؤ) ص ۱۱-۹

اتممت عمارۃ جدید فی عہد سلطان الاعظم ابوالمجاہد فی سبیل اللہ
محمد بن تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المومنین خلد اللہ ملکہ وسلطانہ و
اعلیٰ امرہ وشانہ المعمار محمد سلطانی یوم احدی الثامن من ربیع الاخر سنہ ۷۲۸ھ"[۵۱]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مزارات سے اسے عقیدت بھی تھی اور ان پر وہ حاضر بھی ہوا کرتا تھا حضرت سید سالار مسعودؒ کی زیارت کا حال برنی لکھتا ہے۔

"در بہرائچ رفت و سپہ سالار مسعود شہید را کہ از غزاۃ سلطان محمود سبکتگین بود۔ زیارت کرد و مجاوران روضہ او را صدقات بسیار داد"[۵۲]

اشاعتِ اسلام کا جذبہ | محمد بن تغلق کے قلب میں ایک خاموش تبلیغی جذبہ کروٹیں لیتا ہوا نظر آتا ہے وہ اسلام کو ہندوستان میں بڑھتا اور ترقی کرتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر اس نے اُن دور دراز علاقوں میں جہاں مسلمان آبادی نسبتاً کم تھی علماء و مشائخ کو نہایت کوشش سے بھیجا۔ اس کی سیاسی بصیرت نے بتا دیا تھا کہ جس جگہ مسلمانوں کی آبادی نہ ہوگی وہاں اسلامی سلطنت کی بنیادیں استوار نہ ہو سکیں گی۔ اور اس سلسلہ میں ہر کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق ہوگی۔ چنانچہ دکن کے مسئلہ پر جب اس نے غور کیا تو اس کی دور بیں نظر اسی طرف گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیش رو باوجود بے پناہ طاقت اور قوت رکھنے کے دکن پر براہِ راست حکومت نہ کر سکے۔ علاؤ الدین جیسے بادشاہ نے صرف خراج وصول کرنے پر اکتفا کر لیا۔ اس کی نظر فوراً تہ تک پہنچ گئی، اور سمجھ گیا کہ اس خطہ میں جب تک مسلمان آبادی نہ ہوگی، دہلی سے حکومت کرنیکا خواب منت کشِ تعبیر نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے کوشش کی کہ علماء و مشائخ کو دکن بھیجا جائے تاکہ وہاں پہنچ کر تبلیغِ اسلام کریں اور اسلامی آبادی کو فروغ دیں جس کو تبدیلی دار السلطنت کے نام سے اب تک سنتے چلے آئے ہیں وہ کیا چیز تھی؟ حقیقت میں اسی سلسلہ کی ایک کوشش تھی جس کو

---

۵۱ کنز التاریخ (تاریخ بدایوں) از مولوی رضی الدین بسمل (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) ص ۵۱۔

۵۲ تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۴۹۱۔ نیز عجائب الاسفار از بطوطہ ص ۱۹۰ و تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۰۰ (اردو)

مورخوں نے اس انداز میں پیش کیا کہ ایک مضحکہ خیز حرکت بن کر رہ گئی۔

• سلطان محمد بن تغلق نے اپنا دارالسلطنت دہلی سے تبدیل نہیں کیا تھا اس نے صرف علماء و مشائخ کو دیوگیر بھیجا تھا۔ تاکہ وہ وہاں جاکر تبلیغ اسلام کریں۔ اس کی فوج، خزانے اور دفاتر سب دہلی میں رہے[51]۔ ہماری نظروں میں دارالسلطنت کی تبدیلی کی جو تصویر کھینچی ہے وہ زیادہ تر مورخوں کے زورِ قلم کی رہینِ منت ہے۔ سلطان نے جس مقصد کے لئے "بزرگانِ دہلی" کو دیوگیر بھیجا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ میر خورد نے لکھا ہے۔

"دیوگیر روانگی سے قبل سلطان نے ایک دربار عام کیا۔ اور منبر پر کھڑے ہوکر لوگوں کو جہاد[52] کی ترغیب دی۔ اس جلسہ میں مولانا فخر الدینؒ، مولانا شمس الدین یحییٰؒ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی موجود تھے۔" [53]

ڈاکٹر مہدی حسین نے اپنی کتاب "عروج و زوال محمد بن تغلق" میں ثابت کیا ہے کہ صرف مسلمان ہی دیوگیر بھیجے گئے تھے[54]۔ اس کی تصدیق برنی، میر خورد اور عصامی کے بیانات سے ہوتی ہے۔

(۱) برنی دہلی کی بربادی پر اس طرح افسوس کرتا ہے۔

"دارالملک دہلی را کہ در مدت صد و شصت و ہفتاد سال آبادانی آں دست دادہ بود و مصر جامع شدہ و موازی بغداد گشتہ باجملہ سرایہا و قصبات حوالی چہار کروہی و پنج کروہی خراب کردند۔ . . ." [55]

---

[51] ملاحظہ ہو:- Dr. Mehdi Hussain's Rise & Fall of Mohd. bin Tughlaq & my article "Was the Capital transferred" in M.C. Magazine 1942 (March) PP 34-38.

[52] اس جہاد سے مقصد خاموش طریقہ پر اشاعتِ اسلام تھا۔ جیسا کہ "سیر الاولیا" سے ظاہر ہے اور ڈاکٹر آغا مہدی حسین نے تشریح بھی کر دی ہے ملاحظہ ہو "عروج و زوال محمد بن تغلق" (انگریزی) ص ۱۱۳۔

[53] سیر الاولیا۔ از میر خورد ص ۲۳۹۔

[54] Rise & Fall of Mohd. bin Tughlaq. P. 112.

[55] تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی ص ۴۷۴۔

برنی افسوس کرتا ہے دہلی کی اس آبادی کے اجڑنے پر جو ۱۶۰، ۱۷۰ سال سے وہاں تھی۔ ظاہر کہ ۱۶۰، ۱۷۰ سال کے باشندے مسلمان ہی تھے اور یہ مدت فتح دہلی سے لگائی گئی ہے۔

(۲) "فتوح السلاطین" کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ عصامی اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ محمد بن تغلق خدا کی طرف سے مسلمانان دہلی کی بداعمالیوں کی سزا دینے کے لئے بھیجا گیا تھا[۵۱] وہ ہندوؤں کا ذکر نہیں کرتا اس لئے کہ ان پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں پڑا تھا۔

سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ جب حضرت شیخ نظام الدین اولیا سلطان غیاث الدین تغلق کی مجلس مناظرہ سے جو سماع کے متعلق ہوئی تھی واپس آئے تو فرمانے لگے "یہاں کے علماء احادیث نبوی کو نہیں سنتے۔ . . . . جب سے انھوں نے روایت حدیث سے منع کیا ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس بے اعتقادی کی شامت سے بلا و مصیبت نازل نہ ہو" آگے چل کر میر خورد لکھتے ہیں" اس بحث کے چوتھے سال تمام علماء جو اس مجلس بحث میں شامل تھے۔ دیوگیر جلاوطن کئے گئے"[۵۲] اس سے بھی ظاہر ہے کہ کن لوگوں پر اس کا اثر پڑا۔

(۳) علاوہ ازیں سیر الاولیا کے ایک اور بیان سے بھی محمد بن تغلق کے مقصد کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتا ہے کہ جب مولانا فخر الدین زرادی دیوگیر پہنچے تو حج جانے کے بارے میں مشورے کرنے کے لئے گئے قاضی صاحب نے کہا کہ بغیر اجازت سلطان جانا مصلحت نہیں کیونکہ اس کا ارادہ شہر کے آباد کرنے کا ہے اور اس کو علماء و مشائخ کے وجود سے زینت دینے کا ہے"۔ [۵۳]

حقیقت میں سلطان محمد بن تغلق دیوگیر کو اسلام کا مرکز بنانا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے اسلام کی شعاعیں دکن کے گوشہ گوشہ میں پہنچ سکیں۔ دیوگیر کے سکوں پر "قبہ دین اسلام" لکھا ہوا ہے[۵۴]۔ دین کا لفظ اس سکہ میں بالکل نئی چیز ہے۔ بدر الاسلام، دار الاسلام، وغیرہ الفاظ تو عام طور سے سکوں پر

---

۵۱ فتوح السلاطین۔ از عصامی (انڈیا آفس نسخہ نمبر ۸۹۵) ص ۲۴۹ - ۲۴۷۔ بحوالہ ڈاکٹر مہدی حسین ص ۱۱۲

۵۲ سیر الاولیاء از میر خورد ص ۴۸۸ - ۴۸۷ (مطبوعہ لاہور) ۵۳ ایضاً ص ۲۳۹

۵۴ E. Thomas: "Chronicles of the Pathan Kings of Delhi" P. 209.

کندہ کرائے جاتے تھے۔ لفظ "دین" خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ اور اس صورت میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ سلطان محمد بن تغلق نے سکوں کے ذریعہ سے اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کی کوشش بھی کی تھی۔[۵۱]

دکن کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی سلطان نے علماء و مشائخ کو بھیجنے کی بیحد کوشش کی۔ مولانا شمس الدین یحییٰؒ کو جو بڑے پایہ کے عالم تھے سلطان نے اپنے دربار میں بلایا اور کہا "آپ جیسا عالم یہاں رہ کر کیا کر رہا ہے۔ کشمیر میں جا کر وہاں کے بت خانوں میں بیٹھ کر خلقِ خدا کو اسلام کی دعوت دیجئے"۔[۵۳]

خواجہ علاؤالدین اجودھنی کے بیٹے شیخ معزالدین کو سلطان نے گجرات بھیجا۔ آپ وہاں تبلیغی کام کرتے رہے اور وہیں شہید ہوئے"۔[۵۴]

علماء وصوفیاء سے کشیدگی کے اسباب

مذہبی تذکرہ نگاروں نے اکثر جگہ محمد بن تغلق کی علماء پر سختی کا ذکر کیا ہے جس جگہ محمد بن تغلق کا نام آیا ہے وہاں یہ بھی ضرور لکھا ہوا ہے کہ وہ علماء و مشائخ پر ظلم وستم کیا کرتا تھا۔ لیکن کہیں اس جبر و استبداد کی نوعیت کا پتہ نہیں چلتا۔ کس قسم کی تکلیف دیتا تھا؟ کس "شرعی حیلہ"[۵۵] سے دیتا تھا؟ اس سلسلہ میں یہ سیرت نگار اور تذکرہ نویس بالکل خاموش ہیں۔

---

[۵۱] Dr. R. P. Tripathi: "Some Aspects of Muslim Administration" P. 61.

[۵۲] آپ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور چراغ دہلویؒ کے استاد تھے۔ حضرت چراغ دہلویؒ نے آپ کے متعلق لکھا ہے۔

سالت العلم من احیاک حقاً   فقال العلم شمس الدین یحییٰ

میر خورد نے آپ کو "دریائے علم اور گنج زہادت" کہا ہے (سیر الاولیاء ص ۲۰۱ و ۱۹۷) مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں "و کار علم و تبحر مولانا بجائے کشید کہ استاداں دہلی در حلقہ درس او بہ زانوئے ادب نشستند و در ذیل تلامذہ منسلک گشتہ بہ شاگردی افتخار نمودند"۔ (مآثر الکرام ص ۱۸۳)

[۵۳] سیر الاولیاء۔ از میر خورد ص ۲۰۱۔ نیز اخبار الاخیار۔ از مولانا عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۷

[۵۴] سیر الاولیاء۔ از میر خورد ص ۱۷۴۔

[۵۵] ہمیں یہ معلوم ہے کہ بغیر فتویٰ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا (منتخب التواریخ۔ تاریخ مبارک شاہی)

سیرالاولیا میں کئی جگہ مشائخ پر سختی کا شکوہ ہے لیکن اس سے زیادہ تفصیل کہیں نہیں لکھی کہ " وہ ان پر ظلم و ستم کیا کرتا تھا" یہ ظلم و ستم کیا تھا؟ اور کیوں کیا جاتا تھا؟ اس کا جواب دینے کی میر خورد نے کوشش نہیں کی۔ لیکن وجوہات کا پتہ لگانا دشوار نہیں۔ خود سیرالاولیا کے بعض جملوں سے اس شکایت کی ساری نوعیت معلوم ہو جاتی ہے۔

میر خورد نے لکھا ہے " سلطان ان دنوں سادات و مشائخ کو ادھر سے ہٹا کر کسی دنیاوی کام پر لگا دیتا تھا"[۵۱] یہ دنیاوی کام یہ تھا کہ سلطان ان بزرگوں کو اپنی مرضی کے مطابق ہندوستان کے مختلف حصوں میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجنا چاہتا تھا۔ یہاں لوگوں کے دل میں بجا طور پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی برا کام نہیں تھا۔ نہ اس میں ظلم و ستم کا کوئی پہلو ہے نہ صوفیا و عوام کی شکایت کا باعث۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی کے اندر صوفیا اور عوام دونوں کی ناراضگی کے اسباب پنہاں ہیں۔ جہاں تک صوفیا کی مخالفت کا تعلق ہے یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیئے کہ صوفیا و مشائخ نے اپنے معاملات میں سلاطین کی مداخلت کو (خواہ وہ نیک کام ہی کے لئے کیوں نہ ہو) کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ وہ اپنے نظام اور پروگرام کے مطابق جہاں مناسب سمجھتے تھے کام کرتے تھے۔ سلاطین کے احکامات کے مطابق اپنے کام کو انجام دینا وہ "شغل"[۵۲] کے مترادف تصور کرتے تھے جو ان کی نظر میں روحانی موت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ [۵۳] مولانا کمال الدین زاہد"[۵۴] کا وہ جواب جو انھوں نے سلطان بلبن کو دیا تھا[۵۵] یاد رکھنے کے قابل ہے اس سے صوفیا کے رجحان کا پتہ چلتا ہے

---

۵۱ سیرالاولیا۔ از میر خورد ص ۱۹۳۔ ۵۲ لفظ "شغل" اس زمانہ میں ملازمتِ شاہی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔
۵۳ اس موضوع پر میں نے اپنے انگریزی مضمون
مطبوعہ میرٹھ کالج میگزین (مارچ ۱۹۴۵ء) ص ۷-۶ میں بحث کی ہے۔
۵۴ مولانا کمال الدین زاہد" حضرت شیخ نظام الدین اولیا رح کے استاد تھے۔ انھوں نے حدیث کی سند مولانا برہان الدین تلمیذ مؤلف مشارق الانوار سے حاصل کی تھی۔ تبحر علمی اور زہد و اتقا کا دور دور شہرہ تھا ملاحظہ ہو " اخبار الاخیار " از مولانا عبدالحق محدث دہلوی رح ص ۷۱۔ ۵۵ سیرالاولیا۔ از میر خورد ص ۹۵-۹۴

بلبن نے امامت شاہی قبول کرنے کی درخواست کی تو مولانا نے بے دھڑک جواب دیا " ہمارے پاس سوائے نماز کے اور کیا ہے۔ کیا بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی جاتی رہے "۔ اس جملہ کو سامنے رکھنے کے بعد کوئی شخص صوفیاء کی اس کام میں مخالفت پر تعجب نہیں کر سکتا۔ رہا عوام کی ناراضگی کا سبب سو اس کا اندازہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کو عوام کی صوفیا سے عقیدت کا تھوڑا سا بھی علم ہے دہلی کا وہ سماں یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جب خواجہ معین الدین چشتیؒ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو اپنے ہمراہ لیکر دہلی سے اجمیر روانہ ہوئے ہیں تو میلوں تک سلطان التمش اور باشندگان دہلی دیوانہ وار، آہ و زاری کرتے، قدموں کی خاک اٹھاتے چلے گئے ہیں[۵۱] وہ وقت بھی بھولنا نہیں چاہئے جب قطب صاحبؒ کی وفات پر بابا فرید گنج شکر دہلی تشریف لائے ہیں۔ آئے ہوئے تیسرا دن ہے باہر نکلتے ہیں تو ایک شخص رو کر یوں کہتا ہے " جب آپ ہانسی میں تھے تو روز ملاقات ہو جاتی تھی اب سخت مشکل ہے "[۵۲] اور جہاں جوشِ عقیدت کا یہ عالم ہو ــــ کہ

" از شہر تا غیاث پور چندیں مواضع نزہ چوترھا بندا یندہ بودند و چھپر انداختہ و چاہ ہا کاوانیدہ و مٹھ ہا و سبو ہا پر آب و آفتابہائے گلین مرتب داشتہ و بوریا ہا فراز کردہ در ہر چوترہ و چھپرے حافظے و خادمے نصب شدہ تا مریداں و تائباں و صالحاں را در آمد و شد آستانہ شیخ را برائے وضو ساختن بوقت گذاردن نماز خاطر متعلق نہ گردد "[۵۳]

اندازہ لگایئے کہ جب ایسے مقبول مشائخ کو دور و دراز حصوں میں بھیجا گیا ہوگا تو عوام پر کیا گذری ہوگی؟ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ برنی نے، جو ان عقیدت مندوں کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جب خانقاہوں کو خالی دیکھا تو اس کو ساری دہلی اجڑی ہوئی اور سونی نظر آئی۔

سیر الاولیا کے صفحے الٹئے، جہاں کہیں سلطان کے ظلم و ستم کا ذکر ملیگا وہاں اس کی وجہ یہی نظر آئیگی کہ سلطان مشائخ کو اپنے دربار میں بلا کر مختلف مقامات پر بھیجنے کی کوشش کر رہا ہے،

---

۵۱ سیر الاولیا۔ از میر خورد ص ۵۱ - ۵۰ - ۵۲ ایضاً ۶۶ - ۶۵

۵۳ تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی ص ۳۴۴۔

مولانا شمس الدین یحییٰ پر ظلم وستم کی تفصیل یہ ہے کہ ان سے کشمیر جانے کا اصرار ہے[1]۔ شیخ قطب الدین منورؒ پر سختی کی روئداد یہ ہے کہ انھیں ہانسی سے دہلی اپنے ہمراہ لایا ہے۔[2] بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ محمد بن تغلق مشائخ سے اپنا ذاتی کام لیا کرتا تھا۔ فرشتہ کا بیان ہے:-

"نقل است کہ پادشاہ محمد تغلق شاہ کہ بہ واسطۂ بسیارے قتل وسیاست او را خونی می گفتند با درویشاں سو مزاج بہم رسانیدہ حکم کرد کہ درویشاں بطریق خدمت گاراں خدمتم نمایند۔ پس یکے مرا تنبول خوراند ودیگرے دستار بہ بندد۔ الغرض بسے مشائخ را خدمتے مقرر کردہ بہ شیخ نصیر الدین اودہی المشہور بہ چراغ دہلی تکلیف بہ جامہ پوشانیدن نمود۔ ۔ ۔ ؟[3]

محمد بولاق چشتی[4] مصنف "مطلوب الطالبین" نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے۔

"بعض می گویند سلطان محمد تغلق، شیخ نصیر الدین را جامہ دار خود کردہ بود محض کذب گفتار عوام الناس است وبہ کتابے در نظر نیامدہ"[5]

یہاں کچھ لوگ شاید ابن بطوطہ کے اس بیان سے استدلال کریں۔

"محمد شاہ بادشاہ ہوا تو اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مشائخوں اور عالموں کو اپنی نج کی خدمت سپرد کیا کرتا تھا۔"[6]

لیکن میرے نزدیک اس "نج کی خدمت" سے مراد یہی تبلیغی کام تھا جو وہ علما کے سپرد کیا کرتا تھا۔ اس خیال کی تائید ابن بطوطہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو وہ اسی جملہ کے آگے تحریر کرتا ہے۔

"اور یہ دلیل لاتا تھا کہ خلفاء راشدین سوا اہلِ علم اور اہلِ صلاح کے کسی کو کوئی خدمت سپرد نہیں کرتے تھے۔"[7]

---

[1] سیر الاولیاء از میر خورد ص ۲۰۱ [2] ایضاً ص ۲۲۲۔

[3] تاریخ فرشتہ۔ از محمد قاسم فرشتہ (مقالہ دوازدہم) ص ۴۵۔ (مطبوعہ کانپور)

[4] مذہبی تذکرہ نویسوں میں محمد بولاق چشتی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس کے یہاں واقعات کی تحقیق بالکل تاریخی انداز میں ہوتی ہے۔ ترتیب کا بھی وہ بہت خیال رکھتا ہے۔ مطلوب الطالبین کی ترتیب تو واقعی قابلِ داد ہے۔ مذہبی تذکرہ نویسوں میں یہ دونوں باتیں مشکل سے ملتی ہیں۔

[5] مطلوب الطالبین۔ محمد بولاق۔ (قلمی نسخہ) [6] عجائب الاسفار۔ از بطوطہ ص ۱۴۵۔ [7] ایضاً ص ۱۴۵

ظاہر ہے کہ خلفاء راشدین نے اہلِ علم اور اہلِ صلاح کو کس قسم کی خدمت سپرد کی ہوگی؟[۱] اسی قسم کی خدمت سلطان اولیاؒ و مشائخ سے چاہتا تھا۔ بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس کو جامہ اور پگڑی پہنانے کی خدمت بنادیا اور سلطان کی خوب تشہیر کی۔

محمد بن تغلق نے اپنے عہد میں بعض صوفیوں اور درویشوں کو سزائیں ضرور دی تھیں اور اسی بنا پر قتل و غارت گری کی یہ داستانیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ لیکن ان سزاؤں کی وجوہات کو نظر انداز کرنا بڑی بے انصافی ہے۔ محمد بن تغلق ظالم بادشاہ نہیں تھا۔ انسانی خون بہانے میں اس کو کوئی لطف نہیں آتا تھا۔ اس نے بلا سبب کسی عالم یا صوفی کو نہیں ستایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ اسباب غلط فہمی کے پیدا کئے ہوئے تھے۔ سلطان اور صوفیا، دونوں نے ایک دوسرے کو غلط سمجھا تھا صوفیا، یہ سمجھتے تھے کہ سلطان ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر حاوی ہونا چاہتا ہے جو اب تک سیاست اور سلاطین سے یکسر بے تعلق رہے ہیں۔ سلطان یہ سمجھتا تھا کہ صوفیا اس کی حکم عدولی پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ایک طرف سلطان اپنے احکام سے سرتابی کو برداشت نہیں کرسکتا تھا تو دوسری طرف صوفیا رکرام بھی اپنے اس مسلک کو جسے ان کے بزرگوں نے انتہائی خطرات کے وقت بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا، توڑنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ دونوں میں کشمکش پیدا ہوئی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو آج تاریخ کے صفحات میں سلطان محمد بن تغلق کی بدنامی کی صورت میں نظر آتا ہے۔

بعض قتل بالکل سیاسی مصالح کی بنا پر ہوئے تھے۔ مثلاً شیخ ہود کا قتل۔ شیخ ہود، شیخ رکن الدین ملتانیؒ کے پوتے تھے لیکن انھوں نے عیش و عشرت کی زندگی اختیار کرلی تھی۔

---

[۱] شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے خود ایک مرتبہ اپنی مجلس میں بیان فرمایا "ایک شخص امیرالمومنین عمر بن الخطاب رضؓ کی خدمت میں آیا۔ بولا۔ اے خلیفہ مجھ کو کہیں کی حکومت دیجئے۔ آپ نے پوچھا۔ تونے قرآن پڑھا ہے؟ کہا نہیں۔ فرمایا۔ اول قرآن پڑھ" ملاحظہ ہو خیر المجالس ص ۹۲-۹۱

قاضی ابو یوسفؒ نے لکھا ہے "حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ جب ان کے پاس کوئی فوج مہیا ہوتی تھی تو ان پر ایسا افسر مقرر کرتے تھے جو صاحب علم اور صاحب فقہ ہوتا تھا ملاحظہ ہو کتاب الخراج ص ۱۲۰

جاگیر کے سو گاؤں جو شیخ رکن الدین کو دیئے گئے تھے شیخ ہود اپنے ذاتی صرف میں لانے لگے تھے شاہانہ ٹھاٹ کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے گھر کی تلاشی لی گئی تو جوتیوں کا ایک جوڑا نکلا جس پر جواہرات اور یاقوت جڑے ہوئے تھے سلطان نے ان کی دولت ضبط کرلی۔ اس کے بعد شیخ ہود نے ترکستان بھاگ کر جانے کا ارادہ کیا تو سلطان کو سیاسی خطرات پیدا ہوئے۔ انھیں بلا کر کہا تیرا ارادہ یہ تھا کہ ترکستان جا کر کہے کہ میں شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی کا بیٹا ہوں۔ بادشاہ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے اور اس طرح ترکوں کو مدد کے لئے لائے[۵۱] یہ کہکر سلطان نے ان کو قتل کرا دیا[۵۲]

شیخ شمس الدین کول کے رہنے والے بزرگ کا قتل اس لئے کرایا گیا کہ انھوں نے اپنی مجلس میں نہ صرف باغی امیر کی تعریف کی بلکہ اس کو بادشاہی کے لائق بتایا[۵۳] شیخ حیدری کا قتل بھی سیاسی وجوہات کی بنا پر ہوا انھوں نے قاضی جلال افغانی سے کھمبات کی بغاوت میں سازش کرلی تھی اور مفتیوں نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا تھا[۵۴]۔ خطیب الخطبا دہلی کو اس لئے زدوکوب کیا گیا کہ شاہی خزانے کے جواہرات ان کی بے پرواہی سے تلف ہوگئے تھے[۵۵]۔ عفیف الدین کاشانی کے قتل کی بھی کچھ ایسی ہی وجوہات تھیں[۵۶]۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں تفصیل سے بعض ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کو سلطان نے قتل کرایا۔ یا سزائیں دیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سزاؤں کا باعث کوئی نہ کوئی سازش یا سیاسی نافرمانی ضرور تھی۔[۵۷]

محمد بن تغلق اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ

سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق اور حضرت چراغ دہلوی کے تعلقات اچھے نہ تھے[۵۸]۔ میر خورد نے کشیدگی تعلقات کی وجہ

---

۵۱ شیخ بہاء الدین ذکریاؒ اور ان کے سلسلہ کا سندھ، سیوستان اور ترکستان میں بڑا اثر تھا۔ برنی لکھتا ہے —
"وتمامی اہالی دریائے سندھ از ملتان واچہ وفرود تردیلہ با آستان متبرک شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ العزیز تشبت وتعلق نمودہ بودند" ملاحظہ ہو "تاریخ فیروز شاہی" ص ۴۴۸

۵۲ عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ ص ۱۵۴ و ۱۵۲۔ ۵۳ ایضاً ص ۱۵۴۔ ۵۴ ایضاً ص ۱۵۶۔ ۵۵ ایضاً ص ۱۵۸
۵۶ ایضاً ص ۱۵۰۔ ۵۷ ایضاً ص ۱۵۸ و ۱۴۴ ۵۸ سیر الاولیا۔ از میر خورد ص ۲۱۵

نہیں بتائی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ حضرت چراغ دہلوی نے سلطان محمد کے گجرات کے قیام کے زمانہ میں فیروز کو دہلی میں تخت پر بٹھا دیا تھا۔[۵۱] سلطان کو گونڈل قیام کے زمانہ میں اس کی اطلاع ہوئی اور دونوں کو قید کرکے لانے کا حکم دیا۔ اگر بدایونی کا یہ بیان صحیح ہے تو کشیدگی تعلقات کی وجہ ظاہر ہے اس لئے ہم اس واقعہ پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔ برنی نے اس کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے۔

"پیش ازاں کہ سلطان در گوندل آید و اقامت فرماید خبر نقل ملک کبیر از دہلی رسید واز خبر نقل او سلطان منقسم دل گشت وہم از لشکر احمد ایاز و ملک مقبول نائب وزیر ممالک را از برائے پرداخت مصالح دارالملک دہلی فرستاد واز دہلی خداوند زادہ و مخدوم زادہ وبعضے مشائخ و علماء و اکابر و معارف و حرمہائے ملوک و امراء و سوار و پیادہ سلطان محمد در گوندل طلب فرمود"[۵۲]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان علماء و مشائخ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی بھی تھے میر خورد نے اس کی وضاحت کر دی ہے لکھا ہے۔

"یہ بادشاہ آخری عمر میں شہر دہلی سے قریباً ہزار کوس کے فاصلہ پر ٹھٹھہ میں بغاوت فرو کرنے کے لئے گیا۔ وہاں پر شیخ نصیر الدین کو معہ علماء اور بزرگوں کے طلب کیا جب وہاں پہنچے تو چنداں خاطر و مدارات سے پیش نہ آیا۔"[۵۳]

آخر کیا وجہ تھی کہ ایک اہم جنگی مہم کے زمانہ میں سلطان نے ان علماء و مشائخ کو ٹھٹھہ بلایا؟ محمد غوثی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان نے ناراضگی کی حالت میں شیخ کو وہاں طلب کیا تھا اور شیخ کو اس کا علم بھی تھا۔ چنانچہ ٹھٹھہ جاتے ہوئے وہ نارنول میں شیخ محمد ترک نارنولی کے مزار پر

---

[۵۱] منتخب التواریخ۔ از بدایونی ص ۲۴۲ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

[۵۲] تاریخ فیروز شاہی۔ از برنی ص ۵۲۳ [۵۳] سیر الاولیا۔ از میر خورد ص ۲۱۵

محمد بولاقی چشتی نے "مرات الاسرار" کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ ٹھٹھہ روانگی کے وقت سلطان ان بزرگوں کو ہمراہ لے گیا تھا لیکن برنی اور میر خورد کے صاف بیانات کے پیش نظر یہ بالکل غلط ہے (مطلوب الطالبین)۔

حاضر ہوئے اور بہت دیر مراقبہ میں مستغرق رہے اور کشایش مشکل کے لئے دعائیں مانگیں[۵۱]۔ میر خورد کے اس بیان سے کہ وہ خاطر و مدارات سے پیش نہ آیا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ناراضگی کی حالت میں شیخ کو بلایا تھا۔ آگے چل کر میر خورد نے خود لکھا ہے۔

آپ نے اس ذلت کو برداشت کیا جس کے عوض بادشاہ کو بجائے تختِ سلطنت کے تابوت میں ڈال کر لائے۔ الغرض جب آپ سے پوچھا گیا کہ یہ بادشاہ آپ کو تکلیف کیوں دیا کرتا تھا تو فرمایا میرے اور اللہ تعالیٰ کے مابین ایک معاملہ تھا تو اس معاملہ کی بنا پر اس کو دنیا سے اٹھایا گیا ہے۔"[۵۲]

یہاں دو سوالات اور پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) فیروز اور چراغ دہلوی کے تعلقات کا کیا ثبوت ہے؟

(۲) فیروز نے اگر بغاوت کی ہوتی تو سلطان اس کو ضرور سزا دیتا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں؟

جہاں تک فیروز اور حضرت چراغ دہلوی کے تعلقات کا مسئلہ ہے وہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ فیروز کو جن بزرگوں نے تختِ سلطنت پر بٹھایا ان میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی بھی شامل تھے[۵۳] جہاں تک فیروز کو سزا دینے کا سوال ہے، برنی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت میں دونوں میں صفائی ہوئی تھی۔ برنی لکھتا ہے۔

"درایامے کہ سلطان محمد در لشکر مریض شد و مرض سلطان امتداد گرفت خداوند عالم سلطان محمد را تداوی بسیار کرد خدمت و شفقت و حق گزاری ولی نعمت بسیار بجا آورد۔ و سلطان محمد از بادشاہ عہد و زمان فیروز شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہٗ بغایت راضی گشت و شفقتے کہ در قدیم الایام درباب خداوند عالم داشت یکے بہ ہزار کرد"[۵۴]

---

[۵۱] گلزار ابرار۔ از محمد غوثی ص ۶۹۔ نیز۔ اخبار الاخیار۔ از مولانا عبد الحق ص ۸۷۔
[۵۲] سیر الاولیار۔ از میر خورد ص ۲۱۵ ۔ [۵۳] تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۵۳۵۔ درویش جمالی نے
[۵۳] لکھا ہے "سلطان فیروز از کمترین معتقدان ایشاں بود" سیر العارفین ص ۱۲۰
[۵۴] تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۵۳۲۔

برنی کے اس بیان میں سلطان محمد کی ناراضگی کی طرف ایک خاموش اشارہ ہے۔

بہرحال اس تمام گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ بدایونی کا بیان بے بنیاد نہیں ہے اور سلطان محمد بن تغلق اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے تعلقات کی کشیدگی کا باعث یہی امر تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ پہلا موقع تھا کہ چشتیہ سلسلہ کے کسی بزرگ نے دہلی کی سیاست میں ایسا نمایاں حصہ لیا۔ یقیناً اس وقت سلطنت میں انتہائی بدنظمی اور ابتری ہوگئی ہوگی کہ حضرت چراغ دہلویؒ بھی خاموش نہ رہ سکے۔ اور مجبوراً محمد بن تغلق کی غیر موجودگی میں فیروز کو تخت پر بیٹھنے میں مدد دی۔ ورنہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے انتہائی نازک اور خطرناک وقت میں بھی دہلی کی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔

خلافت سے تعلقات خلافت سے تعلقات کے سلسلہ میں جب ہم سلطان محمد بن تغلق کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو مختلف دور نظر آتے ہیں۔ پہلا ابتدا عہد سے سنہ ۷۴۱ھ تک اور دوسرا سنہ ۷۴۱ھ سے اختتام عہد تک۔ پہلے دور میں سلطان نے خلافت کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا[۱]۔ دوسرے دور میں سلطان نے خلافت سے جس عقیدت کا اظہار کیا وہ سلاطین اسلام کی تاریخ میں یقیناً عدیم النظیر تھا۔

پہلے دور کے سکوں پر خلیفہ کا نام کہیں نہیں ملتا۔ اس کی بجائے خلفائے راشدین کے نام کلمہ، آیاتِ قرآنی وغیرہ کندہ ہیں۔ بعض سکوں پر

واللہ الغنی وانتم الفقراء [۲]

بعض پر "محی سنن خاتم النبیین"[۳] کھدا ہوا ملتا ہے۔ سنہ ۷۳۰-۳۱-۳۲ھ میں جو سکے دیوگیر سے جاری ہوئے ہیں ان پر کندہ ہے۔

من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن [۴]

---

[۱] خلافت سے بالکل قطع تعلق کر دینے کا خیال صحیح نہیں۔ اس زمانہ کے سکوں پر گو خلیفہ کا نام نہیں ملتا لیکن عمارتوں پر "ناصر امیر المومنین" لکھا ہوا ملتا ہے۔ مثلاً ۷۲۸ھ کا کتبہ مزار میر ملہمؒ

[۲، ۳] Chronicles of the Pathan Kings of Delhi, E. Thomas PP. 211, 215

[۴] " " " " P. 249, 250

دیوگیر کے سلسلہ میں جو عام مخالفت پیدا ہو گئی تھی اس کو شاید سلطان ان مذہبی فرائض کی یاد دہانی کر کر ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس زمانہ کے بعض سکوں پر یہ عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" [۵۱]

"لولا السلطان کل الناس بعضہم بعضا تغلق" [۵۲]

لیکن اس دور کے کسی سکہ پر خلیفہ کا نام نہیں ملتا۔

دوسرے دور میں جو ۷۴۱ھ سے شروع ہوتا ہے، سلطان کے خیالات میں بڑی زبردست تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس زمانہ کے اکثر سکوں پر صرف خلیفہ کا نام ملتا ہے۔ سلطان کا کہیں ذکر نہیں [۵۳]

سلطان کے خیالات میں تبدیلی کی وجہ کیا تھی؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب سلطان کو ہر چہار طرف سے ناکامی نے گھیر لیا۔ جب مسلمانوں کے مذہبی حلقوں میں بغاوت کے آثار نظر آنے لگے، جب قاضیوں نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، جب عوام اس سے برگشتہ ہو گئے اور اس کی ہر نئی اسکیم کی زیادہ سے زیادہ مخالفت ہوئی، اور وہ کسی طرح سے حالات پر قابو نہ پا سکا، تو اس نے خلیفہ سے اپنی حکومت کی اجازت کی درخواست کی۔ تاکہ اس طرح مذہبی حلقہ کی مخالفت کا خاتمہ ہو جائے۔ ممکن ہے کہ اذنِ خلافت کو وہ سیاسی حربہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے جس طرح خلیفہ سے برتاؤ کیا اس سے خلوص اور عقیدت ٹپکتی تھی۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ اس کا اعتقاد اور طرزِ عمل تمام سلاطین اسلام میں بے مثال ہے [۵۴]۔ سب جانتے ہیں کہ مستعصم باللہ کے عہد میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی خلافت عباسیہ کا پیراہن تار تار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مصر میں خلافتِ عباسیہ نے ازسرِ نو زندگی حاصل کی۔ آمد و رفت کے ذرائع آسان نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں کئی سال خلافت بغداد کی تباہی کے بعد یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مسلمانانِ عالم نے

۵۱و۵۲ ... Chronicles P. 250. ۵۳ ایضاً ص ۲۵۹ و ۲۶۰۔

۵۴ "خلافت اور ہندوستان" از مولانا سید سلیمان ندوی صاحب ص ۱۵ (مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۳۴۰ھ)

خلافت کا دوبارہ کیا نظام قائم کیا۔ مسافروں اور تاجروں سے اس کے متعلق معلومات ہوتی رہی برنی لکھتا ہے:

"در خاطر افتاد کہ سلطنت و امارت سلاطین بے امر و اذن خلیفہ کہ از آل عباس بود درست نیست۔ و ہر بادشاہی کہ بے منشور خلفائے عباسی بادشاہی کردہ است۔ یا بادشاہی کند متغلب بودہ است۔ و متغلب بود۔ واز خلفائے عباسی سلطان بسیار تتبع می کرد تا از بسیار مسافران شنید کہ خلیفہ از آلِ عباس در مصر بر خلافت متمکن است وسلطان بہ اعوان و انصار دولت خود بہ آں خلیفہ کہ در مصر است بیعت کرد و در کد و داری عرض داشت من جانب خلیفہ سوار می کرد واز ہر بات چنیرہا در آں می نوشت و چوں در شہر آمد نماز جمعہ و نماز اعیاد را در توقف داشت واز سکہ نام خود در کنانید و فرمود تا در سکہ نام و لقب خلیفہ نویسند و در اعتقاد خلافت آل عباس مبالغتہا کرد کہ در تحریر و تقریر نتواں گنجانید" [1]

۷۴۴ھ المطابق ۱۳۴۳ء میں جب حاجی سعید صرصری کی سرکردگی میں مصر کے دربارِ خلافت سے خلعت اور فرمان آیا تو سلطان نے شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔[2] بدر چاچ نے ایک قصیدے میں لکھا ہے:-

باستقبال فرمانے کہ از پیش امام آمد	برہنہ پا و سر کردہ چوں ایماں شد ز اسلامش
خلائق پیش دپس پویاں، ملائک ذکر حق گویاں	زجزرعہ شدہ غلطاں گہر بر نقرۂ خامش
گہ از شکر و ثنائے حق شکر می ریخت یاقوتش	گہے بر لعل می بارید مروارید بادامش
چو شہ پوشید خلعت را بہ رنگ مردم دیدہ	میان روز دیدیم شب را بامہ تامش
ز آئینہا کہ شد بستہ ندیدیم یکسر موئے	سر ہر قبہ را فرقے ز ہفتم طاق و نہ بامش
امیر المومنیں فرمود تا ہر جمعہ بر منبر	بہ ہفت اقلیم می خوانند شاہنشاہ اسلامش [3]

[1] تاریخ فیروز شاہی، از برنی۔ ص ۴۹۲ و ۴۹۱ [2] ایضاً ص ۴۹۵۔ برنی لکھتا ہے "بہ چنداں جلالت و عظمت کہ او داشت در پیش آرندگان منشور خلیفہ تواضع ہا می کرد کہ ہیچ کمینہ غلامے در پیش ملک و مخدوم خود نہ کند"

[3] قصائد بدر چاچ۔ از بدر چاچ (مطبوعہ نول کشور کانپور ۱۸۷۳ء) ص ۱۲

ایک دوسرے قصیدہ کے شعر ہیں۔

جبرئیل از طاق گردوں البشر گویاں رسید | کز خلیفہ سوئے سلطاں خلعت و فرماں رسید
ملک را بازو قوی شد، دیں سر فرازی نمود | شرع را حرمت فزوں، رونق ایماں رسید
درد اسلامی کہ درسر داشت شاہنشاہِ عصر | از ولی المسلمیں ایں درد را درماں رسید[۱]

خلیفہ سے عقیدت اور محبت کا اندازہ برنی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ لکھا ہے۔

"علماء و عقلاء یک دیگر برسبیل تعجب می گفتند کہ سلطان محمد را در حق خلیفۂ عصر تا حد محبت است کہ از نام او زندہ می شود"۔[۲]

ابن بطوطہ نے سلطان محمد بن تغلق کا خلیفہ زادہ غیاث الدین سے عقیدت کا واقع مفصل لکھا ہے۔ خلیفہ مستنصر باللہ کے سلسلہ کا ایک عباسی خلیفہ زادہ غیاث الدین کسی سبب سے ترکستان چلا آیا اور وہاں حضرت قثم بن عباسؓ کے مزار پر سالہا سال مجاور رہا۔ جب سلطان محمد کی خاندانِ عباسیہ سے عقیدت کا آوازہ پھیلا تو غیاث الدین نے ترکستان سے اپنے دو سفیر سلطان کے پاس بھیجے بغداد کے جو لوگ ہندوستان میں مقیم تھے انھوں نے خلیفہ زادہ کی صحیح النسبی کی شہادت دی۔ سلطان نے عریضہ بھیجا اور بڑی منت سے خلیفہ زادہ کو ہندوستان بلایا۔ جب وہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا تو امراء کو استقبال کے لئے بھیجا۔ جب سرستی تک سواری پہنچی تو قاضی القضاۃ صدر جہاں کمال الدین غزنوی اور دوسرے علماء استقبال کے لئے روانہ ہوئے۔ جب دہلی سے باہر مسعود آباد میں پہنچا اور سلطان نے خود پیادہ پا ہو کر خلیفہ زادہ کی رکاب تھامی۔ بڑے تزک و احتشام سے یہ سواری دہلی پہنچی۔ غیاث الدین کو شاہی مہمان رکھا گیا۔ مخدوم زادہ خطاب ہوا۔ دربار میں وہ آتا تو سلطان خود اٹھکر تعظیم کرتا۔ ایک مرتبہ سلطان کی کوئی بات غیاث الدین کو ناگوار ہوئی۔ تو سلطان نے اس انداز میں معافی مانگی "مخدوم زادہ! مجھے اپنی برائت کا اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک یہ پائے مبارک

---

[۱] قصائد بدر چاچ - ص ۱۵ - (مطبوعہ کانپور ۱۸۷۳ء)
[۲] تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۴۹۲ -

میری گردن پر نہ ہو۔" خلیفہ زادہ نے کہا "مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا تو سلطان نے خود اپنا سر زمین میں ڈال کر اس کا قدم اپنی گردن پر رکھا۔ ابن بطوطہ یہ واقع لکھکر کہتا ہے کہ "یہ ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جو کسی بادشاہ کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔" [۱]

ہندوؤں سے برتاؤ | جب کسی سلطان کے مذہبی جذبات و رجحانات کا ذکر کیا جاتا ہے تو معاً لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کے عہد میں غیر مسلموں پر ضرور ظلم و ستم روا رکھا گیا ہوگا حالانکہ یہ خیال تاریخی شواہد کے بالکل خلاف ہے۔ صحیح مذہبی جذبات، کبھی انصاف اور رواداری میں حائل نہیں ہوئے۔ چنانچہ محمد بن تغلق نے ہندوؤں کے ساتھ میل جول، انصاف و رواداری کی وہ مثال قائم کی ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ جن مورخوں نے اس کی مطلق العنانی، استبداد اور خوں ریزی کی داستانیں نہایت بلند آہنگی سے مشہور کی ہیں انھوں نے سلطان کو کبھی ایک ہندو کے استغاثہ پر مجرم کی حیثیت سے قاضی کی عدالت میں کھڑے ہوئے نہیں دیکھا۔ عدل گستری اور انصاف پروری کی ایسی مثال تاریخ کے صفحات میں تلاش سے بھی نہیں ملے گی۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ سلطان نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیئے جہاں بھی اسے جوہر نظر آیا اس نے بلا امتیاز مذہب و ملت اس کی قدر کی۔ رتن کا واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ کس طرح ایک امیر کی سفارش پر دربار سلطانی میں باریاب ہوا۔ سلطان نے جب اس کی اہلیت اور صلاحیت کا اندازہ کر لیا تو اس کو سندھ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اور علم اور نوبت رکھنے کی اجازت جو بقول ابن بطوطہ صرف بڑے بڑے امیروں کو دی جاتی تھی اس کو بھی دی۔ [۲]

اس کو ہندوؤں پر اس قدر اعتماد اور بھروسہ تھا کہ بڑے بڑے قلعے ان کی سپردگی میں دیئے فرشتہ نے بتایا ہے کہ بھرن رائے جو قلعہ گلبرگہ کو بھیجدیا گیا تھا سلطان کے نہایت معتبر حکام

---

[۱] عجائب الاسفار۔ از ابن بطوطہ ص ۱۲۸۔ ۱۲۵۔ [۲] ایضاً ص ۱۳۸ و ۱۳۷

[۳] " " " ص ۱۰

میں سے تھا۔[1] دھارادھر کو دیوگیر کا نائب وزیر[2] اور دیوان اسلوب[3] مقرر کیا۔

جہاں تک عام ہندوؤں کا تعلق تھا۔ برنی نے "فتاوی جہانداری" میں ان کی حالت لکھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو آرام اور آسائش سے زندگی بسر کرتے تھے دارالسلطنت دہلی میں "رائے" "ٹھاکر" "ساہو" "مہنت" "پنڈت" کے معزز القاب سے مخاطب کئے جاتے تھے مذہبی کتابیں اور سنسکرت پڑھنے کی پوری پوری آزادی تھی۔[4] آثار قدیمہ کے کچھ کتبوں سے بھی ہندوؤں کی آسودہ حالی اور فارغ البالی کا پتہ چلتا ہے۔ سنہ ۱۳۸۴ وکرمی مطابق سنہ ۱۳۲۷ء کا ایک سنسکرت کتبہ ملا ہے جو سریدھارا نامی برہمن نے دہلی کے قریب ایک کنوئیں پر کندہ کرایا تھا اس میں سلطانِ وقت محمد بن تغلق کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔[5]

ودیاپتی ٹھاکر[6] کی مشہور کتاب "پرس پرشکا" میں جو چودہویں صدی کے آخر میں لکھی گئی ہے سلطان کے ہندوؤں سے اچھے برتاؤ کا ثبوت ملتا ہے۔[7] ابن بطوطہ نے بتایا ہے کہ سلطان جوگیوں کی بہت تعظیم کرتا تھا اور ان کو اپنی صحبت میں رکھتا تھا۔[8]

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ از قاسم فرشتہ۔ [2] برنی۔ [3] حج الدبیر ج ۳ ص ۸۷۴

[4] فتاوی جہانداری۔ از ضیاء الدین برنی۔ (انڈیا آفس ۲۵۶۳)
بحوالہ ڈاکٹر آغا مہدی حسین XIV و XIII P.

[5] Catalogne of the Delhi Museum of Archaeology, Compiled by J. P. Vogel (Calcutta Baptiot Mission Press 1908) P. 29.

[6] ودیاپتی ٹھاکر۔ بہار کا ایک مشہور شاعر تھا۔ یہ کتاب سنہ ۱۳۸۵ء میں دیوا سمہا کے عہد میں تصنیف ہوئی تھی۔
Indian Antiquary XIV July 1885 – "Vidyapatti & his Coutemporaries" by Grierson.

[7] Vidayapati Ihakkur: Purusa Pariksa. (Allahabad. 1912) PP. 20-24, 41-44.

[8] عجائب الاسفار۔ ابن بطوطہ ص ۲۶۶۔

بیت المقدس پر اجمالی نظر

از جناب منشی عبد القدیر صاحب دہلوی

(۲)

ایک اور بزرگ کا قول ہے کہ الواح میں خدا بیت المقدس کے صخرہ سے کہتا ہے کہ تو میرا عرش ہے۔ تو میرے قریب ہے میں نے آسمانوں کو تیری جڑ سے اٹھایا ہے اور تیرے نیچے میں نے زمین کو بچھایا ہے اور تمام دور دراز مشکل اور دشوار گذار پہاڑ تیرے نیچے ہیں جو تیرے اندر مر گیا گویا وہ آسمانی دنیا میں مرا ہے اور جو تیرے گرد مر گیا گویا وہ تیرے اندر مرا ہے۔ دن اور رات کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہو گا جب تک کہ میں تجھ پر آسمانی روشنی نہیں بھیجوں گا۔ اور میں تجھکو دھوؤں گا یہانتک کہ تو دودھ کی طرح سفید ہو جائے گا۔ اور میں تجھ پر ایک دیوار قائم کرونگا جو زمین کے گھنے بادلوں سے بارہ میل اونچی ہوگی۔ اور جو روشنی تجھ پر ڈالوں گا وہ آدم کے کافر بیٹوں کا وجود اور ان کے نقش قدم مٹا دیگی۔ اور میں تجھ پر ملائکہ اور انبیاء کے گروہ بھیجوں گا اور ایک نور کی جھاڑی بھی تجھ پر پیدا کروں گا میں اپنے ہاتھ سے تیری مدد اور نیکی کی ضمانت لونگا اور میں تجھ پر اپنی ارواح اور اپنے فرشتوں کو نازل کروں گا تاکہ تیرے ساتھ عبادت کریں۔ نہ آدم کی اولاد میں سے کوئی قیامت سے پہلے تیرے اندر داخل ہو گا اور جو کوئی دور سے اس معبد کو دیکھیگا اس پر برکتیں نازل ہوں گی۔ جو تیرے اندر عبادت کرتا ہے میں تجھ پر نور کی دیوار اور گہرے بادلوں کی جھاڑی رکھوں گا۔ یعنی لعل اور موتیوں کی پانچ دیواریں۔

کتاب زبور میں آیا ہے کہ اے بار آور فرش تو بزرگ ہے تو عظیم ہے۔ تجھ پر حشر برپا ہو گا اور تجھ سے تمام خلقت موت کی نیند سے اٹھیگی۔

مزید براں اسی مصنف سے روایت ہے کہ خدا تعالیٰ صخرۂ بیت المقدس سے کہتا ہے کہ جو تجھ کو محبوب رکھتا ہے میں اس کو محبوب رکھوں گا جو تجھ سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے جو تجھ سے نفرت کرے گا میں اس سے نفرت کرونگا۔ سال بسال میری نگاہیں تجھ پر لگی رہتی ہیں اور جب تک میں اپنی آنکھ کو فراموش نہیں کرسکتا تجھ کو بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ جو کوئی تیرے اندر دو رکعت نماز پڑھ لے میں اس کے سب گناہ بخش دوں گا اور ایسا معصوم بنا دونگا گویا ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے بشرطیکہ وہ معاصی کی طرف پھر رجوع نہ کرے اور ان کو از سرِ نو شروع نہ کردے۔

یہ بھی ایک پرانی روایت ہے کہ خدا صخرہ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ میں ہر اس شخص سے جو اس میں رہے پختہ عہد و وعدہ کرتا ہوں کہ تمام عمر ہر روز اس کو روٹی اور زیتون کا تیل پہنچاتا رہونگا اور گردش لیل و نہار اس کو ضرور وہ دن دکھائے گی جبکہ میں اپنی انتہائی نوازش سے تمام خلقت کو انصاف کرنے کے لئے تجھ پر اتار دوں گا جبکہ تمام مردے جی اٹھیں گے۔

ایک یہ بھی روایت ہے کہ مقاتل بن سلیمان اس مسجد میں نماز پڑھنے آئے اور دروازہ کے پاس بیٹھکر صخرہ کو دیکھنے لگے اور وہاں ہماری بہت بڑی جماعت جمع تھی۔ وہ پڑھ رہے تھے اور ہم سن رہے تھے اتنے میں علی بن البدوی سلیپر پہنے ہوئے فرش پر زور زور سے چلتے ہوئے آگے بڑھے اس سے ان کو بہت تکلیف ہوئی اور انھوں نے حاضرین سے کہا کہ مجھ کو راستہ دو، لوگ اُدھر اُدھر ہٹ گئے اور انھوں نے ان کو دھمکاتے ہوئے تنبیہ کی کہ دھماکے سے نہ چلیں، اور کہا آہستہ چلو اور ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا کہ جہاں مقاتل ہے اور جہاں تم زور سے چل رہے ہو وہی مقام ہے جہاں جنت کی ہوائیں بسی ہوئی ہیں اور اس کے اردگرد کوئی مقام ایسا نہیں ہے اور اس کے احاطہ میں بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں کسی پیغمبر یا مقرب فرشتے نے نماز نہ پڑھی ہو۔

ام عبداللہ بنت خالد اپنی ماں سے روایت کرتی ہیں کہ وہ ساعت یقیناً مقرر ہے جبکہ

کعبہ دلہن کی طرح صخرہ کے پاس لیجایا جائے گا اور اس پر تمام حج کی برکات لٹکی ہوئی ہوں گی اور وہ اس کا عمامہ بن جائیں گی۔

یہ بھی مروی ہے کہ الصخرہ مسجد کے وسط میں ہے اور معلق ہے سوائے اس ذات کے جو آسمان کو تھامے ہوئے ہے اس کا کوئی سہارا نہیں ہے یہ اس کی حکمتِ بالغہ ہے کہ کوئی شے اس کی مشیت کے بغیر نہیں گرتی اس کے مغربی گوشہ پر رسول مقبول کھڑے ہوئے تھے جب کہ وہ شب معراج براق پر سوار ہو رہے تھے یہ گوشہ آپ کی تعظیم میں کانپنے لگا اور دوسرے گوشہ پر فرشتوں کی انگلیوں کے نشان ہیں جنھوں نے اسے لرزنے سے باز رکھا تھا اس کے نیچے دونوں سروں پر سوراخ ہے جس پر دروازہ ہے اسی دروازہ سے لوگ عبادت کیلئے داخل ہوتے ہیں۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ ایک روز میں نے بھی داخل ہونے کا تہیہ کیا کیونکہ مجھے یہ ڈر تھا کہ میرے گناہوں کی وجہ سے یہ مجھ پر گر پڑیگا۔ میں نے اس کی سیاہی کو دیکھا کہ بہت سے زائرین اس کے سیاہ ترین حصے میں گئے اور گناہوں سے پاک وصاف باہر نکلے۔ میں پھر داخلہ کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے دل میں کہا غالباً یہ لوگ بہت آہستہ آہستہ داخل ہوئے اور میں نے بہت جلدی کی۔ بہت ممکن ہے کہ تھوڑی سی آہستگی مفید ثابت ہو چنانچہ میں نے داخل ہونے کا عزم کر ہی لیا اور داخل ہو کر میں نے عجیب وغریب بات دیکھی کہ صخرہ ہر پہلو اور ہر طرف سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا کیونکہ میں نے اس کو زمین سے ادھر پایا۔ بعض پہلو البتہ زمین سے دور تھے بعض کم۔ قدم مبارک کا نقش آج کل علیحدہ پتھر پر اس کے بالکل سامنے اوپر کو ایک ستون پر رکھا ہوا ہے اور یہ قبلہ کے مغرب میں ہے۔

آج کل الصخرہ حجرے کے کنارے پر ہے درمیان میں صرف اتنا فاصلہ ہے کہ حجرہ کا دروازہ کھل سکے یہ دروازہ قبلہ سے بھی ہٹا ہوا ہے یعنی دونوں کے درمیان ہے۔ حجرے کے دروازہ کے نیچے پتھر کی سیڑھیاں ہیں جن کے ذریعہ آدمی حجرے میں اتر سکتا ہے۔ اس حجرے (تہ خانہ) کے وسط میں گہرے بھورے رنگ کا چمڑے کا قالین بچھا ہوا ہے جس پر زائرین کھڑے ہوتے ہیں جس وقت

وہ الصخرہ کی بنیاد دیکھنے آتے ہیں۔ یہ مشرق کی جانب ہے قبلہ کے رخ جو درختوں کی قطار ہے اس کے نیچے لگواں لگوں سنگِ مرمر کے ستون ہیں اور دوسری طرف بھی الصخرہ کے آخری کنارے کی اڑواڑ کے طور پر لگے ہوئے ہیں یہ اس لئے ہیں تاکہ قبلہ کی طرف اس کو لرزنے سے روکیں۔

ان کے علاوہ اور بھی عمارتیں ہیں۔ الصخرہ کے صومعہ میں ایک عمارت ہے۔ صومعہ کے نیچے مغربی جانب وہ جگہ ہے جہاں فرشتوں کی انگلیوں کے نشان ہیں یہ مذکورہ بالا نقش قدم شریف سے بہت قریب آخر میں مغربی دروازہ کے مقابل ہے۔

ڈاکٹر رابنسن لکھتے ہیں کہ حضرت محمد صلعم کے پیروؤں نے سنہ ۶۳۶ء میں حضرت عمرؓ کی سرکردگی میں بیت المقدس فتح کیا اور خلیفہ نے ارادہ کیا کہ یہودیوں کے صومعہ کی جگہ پر مسجد تعمیر کریں۔ یروشلم کے عنوان کے تحت میں مسلمان مورخوں کی زبانی اس تعمیر کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ صلیبی جنگوں کے مورخ بالاتفاق اس عظیم الشان صخرہ کو خدا کا گھر "Temple Domini" کہتے ہیں اور اس کی وضع قطع اور اس کی اندرونی چٹان کو بیان کرتے ہیں۔

لفٹنٹ اے آر کونڈر۔ رائل انجنیر لکھتے ہیں کہ قبۃ الصخرہ عربی فنِ تعمیر کے اس ابتدائی عہد کی یادگار ہے جبکہ ان کی تعمیر نے اپنی خاص طرز پیدا نہیں کی تھی اور وہ اپنی مسجدیں بنانے کے لئے بازنطینی معماروں سے کام لیتے تھے۔ لفٹنٹ مذکور کہتے ہیں کہ قبۃ الصخرہ بذاتہ مسجد نہیں ہے جیساکہ غلطی سے اس کو مسجد کہا جاتا ہے بلکہ مسجد اقصیٰ کے بیرونی صحن میں قیام کرنے کی ایک جگہ ہے

قبۃ الصخرہ کی تعمیری تاریخ لفٹنٹ کونڈر نے اس عمارت کی بتدریج تعمیر کے حالات اس طرح لکھے ہیں کہ سنہ ۸۳۱ء میں خلیفہ المامون نے قبۃ الصخرہ کو دوبارہ تعمیر کیا اور اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو بیرونی دیوار سے اس کا احاطہ کیا اور اس کو موجودہ شکل میں لایا جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ چھتہ کی چھت کی کڑیوں پر سنہ ۹۱۳ء تاریخ درج ہے۔ بہت عمدہ کھدی ہوئی لکڑی کی گرونی جو موجودہ خاتم بندی کی چھت گیری کے نیچے چھپ گئی ہے پہلے ضرور نیچے سے نظر آتی ہوگی۔ سنہ ۱۰۱۶ء میں زلزلے سے اس عمارت کا ایک حصہ منہدم ہو گیا اسی سنہ میں گنبد کے قدیمی پچیکاری کے کام کی مرمت ہوئی

جیسا کہ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کتبہ کا موجودہ لکڑی کا کام حسین بن سلطان حکم کا بنوایا ہوا ہے جیسا کہ کتبہ مورخہ ۱۰۲۲ء سے ظاہر ہوتا ہے۔

بعد میں یہ عمارت صلیبیوں کے قبضے میں آئی جنھوں نے اس کا نام خدا کا گھر Temple Domini رکھا۔ صخرہ مقدس موجودہ شکل میں تراشا گیا اور سنگ مرمر کے چوکے بچھا دیئے گئے اور اس پر قربان گاہ بنائی گئی۔ یہ کام ۱۱۱۵ء سے ۱۱۳۶ء تک ہوتے رہے گنبد کے ستونوں کے درمیان لوہے کا خوبصورت کٹہرا اور نقش ونگار کے مختلف کام مع چند چھوٹی چھوٹی قربانگاہوں کے جن پر مورتیں بنی ہوئی ہیں اور جو مسلمانوں کے لئے قابلِ نفرت ہیں یہ سب اس زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ بیرونی دیواروں پر اندر کی جانب بارہویں صدی میں یہ تصویریں بنائی گئی تھیں جن کے آثار ابتک باقی ہیں۔ چھوٹی دیوار کے اوپر باہر کے رخ چاروں طرف منڈیر بنی ہوئی ہے جس میں چھوٹے چھوٹے ستون اور محرابیں بھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیوں نے منڈیر کی محرابوں کو تیغہ لگا کر اوپر سے شیشے کی پچیکاری کی تھی جیسی انھوں نے بیت لحم میں کی تھی۔

۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے اس شہر کو فتح کیا تو قربانگاہ کو کھود ڈالا اور پھر محض چٹان نکل آئی۔ بتوں کی تصویروں کو سنگِ مر کی سلوں سے ڈھانک دیا اور قبۃ الصخرہ کی مرمت کی۔ سنہری رنگ بھروایا جیسا کہ ۱۱۸۹ء کے کتبہ سے ظاہر ہے۔

۱۳۱۸ء میں نکیر الدین نے باہر کے شیشے اور اندر کے سنہری کام کی تجدید کی جیسا کہ کتبہ سے واضح ہوتا ہے۔ ۱۵۲۰ء میں سلطان سلیمان نے ستونوں کے پر گول اور اوپر کے حصوں پر سنگ مرمر لگوادیا۔ لکڑی کی کانس جو ستونوں کی درمیانی کڑی سے متصل ہے اسی زمانہ کی معلوم ہوتی ہے اور گنبد کے نیچے کی محرابوں کا سنگِ مرمر کا ہلکا سا نوکدار خول بھی شاید اسی زمانہ کا ہے۔ دریچوں پر ۱۵۲۸ء تاریخ کندہ ہے جیسا کہ ۱۵۶۱ء کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے۔ دروازے ۱۵۶۴ء میں بنائے گئے۔ حجروں کی خوبصورت لکڑی کی خاتم بندی کی چھت گیری کی تاریخ نامعلوم ہے البتہ اس سے بعض کوفی کتبے چھپ گئے ہیں جو ۳۰۲ھ یا ۱۸۸۰ء کے ہیں۔ نیز لکڑی کی گردنی بھی جو غالباً ۹۱۳ء

کی ہے اس میں پوشیدہ ہو گئی ہے لہذا یہ چھت گیری غالباً حضرت سلیمانؑ کے عہد کی ہے۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں سلطان محمود اور سنہ ۱۸۷۳ء میں سلطان عبدالعزیز نے قبہ کی مرمت کرائی اور موخر الذکر زمانہ ان لوگوں کے لئے خصوصاً نایاب تھا جو اس جگہ کا تاریخی مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ اس عمارت کی تاریخی تعمیر کا تدریجی سیدھا سادھا حال ہے۔ دیواروں کے کتبوں کی تاریخیں ان عربی مورخوں کے مفصل بیانات کے بالکل مطابق ہیں جنھوں نے قبۃ الصخرہ کا حال لکھا ہے۔

بیت المقدس کی شرعی حیثیت | قرآن مجید میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ الفاظ کے ساتھ تو کہیں ذکر نہیں لیکن حسب ذیل اذکار ضرور ہیں:۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ	پاک ہے وہ (خدا) جو رات میں لیگیا اپنے بندے کو
الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا	مسجد حرام سے طرف مسجد اقصیٰ کے جس کے
الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا	گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی کچھ
اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝	نشانیاں دکھائیں تحقیق وہ سنتا دیکھتا ہے۔

مسجد الحرام خانہ کعبہ اور اس کے آس پاس کی جگہ یعنی صحن اور مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔ معراج کے واقعہ سے ہر مسلمان واقف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سیر اس لئے کرائی تھی کہ خدا تعالیٰ آنحضرتؐ کو اپنے نشان قدرت اور عالم غیب کی چیزیں دکھائے منجملہ ان کے جنت و دوزخ کے چشم دید حالات اور ملائکہ و عالم قدس کے لوگوں کی کیفیت تاکہ نبوت کے مرتبہ کی تکمیل ہو جائے جو تمام عالم کے نبی کے لئے ضروری تھی۔

یہ واقعہ معراج محققین کے نزدیک ہجرت سے ایک سال پیشتر رجب کے مہینے میں ۲۷ ویں شب کو ہوا تھا۔

مسجد اقصیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہ چکا ہے۔

اس کے گرد و پیش جو برکتیں نازل فرمائی گئی تھیں وہ دینی بھی تھیں اور دنیاوی بھی جیسے کہ مفسرین نے اس آیتہ کی تصریح کی ہے کہ:۔

بارکات الدین والدنیا لانہ مہبط	بیت المقدس کے گرداگرد دین و دنیا کی برکتیں
الوحی والملائکۃ ومقر الانبیاء و	نازل کی ہیں کہ وہ وحی اور فرشتوں کے اترنے کا
متعبد الانبیاء من لدن موسی	مقام اور انبیاء کرام کے رہنے کی جگہ اور موسیٰ
علیہ السلام وقبلۃ الانبیاء قبل	کے زمانہ سے انبیاء کی عبادت گاہ اور انبیاء علیہم السلام
نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم والیہ	کا قبلہ ہے اور قیامت کو مخلوق اسی زمین میں
تحشر الخلق یوم القیامہ ومحفوف	محشور ہوگی اور ہر طرف سے نہریں اور باغ سے
بالانہار والاشجار المثمرۃ	گھیرے ہوئے ہیں۔

اسی میں خدا کا مظہر تجلی جبلِ طور اور اسی میں مقدس وادی طویٰ ہے جن کا آیاتِ ذیل میں خاص عزت واحترام کے ساتھ ذکر ہے:۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ	جب موسیٰ نے مدت پوری کرلی اور اپنی اہلیہ کو
بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا	لیکر چلے، طور کی ایک جانب آگ دیکھی، اپنی اہلیہ
قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ	سے فرمایا کہ ٹھیرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں
نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ	اس کے پاس سے کوئی خبر یا کوئی چنگاری
مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ۔	لے آؤں تاکہ تم تاپ لو۔
فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ	پھر جب آگ کے پاس گئے تو برکت والی زمین میں
الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ	وادی ایمن کے کنارے درخت کی طرف سے
الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ	آواز آئی کہ اے موسیٰ بیشک میں ہوں اللہ
رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	رب سارے جہانوں کا۔

یہ وادی طویٰ وہی مقدس وادی ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا	جبکہ موسیٰ نے آگ دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا ٹھیرو
اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ	بے شبہ میں نے آگ دیکھی ہے شاید کہ میں

مِنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ	تمہارے پاس اس میں سے انگارا لے آوں یا آگ
هُدًى ۝	پر کوئی راہ بتانیوالا مل جائے۔
فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى اِنِّيْٓ	پھر جب آگ کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰؑ
اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ	میں ہوں تمہارا پروردگار پس اتار دو دونوں جوتیاں
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝	اپنی بیشک تم مقدس وادی طویٰ میں ہو۔
عن الحسن رضی اللہ عنہ فی	حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس وادی
قولہ بالواد المقدس قال واد	طوی کا ذکر ہے یہ فلسطین کی وادی ہے جو کہ بعد
بفلسطین قدس مرتین (درمنثور)	دیگرے دو مرتبہ پاک و مقدس کی گئی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اتارنے کی تلقین اس لئے کی گئی تھی کہ ان کے تلوے اس پاک و مقدس زمین سے مس کرکے برکت حاصل کریں۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ	اور جب کہا ہم نے داخل ہو تم اس گاؤں میں پس
فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ	کھاؤ اس سے جہاں چاہو تم بافراغت اور
رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا	داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو
وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ	بخشش مانگتے ہیں ہم

البیضاوی لکھتے ہیں کہ یہ گاؤں بیت المقدس (یروشلم یا اریحا) تھا۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ	یا مانند اس شخص کے کہ گزرا اوپر ایک گاؤں کے اور
خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى	وہ گرا ہوا تھا اوپر چھتوں اپنی کے کیونکہ زندہ کریگا
يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ	اس کو اللہ پیچھے موت اس کی کے۔

حدیث ہے کہ حضرت الیاسؑ یا حضرت خضرؑ نے بیت المقدس کو تباہی کے بعد دیکھا تھا جسے بخت نصر نے تباہ کیا تھا۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ	اے قوم ارض مقدس میں جو تمہارے لئے اللہ پاک

الَّتِی کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا نے لکھدی ہے داخل ہو جاؤ اور پیٹھ دیکر اُلٹے
عَلٰٓی اَدْبَارِکُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ نہ پھرو ورنہ خسران میں پڑ جاؤ گے۔

یہ ارض مقدس فلسطین کا علاقہ ہے اس پاک سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کی دائمی وابستگی
ان احادیث سے ثابت ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لا تشد الرحال الا الی ثلثۃ سوائے تین مسجدوں کے اور کسی (مسجد) کے لئے
مساجد مساجد الحرام والمسجد سفر طویل نہ کیا جائے ایک مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ
الاقصی ومسجد ھذا (مشکوۃ) اور میری یہ مسجد (یعنی مسجد نبوی)

اس سے ثابت ہے کہ مسجد حرام یعنی کعبۃ اللہ مسجد نبوی اور مسجدِ اقصیٰ ایک ہی لڑی کے
تین انمول موتی ہیں اسی سلسلے میں آپ نے فرمایا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی کی اپنے گھر میں نماز تو ایک نماز ہے اور
صلوۃ الرجل فی بیتہ بصلوۃ وصلوۃ مسجد محلہ کی نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے
فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوۃ اور جامع مسجد کی نماز پانچسو نمازوں کے برابر
وصلوۃ فی المسجد الذی یجمع فیہ بخمس اور انسان کی مسجدِ اقصیٰ میں ایک نماز
مائۃ صلوۃ وصلوۃ فی المسجد الاقصی پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور اس کی
بخمسین الف صلوۃ وصلوۃ فی مسجدی میری مسجد میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے
بخمسین الف صلوۃ وصلوۃ فی المسجد الحرام برابر ہے اور مسجد حرام کی نماز ایک لاکھ
مائۃ الف صلوۃ (مشکوۃ۔ ابن ماجہ) نمازوں کے برابر ہے۔

ان کے علاوہ قیامت تک کے تعلق کا یوں پتہ چلتا ہے کہ قرب قیامت کی ایک علامت
یہ ہوگی کہ موذن قریب سے اذان دیگا (یعنی ایسی جگہ سے جہاں سے سب سن سکیں) حسین کہتے ہیں کہ
اس مقامِ قریب سے یروشلم کا معبد مراد ہے۔

بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ (Distinct Mosque.) کے بارے میں

جلال الدین السیوطی مفسر قرآن نے بھی تفسیر جلالین میں جو قدر و منزلت ظاہر کی ہے اس سے انتہائی بزرگی معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ اعلیٰ عبادت گاہ اور زیارت گاہ ہے یہی وہ اعلیٰ اور برتر مقام تھا جہاں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے توبہ و استغفار کی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں خدا تعالیٰ نے اپنے فرشتہ حضرت جبرئیلؑ کو حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجا تھا۔ یوحنا (John) اور ذکریاء (Zachariaa) کو بشارت دی تھی۔ حضرت داؤدؑ کو مسجد اقصیٰ کا نقشہ دکھایا تھا۔ روئے زمین کے کل چرند و پرند کو آپ کے تابع بنایا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں نے قربانیاں دیں۔ حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور اپنے پنگوڑے میں گویا ہوئے اور یہیں سے آسمانوں پر اٹھائے گئے اور یہی وہ مقام ہے جہاں دوبارہ آسمانوں سے زمین پر اتریں گے۔

یاجوج ماجوج روئے زمین پر استیلا حاصل کریں گے سوائے یروشلم کے اور یہی وہ مقام ہوگا جہاں خدائے قادر ان کو نیست و نابود کر دے گا۔ یہی وہ متبرک مقام ہے جہاں حضرت آدمؑ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت مریمؑ دفن ہیں اور قیامت کے قریب بالعموم یروشلم کی طرف لوگ ہجرت کریں گے اور "کشتی" (Ark.) اور شیخینہ (Schechinah) "معبد" کو دوبارہ حاصل ہو جائے گا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں یوم حشر میں تمام بنی آدم دوبارہ زندہ ہو کر فیصلہ کیلئے اکٹھے ہونگے اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے جلوس کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں جلوہ گر ہوگا اور انصاف کریگا۔

الحاصل یہی وہ مقام ہے جو صدہا انبیاء و مرسلین کا مولد ہے۔ صدہا کا مسکن رہا ہے اور صدہا کا مدفن ہے اور صرف مسلمان ہی اس کی حفاظت کے اہل ہو سکتے ہیں اس لئے کہ صرف وہ ہی بلا تخصیص جملہ انبیاء و مرسلین کو داخل ایمان و برحق مانتے ہیں۔

علاوہ بریں حج کے موقع پر جو لوگ یہاں سے احرام باندھتے ہیں ان کو زیادہ ثواب ملتا ہے

سنہ ۴۲ء:۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ ر

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ ر

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں قیمت سے مجلد ہے

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ

سنہ ۴۳ء:۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ ورفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپئے مجلد سات روپئے۔

خلافتِ بنی امیہ:۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات سے مجلد ہے

سنہ ۴۴ء۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ ر

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ ر

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ ر

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

سنہ ۴۵ء۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عا مجلد سے ر

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ہے ر

انقلابِ روس۔ انقلاب روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد سے ر

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسن خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرولباغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبا کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۳۹ء:۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ۳؍ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد بہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳؍ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۴؍

۴۲ء:۔ نبی عربی صلعم:۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرتِ سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن:۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد سے

غلامانِ اسلام:۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد بہ

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ مجلد بہ

۴۱ء:۔ قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت صہ مجلد بہ

بین الاقوامی سیاسی معلومات:۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحیِ الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپیہ مجلد ۳؍

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

بُرہان

جلد ششم　　　　　　　　　　　　　　　شمارہ (۴)

اپریل ۱۹۴۶ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ

فہرست مضامین

۱۔ نظرات　　　　　　سعید احمد اکبر آبادی　　　　۱۹۴

۲۔ ہندوستان کے پہاڑی علاقہ میں
ایک جاپانی راجدھانی　　　　جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی　　　　۱۹۹

۳۔ زندگی اور علم النفسیات　　　　جناب سید مغنی الدین صاحب شمسی ایم، اے　　　　۲۱۱

۴۔ مُنّی بیگم
ایسٹ انڈیا کمپنی کی محسنۂ خاص　　　　پروفیسر پریم ناتھ بھلا صاحب ایم، اے　　　　۲۳۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

"علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" والی روایت اسناد کے اعتبار سے خواہ کیسی ہی مجروح اور ضعیف ہو بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ معنی کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے کیونکہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہوجانے کے بعد اگر کوئی جماعت بھی ایسی نہ ہو جو پیغمبرانہ طریق پر حق کی تبلیغ واشاعت کرے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا کی طرف سے لوگوں کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کا صراطِ مستقیم دکھانے کا جو کام تاریخ کے ہر دور میں انجام پاتا رہا ہے وہ رک جائے اور جو گمراہ ہوگئے ہیں ان کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے۔

پھر چونکہ انبیائے کرام نے کلمۂ حق کی تبلیغ علم اور عمل دونوں سے کی ہے اس بنا پر اب اساسًا دو سوال قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ انبیائے کرام خود کیسے ہوتے تھے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ حق کا پیغام لوگوں تک کس طرح پہنچاتے تھے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے ہر شخص جانتا ہے کہ انبیائے کرام کی زندگی نہایت پاکبازانہ اور متقیانہ ہوتی تھی۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا تھا اور ان کی خارجی اور داخلی زندگی میں کوئی فرق اور امتیاز نہ ہوتا تھا۔ لیکن انبیائے کرام کی زندگی کے عملی پہلو سے متعلق ہمیں جس چیز کو زیادہ نمایاں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ انبیائے کرام عوام کے ساتھ بے تکلفی سے ملتے جلتے اور ان کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ ان کی زندگی کا ہر سانس تبلیغ کے لئے وقف تھا۔ یہانتک کہ ان کی نشست و برخاست اور ان کا سونا اور جاگنا اور ان کا کھانا اور پینا یہ سب چیزیں اپنے اندر ایک مستقل دعوتِ حق رکھتی تھیں۔ پھر اس سلسلہ میں ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ انبیائے کرام نے اپنی دعوت کے لئے کبھی کوئی اجر یا معاوضہ نہیں قبول کیا۔ خود درویشانہ زندگی بسر کی مگر دوسروں کو افسر و اورنگ کا مالک بنا دیا۔ جب کبھی ان کے سامنے اس قسم کا کوئی سوال آیا تو انھوں نے بے تامل یہی فرمایا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللہ" یعنی میرا اجر تو صرف خدا کے ذمہ ہے۔"

اس سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ جن علمائے اسلام کو وراثتِ نبوت کا شرف حاصل ہو

انھیں لازمی طور پر انبیائے کرام کے اسی نقش قدم پر چلنا چاہئے یعنی یہ کہ ان کی زندگی ورع وتقویٰ کی مثال ہو۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ اربابِ دنیا اور اصحابِ ثروت سے ان کو کامل استغنا ہو وہ کسی غیر اسلامی نظامِ حکومت وریاست کے (چاہے وہ حکومت وریاست مسلمان ہی کیوں نہ کہلاتی ہو) نہ نوکر ہوں اور نہ وظیفہ خوار ہوں۔ اربابِ دولت ان کے پاس آئیں لیکن وہ خود کبھی کسی رئیس یا دولت مند کے مکان پر نہ جائیں۔ یہاں سوال جائز اور ناجائز، مباح اور غیر مباح کا نہیں ہے مقصد صرف یہ ہے کہ وارثین نبوت کا کیرکٹر عام ضابطۂ اخلاق واحکام سے بھی بہت اونچا ہونا چاہئے کوئی شخص کلمۂ حق کے اظہار میں خواہ کتنا ہی بیباک ہو۔ پھر بھی کسی مادی طاقت کی نوکری کرنے یا اس کے وظیفہ خوار ہونے سے یک گونہ مداہنت فی الدین کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں سے جو آج کل عام ہو گئی ہیں ہمارے علمائے سلف بڑی سختی سے دامن کشاں رہتے تھے۔ مولانا رومی نے اپنے ملفوظات "فیہ ما فیہ" میں اور علامہ ابن عبدالبر نے "جامع بیان العلم" میں اور علامہ ابن جوزی نے اپنے ملفوظات خواطر و سوانح میں ان کی شدید مذمت کی ہے۔ آج کل اس قسم کی چیزوں کے لئے عام طور پر بہانہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم تو امراء سے یہ معاملہ اس لئے رکھتے ہیں کہ اس ذریعہ سے کچھ غریبوں کی مدد کر سکیں۔ لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سراسر نفس کا فریب اور شیطان کا دھوکہ ہے۔ چنانچہ حضرت سفیان الثوری نے حضرت عباد بن عباد کو اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں صاف طور پر لکھا ہے "ایاك والامراء ان تدنو منھم او تخالطھم فی شی من الاشیاء وایاك ان تخدع ویقال لك لتشفع وتدرء من مظلوم او ترد مظلمہ فان ذالك خدیعۃ ابلیس" تم امیروں کے قریب جانے یا کسی معاملہ میں ان کے ساتھ میل جول رکھنے سے بچو۔ اور اس سے بچو کہ تم کو یہ کہکر دھوکہ دیا جائے کہ تم امیروں کے پاس اس لئے جاتے ہو کہ کسی کی سفارش کرو گے کسی مظلوم کی طرف سے مدافعت کرو گے یا کسی کا حق اسے دلواؤ گے۔ کیونکہ یہ سب باتیں شیطان کا دھوکہ ہیں۔

مسند امام احمد بن حنبل، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی کی ایک حدیث بروایت حضرت عبداللہ بن عباس ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من اتی ابواب السلاطین افتتن"

جو شخص بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوا فتنہ میں پڑ گیا۔ ابوداؤد کی ایک اور روایت حضرت ابوہریرہؓ کے واسطہ سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ما ازداد احد من السلطان دنوا الا ازداد من اللہ بعداً" جو شخص بادشاہ سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اسی قدر وہ اللہ سے دور ہو جاتا ہے ابن ماجہ کی ایک روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو دین میں تفقہ رکھتے ہوں گے۔ قرآن پڑھتے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہم امراء کے پاس آتے جاتے ہیں اور اس طرح ہم ان کی دنیا سے کچھ حصہ پا لیتے ہیں لیکن ہمارا دین محفوظ رہتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ جس طرح کیکر کے پاس جانے سے کانٹے ہی ملتے ہیں اسی طرح امراء کے پاس جانے سے صرف خطایا ہی حاصل ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک تو یہاں تک فرماتے تھے کہ جو شخص امراء کے پاس جا کر انھیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے وہ ہمارے نزدیک دراصل آمر اور ناہی ہے ہی نہیں۔ اصل آمر و ناہی تو وہ ہی ہے جو ان سے الگ رہ کر انھیں امر و نہی کرے۔

آج یہ بات بہت معمولی سمجھی جائے گی لیکن سچ یہ ہے کہ کلمۂ حق کو موثر بنانے میں اس کا بہت بڑا دخل ہے اور اسی وجہ سے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہمارے علماء سلف اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام و انتظام سے متعلق جو وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا اس میں بھی ان چیزوں سے بچے رہنے کی بڑی سخت تاکید ہے۔ چنانچہ قطع نظر اس سے کہ ذاتی اور شخصی طور پر یہاں کے بعض علماء نے کیا کچھ کیا۔ بہر حال جہاں تک مدرسہ کا تعلق ہے گورنمنٹ آف انڈیا کی بڑی خواہش اور کوشش کے باوجود اکابر دیوبند نے گورنمنٹ کی مالی امداد قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا اور جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے مدرسہ اب تک اس پر عامل ہے۔ ہمیں بنیادی طور پر یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ایک عالم دین بہت بڑا مدرس فقیہ اور صاحب کمال مصنف اور اپنے تقویٰ و طہارت کے باعث ہمارے لئے قابل صد احترام شخصیت کا مالک بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر اس میں امراء اور رؤسا سے کامل استغناء اور بے نیازی نہیں ہے تو وہ سب کچھ ہونے کے باوصف نبوت کی جانشینی کے مقام کا ہرگز اہل نہیں ہے اور ہمیں کبھی اس کو اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔

اب رہا دوسرا سوال یعنی یہ کہ انبیائے کرام کا طریق دعوت و تبلیغ کیا تھا؟ تو اسلامیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس سلسلہ میں انبیائے کرام کے کام کی حسب ذیل خصوصیات رہی ہیں۔

(۱) انھوں نے اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کی۔ اور ان کا کلام قوم کے ہی اندازِ فکر و اسلوبِ فہم کے مطابق ہوتا تھا۔

(۲) قوم کو کلمۂ حق کے ماننے میں جن شکوک و شبہات کی وجہ سے تامل ہوتا تھا انبیائے کرام ان کو بطریق حسن دلائل و براہین کے ذریعہ دور کرتے تھے۔

(۳) قوم میں جو عاداتِ بد اور رسوم قبیحہ سب سے زیادہ نمایاں ہوتی تھیں انبیائے کرام کی توجہ زیادہ تر انھیں کی طرف ہوتی تھی۔

(۴) قوم اگر کسی باطل اور شیطانی حکومت کے استیلا کا شکار ہوتی تھی تو انبیائے کرام قوم کو اس لعنت سے آزاد کراتے تھے اور اس مقصد کے لئے جنگ کرتے تھے۔

(۵) قوم میں سرکشی اور احکام خداوندی سے بغاوت وعدوان جن اسباب سے پیدا ہوتے تھے۔ انبیائے کرام ان اسباب کا قلع قمع کرتے تھے یعنی یہ گمراہی اگر فکر و نظر کی راہ سے آتی تھی تو وہ فکر و نظر کی خامکاریاں آشکارا کرکے ان کی اصلاح کرتے تھے اور اگر اس گمراہی کا سبب ان کا جسمانی اور مادی تفوق اور اسبابِ معیشت و عشرت کی فراوانی کے باعث ان کا غرور و تکبر ہوتا تھا تو انبیائے کرام عذاب الٰہی کے ذریعہ یا ایک جماعت کو ان چیزوں میں ان کا ہمسر و حریف بنا کر اس قوم کی سرکشی کا خاتمہ کر دیتے تھے۔

(۶) اپنے وقت کے تمام موثر اور جائز ذرائع سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ انبیائے کرام کے معجزات وقت کے تقاضہ سے ہم آہنگ ہوتے تھے اور قوم کے لئے جس طریقہ سے بھی کلمۂ حق قابلِ قبول ہو سکتا تھا وہ اس طریقہ کو اختیار کرتے تھے۔

(۷) دین کے احکام الاقدم فالاقدم کے اصول کو پیشِ نظر رکھکر لوگوں تک تدریجی طور پر پہنچاتے تھے یعنی شروع شروع میں ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرت کی دعوت دیتے تھے اور جب کوئی شخص اسی قبول

کر لیتا تھا تو پھر باری باری سے دوسرے احکام و مسائل بتلائے جاتے تھے. گویا ایک نبی بالکل ایک طبیب حاذق و ماہر کی طرح اصل مرض کا سراغ لگاتا تھا اور پھر مزاج اور طبیعت کی مختلف کیفیات کو سامنے رکھکر مرض کا علاج کرتا تھا۔ مرض جس طرح بنیادی طور پر ایک ہی ہوتا تھا مگر اس کا ظہور مختلف مریضوں میں مختلف شکلوں میں ہوتا تھا اسی طرح ان کے لئے جو نسخہ تجویز کیا جاتا تھا وہ بھی اساسی طور پر ایک ہی ہوتا تھا لیکن ہر مریض کے مختلف حالات کے پیش نظر نسخہ کے اجزا کی ترتیب الگ الگ ہوتی تھی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَ	تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو خیر کی
يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	طرف بلائے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے
وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔	اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس ارشادِ ربانی کے مطابق اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھکر غور کیجئے کہ آج دنیا جن گمراہیوں میں مبتلا ہے ان کا استیصال کرنے اور کلمۂ حق کو فروغ دینے کے لئے ہمیں ایک ایسی جماعت پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے جو پیغمبرانہ طریق کار پر اسلام کی تبلیغ کرے اور دنیا کے ہر گوشہ میں پیغام حق کی منادی کرے۔ اس جماعت کو قائم کرنے کے لئے ایک مختصر سا پروگرام اس طرح بنایا جا سکتا ہے

(۱) ایک درسگاہ قائم کی جائے جس میں طلبا کی تعداد بہت محدود ہو۔ ان طلبار کا انتخاب مدارسِ عربیہ اور انگریزی کی قومی تعلیم گاہیں دونوں سے ہو سکتا ہے۔

(۲) ان طلبا سے عہد لیا جائے کہ وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد نہ کوئی ملازمت کریں گے، نہ کسی ریاست کا وظیفہ قبول کریں گے نہ امرار اور رؤسا سے نذرانے اور تحائف لیں گے اور ان کی زندگی اتباعِ سنت کا نمونہ ہوگی۔

(۳) ان طلبار کو اسلامی علوم و فنون پڑھائے جائیں گے اور ساتھ ہی کوئی غیر ملکی زبان انگریزی، جرمنی،

(باقی مضمون صفحہ ۲۵۶ پر ملاحظہ فرمائیے)

ہندوستان کے پہاڑی علاقہ میں ایک جاپانی راجدھانی

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ

یہ ایک استفہامی عنوان ہے، حال ہی میں حدیقۃ الاقالیم نامی ایک فارسی کتاب نظر سے گذری۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد کے ایک مصنف شیخ مرتضیٰ حسین عثمانی بلگرامی کی یہ تصنیف ہے، بظاہر یہ ایک تاریخی کتاب ہے لیکن اور بھی مختلف دلچسپ معلومات کا بیچ بیچ میں مصنف ممدوح تذکرہ کرتے چلے گئے ہیں، سردست دوسری چیزوں سے بحث نہیں بلکہ "سرکار کمایوں" کا عنوان قائم کرکے مصنف نے "انشارِ قلندر" نامی کتاب سے "کمایوں" اور کمایوں میں محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں جو راجہ تھا اس کے اور اس کی حکومت کے بعض چشم دید واقعات جو نقل کئے ہیں، ان ہی کو اس وقت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، ممکن ہے کہ مذکورہ بالا عجیب عنوان کا جواب آپ کو اس میں مل جائے۔

"انشارِ قلندر" کے مصنف یار محمد نامی کوئی صاحب ہیں، شیخ بلگرامی نے لکھا ہے کہ

"شیخ یار محمد مصنف انشار قلندر بہ کماؤں رفتہ بود آنچہ درانجا مشاہدہ کرد دراں انشار مرقوم ساخت" (حدیقہ ص ۱۴۳)

کماؤں جانے کا موقعہ شیخ یار محمد کو یوں مل گیا تھا جیسا کہ وہ خود ہی لکھتے ہیں، یہ عبارت انشار قلندر سے نقل کی گئی ہے۔

"در آخر سنہ سوم از جلوس محمد شاہ مطابق سنہ یک ہزار و یک صد و سی ~~۱۱۳۰~~ خطِ راجہ دیبی چند بنام بہادر ابن راجہ جگت چند باز بہادر مالک کوہستان کمایوں مشتمل بر واقعہ پرسش

وشکوہ عدم تبلیغ تعزیت نامہ بخدمت محمد شاہ بادشاہ فرستاد۔"

جس کا حاصل یہی ہوا کہ کمایوں کا راجہ جس کا نام دیبی چند باز بہادر تھا اس نے محمد شاہ بادشاہ کے حضور میں ایک عریضہ اس مضمون کا گذرانا تھا کہ اس کے باپ جگت چند باز بہادر کا انتقال ہوگیا لیکن آستانۂ شاہی سے پرسہ اور تعزیت کا کوئی سرفراز نامہ وصول نہیں ہوا، گویا راجہ نے اسی شاہانہ بے التفاتی کی شکایت کی تھی، محمد شاہ پر راجہ کے اس خط کا اثر ہوا، اور شیخ محمد یار کے لئے کمایوں پہنچنے کا یہی اثر ذریعہ بن گیا، شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ

بوسیلہ امین الدولہ از درگاہ محمد شاہ بادشاہ گورگانی خلعت وجواہر واسپ ویک زنجیر فیل ونامہ مشتمل بر تسلّی حوالہ بندہ یعنی یار محمد شد تا ایلچی شدہ برساند۔"

گویا مغل دربار کے سفیر بن کر شیخ یار محمد راجہ کمایوں کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے واپس لوٹ کر اپنے سفر کے مختصر حالات کو انھوں نے انتشار قلندر میں قلم بند کر دیا تھا۔ اور اب آپ کے سامنے اسی سفر وسفارت کے مشاہدات وواقعات پیش ہوں گے۔ دلّی سے کمایوں کس راستے سے وہ پہنچے درمیان میں جن اہم مقامات سے گذرے ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"چنانچہ بندہ از شاہ جہاں آباد کوچیدہ عبورِ جمن نمودہ بہ بار بہ آبادی سادات رسیدہ در پھلاؤدہ رسیدم"

آگے لکھا ہے کہ پھلاؤدہ سے قصبہ اولان پہنچے۔ قصبہ اولان کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"ملوکہ شاہ مرتضیٰ ست"

اولان سے بسمتِ شمال سفر کرتے ہوئے "بعد شش روز بہ کاشی پور کہ صوبہ است از توابع کمایوں" پہنچے۔ کاشی پور گویا سرحدی علاقہ ریاست کمایوں کا تھا یہاں پہنچنے کے بعد بیان کیا ہے کہ

"از کاشی پور راہ اسپ وفیل نیست"

پھر آگے کا سفر کن سواریوں پر انھوں نے اور ان کے رفقا نے پورا کیا لکھتے ہیں کہ

درماندم جھپال[۵۱] وڈانگی از سرکار راجہ رسیدہ بود و من بسواری جھپال و رفقا بر
ڈانگیہا سوار شدہ بر شہری[۵۲] کمان راجہ روانہ شدیم"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں پر چڑھنے کی یہ سواریاں اسی زمانہ سے ہندوستان میں مروج تھیں۔ اس کے بعد ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ دربار شاہی سے گھوڑے ہاتھی کا جو سوغات لئے جا رہے تھے ان پر راجہ کے آدمیوں نے قبضہ کر لیا اور

"اوراہے کہ ہندوستانیاں را بآں راہ واقف نمی کنند بردند"

ہندوستانیوں سے مراد میدانی علاقے کے باشندے ہیں یعنی مغل سلطنت کے لوگوں کو اس پوشیدہ راستے سے پہاڑ والے واقف ہونے نہ دیتے تھے۔ بہرحال شیخ یار محمد اور ان کے رفقا کی ان ہی سواریوں پر لدے ہوئے، پہاڑ پر چڑھائی شروع ہوئی لکھا ہے کہ

"از صعوبت وسختی راہ، ورنج صعود ونزول گھاٹی (اتار چڑھاؤ کی تکلیف) وسعتِ جبال
(پہاڑ کا پھیلاؤ) ودامنگیر یہائے خارستان (خاردار جھاڑیوں کا (الجھاؤ) بیاباں
وکوہ دفترے باید کہ برتابد"

بہرحال یوں ہی ان لوگوں کا "در عرصہ چہار روز کماؤں منزل گاہ شد"

اتفاق کی بات کہ جس دن ان لوگوں کی آمد کمایوں میں ہوئی، راجہ شہر میں موجود نہ تھا، بلکہ ایک باغ جس کے متعلق شیخ یار محمد نے لکھا ہے کہ کمایوں سے چند میل دور ہے سیر وتفریح کے لئے گیا ہوا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ راجہ کے اسلاف نے دلی کے شالامار باغ کے نمونہ پر اس باغ کو مرتب کیا تھا۔ دربار شاہی کی سفارت کے پہنچنے کی خبر راجہ کو باغ ہی میں دی گئی، لکھا ہے کہ اسی وقت حکم ہوا کہ ان لوگوں کو بھی باغ ہی میں بلا لیا جائے۔ راجہ کے آدمیوں نے آکر پیام سنایا کہ:۔

---

۵۱ اصل کتاب میں "جھپان" کا لفظ ہے یعنی بجائے لام کے آخر میں نون ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے "لام" ہی کے ساتھ اس کا تلفظ صحیح ہے ممکن ہے کہ پہاڑی علاقوں میں "جھپان" ہی کہتے ہوں۔ ڈانگی غالباً وہی چیز ہے جسے آج کل ڈانڈی کہتے ہیں، بطور جنازہ کے اسے اٹھاتے ہیں چھت اس میں نہیں ہوتی اور جھپال چھت دار ہوتی ہے۔ ۵۲ راجہ کے آدمی۔

"علی الصباح در انجا رفتن باشد"

صبح ہوتے ہوئے، یہ لوگ باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ شیخ یار محمد کا بیان ہے کہ ہم لوگوں کے آنے کی تقریب سے باغ کی آرائش وزیبائش میں راجہ نے اپنی آخری طاقت خرچ کردی تھی، انھوں نے تفصیل سے ان باتوں کو لکھا ہے۔ بہرحال اس کے بعد وزیر و بخشی و میر سامان، و منشی و مصاحبان و جمعداران را بہ لباس فاخرہ" سب کے سب شاہی دربار کے سفیر کو لانے کے لئے روانہ ہوئے۔ جب شیخ یار محمد کے پاس پہنچے تو

"زناردارے پیش آمدہ گفت کہ مہاراجہ ایں ہمہ ارکانِ دولت را برائے استقبال شما فرستادہ وخود راہ شما می بیند"

شیخ یار محمد اپنے رفقاء اور راجہ کے ارکانِ دولت کے ساتھ باغ کی طرف روانہ ہوئے، جب باغ کے دروازے پر پہنچے تو شیخ صاحب نے یہ عجیب تماشا دیکھا کہ

"ہزاراں روہیلہ (سرحدی پٹھان) شمشیر علم کردہ رقص و سرود می کردند"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست میں مسلمان روہیلوں کو در خور اسی زمانے میں حاصل ہوچکا تھا جیسا کہ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے۔ اس ریاست پر ان ہی روہیلوں نے علی محمد خاں نواب آنولہ کی سرکردگی میں قبضہ کرلیا تھا۔ آنولہ ہی کی ریاست کی چھوٹی سی یادگار ریاست رامپور رہ گئی ہے۔ شیخ نے اس کے بعد لکھا ہے کہ میں نے دیکھا کہ باغ کی فصیل کی دیوار بادلہ کے تھانوں سے ڈھنکی ہوئی ہے" اور دروازے پر تاش وبادلہ کے متعدد پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ نیز

"از دروازۂ باغ تا دیوان خانہ تمام قالین ہائے ولائتی تازہ و نو درخشان بالکل از سرتا پا تاش و بادلہ گرفتہ"

جب راجہ کے تخت کے سامنے اسی فرش سے گذرتے ہوئے لوگ پہنچے تو شیخ صاحب کو یہ دیکھکر حیرت ہوگئی، ایک عجیب منظر ان کے سامنے تھا، فارسی کے ذرا مغلق الفاظ میں اس تماشے کو انھوں نے ادا کیا ہے ترجمہ یہ ہے۔

"دیکھا کہ راجہ کے تخت کے سامنے جو حوض تھا اس کے دونوں کناروں پر دو درخت نصب تھے، قد میں آم کے نوخیز درخت جو پھل چکا ہو، برابر ہوں گے، یہ دونوں درخت مصنوعی تھے یعنی ایک تو ان میں سے طلا (سونے) کا بنا ہوا تھا اور دوسرا چاندی کا تھا سبز رنگ کا میناکاری کام ان دونوں درختوں کے پتوں پر کیا گیا تھا اور ان درختوں کی ہر شاخ پر سونے اور چاندی سے بنائے ہوئے مصنوعی پرندے بنا بنا کر بٹھا دیئے گئے تھے ان میں طوطی شارک (مینا) فاختہ، کبوتر، کوے، چیل، بلبل وغیرہ سبھی طرح کے طیور تھے (دلچسپ تماشا یہ تھا) کہ ہر چڑیا کی چونچ میں بتیاں رکھدی گئی تھیں، جنھیں روشن کردیا گیا تھا اور ہر ایک کی روشنی کا رنگ جدا جدا تھا (بظاہر مختلف رنگ کے شیشوں سے شاید ان کی چونچیں بنائی گئی تھیں)۔"

شیخ یار محمد نے راجہ کے دربار کا نقشہ بھی ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

وسرخ پوشاں وزرد پوشاں وپیادہائے سپاہ دیاں واراں وخاص برداراں ودیگر ہمہ تجمل وحشم بادشاہاں بر جائے خود ایستادہ "

اس کے بعد ارباب نشاط وطرب کا تذکرہ کرکے لکھا ہے کہ "متصدیاں پیش پیش من می رفتند واز سلام گاہ مجرا کردند" جیسا کہ مغل دربار کا قاعدہ تھا چوبدار شاہی حضور میں ہر پیش ہونے والے کا نام لیکر عرض کرتا۔ اجازت کے بعد مجرا کرکے آنے والا اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا تھا شیخ یار محمد لکھتے ہیں کہ سلام گاہ میں پہنچکر جب میں نے سلام کیا تو چوبدار نے عرض کیا

"وکیل بادشاہِ ہند مہاراج سلامت"

راجہ نے سنتے ہی ہاتھ اٹھایا اور آگے آنے کا اشارہ کیا۔ شیخ صاحب ذرا دور کھڑے تھے لکھتے ہیں کہ راجہ نے کہا "اے شاہے پیش تر بیائید" یہ "شاہے" کا لفظ "صاحب" کی خرابی تھی، راجہ اتنی فارسی جانتا تھا کہ "شاہے" کے ساتھ "پیشتر بیائید" ہی بول سکا۔ اس کے بعد معانقہ کے لئے راجہ نے "بغل را راست کرد" لیکن شیخ صاحب مغلی دربار کے قاعدے کے مطابق قدم بوسی کے لئے راجہ کی طرف دوڑے۔

مگر لکھتے ہیں کہ "ہر دو دست بُن گرفتہ ہم آغوش شد"

صاحب سلامت کی رسمی باتوں کے بعد ایک اشرفی نذر پیش کرتے ہوئے محمد شاہ بادشاہ کے خریطہ کو راجہ صاحب کے سامنے شیخ صاحب نے پیش کیا۔ راجہ نے "رومال دان" میں شاہی شقہ کو رکھدیا۔ اور رسمی تسلیم و تعظیم اد بجا اورد" لکھتے ہیں کہ

"انگاہ برائے نشستن بر سنگھاسن فرمود"

یہ انتہائی اعزاز تھا جو کسی علاقہ کا حکمراں کسی کو اس زمانے میں دے سکتا تھا، شیخ صاحب راجہ کے ساتھ تخت پر بیٹھ گئے۔ لکھتے ہیں کہ خیر و عافیت وغیرہ دریافت کرنے کے بعد فارسی میں راجہ نے یہ گفتگو شروع کی،

"در راہ تشدیع بسیار کشیدند"

"تشدیع" تصدیع کی خرابی تھی، شیخ صاحب بھی درباری آدمی تھے برجستہ جواب دیا کہ

"چنیں دولت بے محنت درکنار نمی آید"

اس کے بعد محمد شاہ بادشاہ کے حالات راجہ پوچھنے لگا اور پھر اسی شکایت کو دہرانے لگا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا لیکن حضور بادشاہ سلامت نے فقیر کی خبر بھی نہ لی۔ شیخ نے سفارت کا حق اس وقت خوب ادا کیا، بولے کہ راجہ صاحب قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی گھر میں غمی پیش آتی ہے تو برادری کے تمام لوگوں کو خبر دی جاتی ہے عوام و خواص ہر ایک کا یہی دستور ہے۔ لیکن آپ ہی کی طرف سے تو کوتاہی ہوئی کہ حضور شاہی میں اس کی باضابطہ اطلاع آپنے نہیں بھیجی۔ یہ سن کر راجہ اپنے قصور کا معترف ہوا اور بولا

"فی الواقعہ تقشیر شد"

یہ تقشیر تقصیر کی خرابی تھی۔ شیخ صاحب اور راجہ میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، وہ ان کے برمحل بے ساختہ جوابوں کو سن سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ آخر میں اپنے مصاحبوں کو خطاب کر کے اس نے کہا

"مردم ہندوستاں چناں قابل می باشند اما تا ایں مدت از وکلائے بادشاہ چنیں کسے نیامدہ است"

راجہ نے اس کے بعد شیخ صاحب سے کہا کہ ہمارے راج کا دستور ہے کہ ہندوستان سے جو آدمی آتا ہے اسے خلعت دی جاتی ہے لیکن آپ لیسے دربار سے آئے ہیں کہ خلعت میں آپ کو پہناؤں، یہ

گستاخی ہوگی، شیخ صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"شماکم از بادشاہ نیستند خلعتِ شماموجب فخر است"

راجہ اس جواب سے بہت مسرور ہوا۔ اسی وقت حکم دیا کہ شیخ صاحب کو توشک خانہ لے جاؤ اور خلعتِ خاصہ پہنا کر واپس لاؤ، خلعت پہن کر راجہ کا شیخ صاحب نے پھر شکریہ کا سلام کیا، مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسی سلسلہ میں جے پور اور جودھ پور کے کچھواہ اور راٹھور راجگان کا ذکر چھڑا، راجہ نے ان لوگوں کے حالات دریافت کئے اور پوچھا کہ

"ایں راجہا شان و شوکت بسیار داشتہ باشند"

شیخ صاحب نے زمانہ شناسی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ

"گفتم ہر چند جاہ و حشم بسیار دارند لیک بشمانہ رسند"

وجہ اس کی یہ بیان کی کہ

"اوشان نوکر بادشاہ اند و شما ہمسر"

کہتے ہیں کہ اس فقرے کو سن کر راجہ بھڑک اٹھا "بسیار بسیار فرخناک گردید"

شیخ صاحب نے آخر میں یہ بھی کہا کہ "راجہ کی عمر اس وقت کل چودہ سال کی تھی۔"

"بحسن و جمال بے ہمتا بود"

یہ اتفاق کی بات تھی کہ راجہ سے شیخ صاحب کی گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک محل سے خبر آئی کہ "راجہ صاحب کا کنور پیدا ہوا" شیخ صاحب نے پھر نذر کی ایک اشرفی پیش کی بولا کہ یہ کس بات کی؟ میں نے عرض کیا "کنور کی پیدائش کی" قبول کر کے پھر توشک خانہ دوبارہ مجھے بھجوایا، حکم دیا کہ دوسرا خلعت خاص کنور کی طرف سے پہنایا جائے۔ شیخ بے چارے پر پہلے ہی خلعت کا بوجھ کیا کم تھا۔ اب دوسرے نے تو ناطقہ ہی ان کا تنگ کر دیا، جان پر بن آئی۔ لیکن راجہ ان سے ہندوستان کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرتا جاتا تھا۔ لکھا ہے کہ مارے پیاس کے میری بری گت تھی، آخر نہ رہا گیا پانی مانگا، نقرئی پیالہ میں پانی آیا۔ پینے کے بعد میں نے دیکھا کہ چاندی کے اس کٹورے کو راجہ کے آدمی نے میرے خدمتگار کے سپرد کر دیا

پھر راجہ نے پاندان جس میں پان لگے ہوئے تھے شیخ صاحب کی طرف بڑھایا۔ دو بیڑے انھوں نے اٹھائے راجہ نے ان کے خدمت گار کو اشارہ کیا کہ اس پاندان کو بھی اٹھا لو، بڑی مشکل سے یہ جلسہ ختم ہوا۔ یہ کہتے ہوئے کہ "فردا باز ملاقات خواہد شد"

راجہ نے شیخ صاحب کو رخصت کیا۔ لکھتے ہیں کہ قیام گاہ تک ہم لوگ ابھی پہنچے بھی نہ تھے کہ شمع و مشعل لئے ہوئے دیکھا کہ لوگ میری قیام گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مہاراج نے خاصہ بھیجا ہے، چودہ خوان تھے جن میں چاندی کے کٹورے اور چاندی کی تھالیوں میں

"پوری و کچوری و دیگر اغذیہ یکے از دیگرے شیریں تر و لذیذ تر دراں آوردہ بودند"

حسب دستور یہ سارے برتن بھی شیخ صاحب کے آدمیوں کے حوالہ کر دئے گئے، شیخ صاحب نے بطور انعام کے خاصہ لانے والوں کو پندرہ روپے دینے کا حکم دیا۔ لیکن ہر ایک کانوں پر ہاتھ رکھنے لگا اور یہ کہنے لگا،

"حکم نیست اگر بگیریم کشتہ شوم و زن و بچہ ہمہ بغارت روند"

تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب کے منشی آئے جن کے ہاتھ میں پروانہ تھا، لکھا تھا کہ دو صد روپیہ نقد بہ ضیافت شیخ صاحب کے لئے اور اکاون روپیہ یومیہ ہمراہیوں کے لئے مقرر ہوا ہے لکھا ہے کہ باوجود اس کے

"چہار مرتبہ ہر روز پکوان نو بہ نو و شیرینی ہائے گوناگوں و فواکہ خشک و تر و نقد بقدر روز اول می آمد"

شیخ صاحب انیس دن کمایوں میں رہے اور ہر روز یہی برتاؤ ان کے ساتھ مسلسل راجہ کی طرف سے ہوتا رہا۔

خیر یہ تو عام حالات تھے جن امور کا ذکر دراصل مقصود ہے وہ اب شروع ہوتے ہیں۔ پہلی خصوصیت تو وہی تھی کہ کسی طرح راجہ کے آدمیوں کو انعام و اکرام شیخ صاحب نے دینا چاہا راضی نہ ہوئے طرفہ تماشا یہ تھا کہ کھانے کی اتنی مقدار کو بھلا کون کھا سکتا تھا۔ شیخ صاحب کے رفقا نے چاہا کہ فقرا و غربا میں بچے ہوئے کھانے کو تقسیم کر دیں۔ مگر یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ

"گدایاں را طلبیدم احدے نمی آمد"

واللہ اعلم بالصواب کیوں نہیں آتے تھے، بہرحال شیخ صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

"متنفسے از سکنہ انجار از ترس راجہ مجال نہ بود کہ بیاید"

اس سے بھی صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ کے ڈر سے لوگ نہ آتے تھے لیکن راجہ کا حکم کیا تھا؟ کیا بھیک لینے کی کسی سے کسی کو اجازت نہ تھی، یا خاص کر کے شاہی دربار کی سفارت والوں سے لینے کی ممانعت کی گئی تھی۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے سخت کوشش کی کہ راجہ کے ملازموں یا خدمت گاروں، چوبداروں سے کوئی میرے پاس آئے۔ لیکن ہر ایک دور دور رہتا تھا قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ سب سے زیادہ اس معاملہ کی وجہ سے حجام کی پریشانی ان لوگوں کو زیادہ ہوئی۔ آخر خود راجہ سے شیخ صاحب کو کہنا پڑا، تب ایک "حجام" خاص راجہ کے حکم سے آیا۔ اس سلسلہ میں انتہا یہ ہے کہ ایک دفعہ اربابِ نشاط کو راجہ نے شیخ صاحب اور ان کے رفقا کی تفریح طبع کے لئے بھیجا۔ رات بھر گانا بجانا ہوتا رہا۔ صبح کو رخصت ہوتے ہوئے کچھ رخصتانہ پیش کیا گیا تو "انگشت بدنداں گذاشتند و سر بر تافتند" بہرحال راجہ کے اس بے نظیر نظم و ضبط کا نتیجہ یہ تھا کہ کھانا جو کچھ بچتا تھا اُسے روزانہ ندی میں بہا دیتے تھے۔

اسی سلسلہ میں شیخ یار محمد نے یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس علاقے میں شکار کرنے والے پرندے باز، بحری وغیرہ بکثرت ملتے ہیں۔ میں نے ان کی خریداری کا اعلان کیا۔ لوگ چاروں طرف سے ان پرندوں کو لے کر ٹوٹ پڑے لیکن دام حد سے زیادہ گراں کہتے تھے۔ شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ لاکھ "سوگند گنگا و مہادیو، و رام و کشن و اقساطِ مغلظہ کہ ہندواں بملاحظہ آں راست می گویند" ان لوگوں کو دیتا تھا۔ لیکن اپنے من مانگے داموں میں ایک پیسے کی تخفیف پر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ حیران تھے کہ اتنے کڑے داموں پر ان چیزوں کو کیسے لوں، آخر ان پر ایک دن راز کھلا راجہ نے جس حجام کو بھیجدیا تھا۔ اسی نے شیخ صاحب کو مطلع کیا کہ

"ساکنانِ ایں دیار رام و لچھمن و مہادیو وغیرہ را نمی دانند"

اور یہی نہیں کہ ہندوؤں کی قابلِ احترام ہستیوں کا کوئی اثر ان کے قلوب پر نہیں ہے بلکہ حجام نے یہ بھی کہا کہ

"دھرم و ادھرم در حساب ایشاں واحد ست یعنی برابر است۔
جس کے معنی یہی ہوئے کہ اس علاقے کے باشندوں کا کوئی خاص مذہب بھی نہ تھا مگر جس چیز کو بطور مذہب کے وہ مانتے تھے حجام نے بتایا کہ

"ہر یکے پرتمان راجہ را پرستش می نمائد"

پرتمان کی تفسیر یہ کی گئی کہ اس سے مراد راجہ کی تصویر ہے۔ یعنی ان کا سارا دھرم دین و مذہب بس راجہ اور راجہ کی تصویر ہے۔ حجام ہی نے کہا کہ

"جو بڑے لوگ ہیں وہ تو طلا، اور سونے سے راجہ کی مورت بنا کر پوجتے ہیں اور جو اُن سے کم رتبہ والے ہیں وہ چاندی کی، عوام تانبے، پیتل لوہے وغیرہ سے راجہ کی مورتی بنوا کر پوجتے ہیں"۔

حجام نے کہا کہ آپ اگر چاہتے ہیں کہ صحیح قیمت ان چیزوں کی ان سے دریافت کریں تو اس کی ایک ہی تدبیر ہے کہ

"شما ہمیں بگوئید کہ قسم راجہ بشما ست راست بگوئید"

اس نے کہا کہ اس کے بعد جھوٹ بولنا ان کے لئے ناممکن ہو جائے گا صحیح قیمت آپ کو معلوم ہو جائیگی شیخ یار محمد کا بیان ہے کہ دوسرے دن حسب دستور ان شکاری پرندوں کو لیکر لوگ ہمارے یہاں پہنچے، آج میں نے ان سے جو حسب ہدایت حجام راجہ کی قسم دیکر قیمت پوچھنا شروع کی، لکھتے ہیں کہ میرا یہ کہنا تھا کہ

"دست برہم می سوزند و می گفتند کہ کدام بدخواہ ما ایں معنی بشما ظاہر کرد"

اور اس کے بعد وہی چیز جس کی قیمت پہلے بارہ روپے کہتے تھے اب دو روپیہ کہنے لگے اور اسی طرح غیر معمولی طور پر ہر چیز کے اصلی دام انھوں نے مجھ سے لئے۔

مضمون کا جو عنوان میں نے مقرر کیا ہے۔ اس کا تعلق درحقیقت "انشار قلندر" کے اسی جزر سے ہے۔ "بادشاہ پرستی" کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ جاپانیوں کا مذہب تھا، یا ہے، لیکن دو صدی پہلے کا

ایک ہندی مورخ یہ شہادت دے رہا ہے کہ اس مذہب کے ماننے والوں کی ایک ریاست ہی ہندوستان کے کوہستانی علاقہ میں قائم تھی۔

اس کے سوا شیخ یار محمد نے جو یہ لکھا ہے کہ لڑکی یا لڑکے کا رشتہ جب کسی خاندان سے آتا ہے تو دستور اس ملک کا یہ ہے کہ خاندانی شرافت کے معیار کو جانچنے کے لئے اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ

زنانش چند بار در قحبہ خانہ نشستہ اند	اس خاندان کی عورتیں قحبہ خانے میں کتنی دفعہ
اگر معلوم شود کہ چہار مرتبہ نشستہ	بیٹھی ہیں، اگر معلوم ہوتا ہے کہ چار دفعہ بیٹھ
معتبر و کلاں ترا عتبار می نمایند"	چکی ہیں تو اسی خاندان کو معتبر خاندان اور
(حدیقہ ص ۱۴۴)	بڑا خاندان قرار دیا جاتا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ سرکاری محاصل کے وصول کرنے والے عہدہ داروں پر جب حکومت کا بقایا واجب الوصول رہ جاتا ہے یا خورد برد کسی عہدہ دار کا ثابت ہوتا تھا تو عہدے سے معزول ہونے کے بعد قاعدہ اس ملک کا شیخ صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ اس خائن عہدہ دار کی گھر کی عورتیں مثلاً بیوی، لڑکی، بہن کو قحبہ خانوں میں رکھکر سرکاری مطالبات کی پابجائی کی جاتی ہر جب تک سرکاری مطالبہ ادا نہ ہولے عورت پیشہ میں مشغول رہتی ہے۔ مطالبہ کی تکمیل کے بعد اسی عہدہ دار کو پھر اپنی قدیم نوکری واپس کردی جاتی ہے۔ شیخ یار محمد نے لکھا ہے کہ

"ہمیں قسم بعد سہ سال معزولی و منصوبی معمول آں ملک است"

گویا ہر تیسرے سال اس قسم کے معزول عہدہ دار اپنی ملازمت پر پھر مقرر کردیئے جاتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ چار دفعہ قحبہ خانے میں جن کی عورتیں رہ چکی ہوتیں، اس خاندان کے متعلق سمجھا جاتا ہوگا کہ خوب دولت اس نے جمع کرلی ہوگی۔ شیخ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایسی عورتیں جو ایک دفعہ یا دو دفعہ قحبہ خانوں میں بیٹھی ہوں۔

"آنرا شائستہ اعتبار نمی دانند"

سرسید راس مسعود مرحوم نے جاپان کا سفر کیا تھا وہ بھی اس ملک میں عورتوں کی بلندی کا معیار اسی امر کو بتاتے تھے

علاوہ اس کے شیخ یار محمد نے اس ملک کی عورتوں کی ہیئت کذائی جو بیان کی ہے یعنی لکھا ہے کہ

"آں ہا خوش بہ نظر درآمدند، لیک رنگ زرد و پست تنی وے شہر اند"

اب آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذہن اس سوال کی طرف کیوں نہ منتقل ہو جائے جسے میں نے اس مضمون کا عنوان بنایا ہے، جاپان کی "شاہ پرستی" اور جاپانی خواتین کی خصوصیات سے جو واقف ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ اس باب میں وہ ہمارا ساتھ دیں گے، کمایوں کی یہ ریاست چونکہ روہیلوں کے ہاتھ ختم ہو چکی ہے اس لئے اب واقعات کا سراغ ان کتابوں سے شاید لگایا جا سکتا ہے جو ہمالیہ کی قدیم ریاستوں کی تاریخ میں لکھی گئی ہوں۔ جن زبانوں میں یہ کتابیں ہیں میری رسائی چونکہ ان تک نہیں ہے اس لئے ان حضرات سے جو اس باب میں اپنے پاس کچھ معلومات رکھتے ہوں متوقع ہوں کہ "برہان" ہی میں ان معلومات کا اظہار کریں گے۔

ترجمان القرآن

جلد دوم

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی عدیم المثال تفسیر قرآن ہے جسے عہد حاضر کی سب سے بہتر تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ یہ جلد اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی جلد سے بھی زیادہ اہم اور مہتم بالشان ہے۔ اس کے حواشی نہایت مفصل، دلپذیر و دلکش اور بہت سے اہم اجتماعی اور اقتصادی مسائل پر مشتمل ہیں، سورہ انفال، توبہ، یوسف، کہف، مریم، وغیرہ کی تفسیر اسی حصہ میں ہے اس لئے کتاب علمی اور تاریخی خصوصیات کے اعتبار سے بھی بے مثل ہو گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام ایسے باکمال عالم کی ۳۰ سال کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک ہدیہ بلا جلد آٹھ روپے آٹھ آنے مجلد خوش نما [illegible]

منیجر مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

زندگی اور علم النفسیات

از جناب سید مغنی الدین صاحب شمسی ایم اے

انسانی زندگی کیا ہے؟ اور کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ ان سوالات کے جواب میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہم اس دنیا میں سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے ہیں تو ہم زندہ کہلاتے ہیں۔ پھر جب سانس آنا بند ہو جاتا ہے اور مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں، اب رہا یہ سوال کہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کس نظم اور کس اصول کے ماتحت پیش آتے ہیں؟ تو اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنے ساتھ اپنی قسمت بھی لاتا ہے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہے وہی ہوتا ہے اور جب وہ لکھا پورا ہو جاتا ہے تو وہ اس دنیا سے رختِ سفر باندھ کر عالمِ آخرت کو سدھار جاتا ہے۔

آئیے! اب ذرا غور و تعمق کے ساتھ زندگی پر نظر ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج فلسفہ وسائنس نے کائنات کی ہر چیز کی نسبت معلومات کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ عالمِ طبعیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں عصرِ حاضر کے فلک پیما انسان نے پہنچنے اور اس کی حقیقت و ماہیت کے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس ذوقِ تحقیق و جستجو کا نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان اپنے ماحول اور گرد و پیش کی طرح خود اپنی ذات سے متعلق بھی بہ نسبتِ سابق کہیں زیادہ باخبر اور واقف ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جدید انکشافات جس طرح ہمارے علم میں بیش قیمت اضافہ کا باعث ہوئے ہیں، اسی طرح یہ انکشافات اس حقیقت کی بھی غمازی کر رہے ہیں کہ ہم اب بھی کتنے ناواقف ہیں اور ابھی ہمیں کتنا اور واقف ہونا ہے سائنس اور علومِ جدیدہ سب کچھ بتانے کے بعد بھی اب تک ہمیں یقین کے ساتھ یہ نہیں بتا سکے کہ زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی ہم کہاں سے آرہے ہیں؟

اور کہاں جارہے ہیں؟ یہ سوالات فلسفہ اور سائنس کے ناخن کے لئے اب تک عقدہائے لاینحل ہی بنے ہوئے ہیں۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ زندگی اس چڑیا کی سی اڑان ہے جو اندھیرے سے نکل کر ایک روشن کمرہ میں آتی ہے اور پھر اس کمرہ سے نکل کر اندھیرے میں ہی چلی جاتی ہے۔ ان دونوں اندھیروں کا درمیانی وقفہ کتنے عجائبات کا حامل ہوتا ہے؟ اس وقفہ میں ہم پر کیا کچھ نہیں گذر جاتا؟ مسرت وغم، تکلیف وراحت اور تندرستی اور بیماری سب ہی کچھ اس مختصر سے وقفہ میں پیش آتا ہے گویا زندگی ایک برتن ہے جو ہمیشہ بھرا رہتا ہے لیکن اس کا پانی لمحہ بہ لمحہ اور ساعت بہ ساعت حوادث و واقعات کے زیر اثر نئے نئے رنگ قبول کرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ بے کیف ہوتا ہے تو کہتا ہے۔

بے کیف دل ہے اور جئے جارہا ہوں میں — خالی ہے جام اور پئے جارہا ہوں میں

اور کبھی مناظرِ فطرت کی رنگینیاں اس کے ذوقِ نشاط اندوزی کو مخمور و سرشار کردیتی ہیں تو وہ گنگنانے لگتا ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ — چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہوجانا

تاریخِ انسانی میں مسئلہ جبر و قدر کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے "اندھی قسمت" کے قائل اب بھی موجود ہیں۔ یہ اعتقاد زندگی کو محض ایک ہوّا بنادیتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ایک جواری کی مانند زندگی سے کھیلتے ہیں۔ دوسروں کی خوش قسمتی پر رشک کرنا اور اپنی بدنصیبی پر بے بس اور مجبور و ناچار کی مانند نوحہ و ماتم کرنا زندگی کے جوہر کو فنا کردیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم عمل و حکمت کے ہتھیار ڈالدیتے ہیں اور قدرت نے ہم میں جو صلاحیتیں اور قوتیں ودیعت کی ہیں انہیں مفلوج و بے کار کردیتے ہیں جو شخص صرف زندہ رہنے کے لئے زندہ ہے اور وہ زندگی کے اصل مقصد پر غور نہیں کرتا اس کے لئے زندگی کی حقیقی مسرت و شادمانی سے لطف اندوز ہونا ناممکن ہے۔

عام لوگوں کے لئے انسانی زندگی کا مسئلہ صرف ایک ذاتی اور داخلی حیثیت رکھتا ہے لیکن سائنس داں اور فلسفی کائنات میں انسان کے وجود کو خواہ کتنا ہی حقیر اور غیر اہم سمجھے تاہم وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ انسانی افراد میں سے ہر فرد بجائے خود ایک عالمِ صغیر ہے اور اس کو

کائنات کی دوسری اشیا سے اگر دلچسپی ہے اور وہ ان کا علم حاصل کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر انسان کے آنکھ نہ ہوتی تو سورج چاند اور ستارے سب اس کے لئے بے معنیٰ ہوتے۔ اگر اس میں سونگھنے کی قوت نہ ہوتی تو بڑے سے بڑا خوشبودار پھول بھی اس کے لئے بے حقیقت ہوتا۔ اگر اس میں لمس کا احساس نہ ہوتا تو سربفلک پہاڑوں کی چٹانیں بھی اس کے دل میں خوف وہراس کی کوئی کیفیت پیدا نہ کر سکتیں اگر اس میں چکھنے کی قوت نہ ہوتی تو امرت اور آبِ حیات، اور زہرِ ہلاہل وحنظل دونوں اس کے لئے یکساں ہوتے۔ اگر اس کے پہلو میں دل نہ ہوتا تو نشاط وغم اور مسرت والم ان دونوں میں وہ کوئی فرق نہ کر سکتا۔ اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک انسان کی ذات کا تعلق ہے وہ کائنات کا مرکز اور تمام رازوں کا محور ہے اور کائنات کی ہر چیز کی نمود ونمائش انسانی زندگی کی بوقلمونی اور گوناگونی سے وابستہ ہے۔

"بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم"

اس مرحلہ پر پہنچکر قدرتی طور پر ہمارے سامنے تین سوالات آتے ہیں۔

(۱) کائناتِ عالم میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟

(۲) انسان کی تخلیق کا کائنات سے کیا تعلق ہے؟

(۳) انسان کو اپنی زندگی کن اصول پر بسر کرنی چاہیئے اور نیز یہ کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے

ہمارے پاس ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے کے چار ذرائع موجود ہیں یعنی مذہب سائنس، فلسفہ اور نفسیات۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد متعین کرنے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے یہ چاروں چیزیں بیحد ضروری ہیں کوئی شخص ان کی رہنمائی کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

مذہب | ان چاروں چیزوں میں سے پہلے مذہب کو لیجئے۔ مذہب ہماری زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم خدا کی بندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ہر مذہب اس کا اعلان کرتا ہے

لیکن اسلام نے جس وضاحت اور صفائی کے ساتھ اس مقصد کو سمجھایا ہے کسی اور نے نہیں سمجھایا۔ وہ اس مقصد کی تشریح اس وسعت کے ساتھ کرتا ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اور حیاتِ انسانی کا ہر شعبہ معتدل ہو کر اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا خلیفہ بن کر آیا ہے۔ اس بنا پر اس کو حکمتِ نظری و عملی سے آراستہ ہو کر بساطِ ہستی پر حق و انصاف کا پرچم لہرانا چاہئے اور ظلم وجور، بداخلاقی اور گنہگاری کا استیصال کر دینا چاہئے۔ اقبال مرحوم نے اس ہی حقیقتِ کبریٰ کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اس تعلیم و تلقین سے جہاں انسانی زندگی کا مقصد متعین ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تمام کائناتِ عالم میں انسان کا مقام کس قدر اونچا ہے۔ ایک روایت میں انسان کو "بنیانِ رب" کہا گیا ہے اور پھر فرمایا گیا کہ جو شخص کسی انسان کو بے گناہ قتل کرتا ہے وہ اس طرح گویا بنیانِ رب کو ہی منہدم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کا نصب العین اور کائنات میں انسان کی حیثیت متعین کرنے کے بعد مذہب انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگی کے لئے خاص خاص احکام کی تعلیم دیتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر ایک انسان اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ موت اور عالم مابعد الموت کے کٹھن منازل کے متعلق بھی وہ خاص قسم کے تصورات پیش کرتا ہے اور اس طرح زندگی اور اس کی ابتدا و انتہا ہر ایک چیز پر روشنی ڈالتا ہے۔ مذہب کی اس رہنمائی کا تعلق انسانی اعتقاد و یقین سے ہے۔ یعنی وہی شخص اس ذریعہ سے اطمینان و سکون حاصل کر سکتا ہے جو مذہب کی سچائی کا یقینِ کامل رکھتا ہو اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہو۔ ورنہ مذہبی احکام سے انحراف کا احساس ہمیشہ اس کے دل میں گنہگاری کی خلش پیدا کرتا رہے گا اور وہ اطمینان سے محروم ہو جائیگا۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ میں حیاتِ انسانی پر مذہب کا

ہمیشہ بہت گہرا اور پائدار اثر رہا ہے۔

سائنس | اس کے برخلاف اس سائنس داں کو لیجئے جسے حق کی تلاش ہے، یہ خاص قسم کے حقائقِ قدرت کے مشاہدے اور ان کا تجزیہ و تجربہ کرنے کے بعد ان کو مرتب کرکے قوانینِ قدرت کے استنباط میں اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ اس کے لئے زندگی کے تمام مسائل کا دریافت کرلینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ تاہم جب وہ اپنے ماحول پر نظر ڈالتا ہے تو جو کچھ اسے معلوم ہوسکتا ہے اُسے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سر جیمس جین (Sir James Jean) جو ایک بلند پایہ سائنس داں ہے۔ کہتا ہے کہ "کائنات کے انتہائی راز دریافت کرنا سائنس کے حدود سے خارج ہے۔ اور شاید انسانی ذہن انھیں کبھی سمجھ بھی نہیں سکے گا" سائنس نے اب تک جو کچھ معلوم کیا ہے وہ معمولی سمجھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے حدود معلومات سے باہر ہے تاہم سائنس کے کارناموں نے تمدنی اور اجتماعی اعتبار سے جو اثر عوام و خواص کی ذہنیت اور ان کے امیال و عواطف پر کیا ہے وہ معمولی نہیں ہے اور اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

صدہا سال تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ سورج اور چاند اور دوسرے سیارے (Planets) زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ گویا ہماری زمین کائنات کا مرکز ہے لیکن کوپرنیکس (Copernicus) کے غور و فکر نے یہ ثابت کیا کہ سورج زمین کے گرد چکر نہیں لگاتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد تمام دنیا کو اپنے خیال میں رد و بدل کرنا پڑا اور اس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ ہماری زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے بلکہ آسمان میں سورج ایسے اور بڑے بڑے عظیم الشان سیارے موجود ہیں جن کے مقابلہ میں زمین ایک رائی کے دانہ کی برابر حیثیت رکھتی ہے،

اس نظریہ کے اعلان نے انسان کو جو "ہمچو من دیگرے نیست" کا نقارہ بجاتا چلا آیا تھا چوکنا کردیا اور اس نے پہلے پہل خود فریبی کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے جو جو جتن کئے اس کا ایک ادنیٰ مظاہرہ یہ بھی تھا کہ غریب گلیلو (Galileo) کو سزائے موت کا حکم سننا پڑا۔

کئی صدیوں تک سائنس داں کائنات کو محض اندھی طاقتوں کا ایک کھیل سمجھتے رہے

ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس زبردست میکانی مشین کے تمام میکانی اصول سمجھ گئے ہیں اور یہ دنیا انھیں میکانی اصول پر چل رہی ہے۔ اس غور و فکر پر جس تمدن کی بنیاد رکھی گئی اس کا مادی ہونا لازمی امر تھا لیکن آج کل کے سائنس داں اس تشریح کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود سائنس دانوں نے ہی مادیت کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ چنانچہ سائنس نے مادہ کا تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ کسی شے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ مادہ کی آخری تقسیم ہے جس سے مادہ مرکب ہوتا ہے۔ جب اس چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کو بھی توڑ ڈالا گیا تو یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ مادہ کی آخری تقسیم جزءِ لاتجزیٰ ہے اور مادی دنیا بجائے چار کے سو سے زائد عناصر سے مرکب ہے۔

پھر یہ انکشاف ہوا کہ مادہ کی یہ تقسیم بھی انتہائی تقسیم نہیں ہے اگرچہ مادہ ان اجزاء لاتجزیٰ سے مرکب ہوتا ہے لیکن ان اجزا کی ترتیب آپس میں گتھی ہوئی اور باقاعدہ نہیں ہوتی۔ نیز یہ جزء لاتجزیٰ کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے بلکہ ہر جزء کو ایک نہایت چھوٹا سا نظامِ شمسی سمجھنا چاہیئے۔ جس طرح سورج کے گرد زمین، چاند اور دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح جزء لاتجزیٰ کے ذروں میں سے ایک ذرہ مرکز ہوتا ہے اور دوسرے ذرے اس مرکز کے گرد لاتناہی طور پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ اب یہاں قابلِ غور یہ بات ہے کہ ہم نے جب آخری تقسیم کو جزء لاتجزیٰ مان لیا تو اب اس کے ذرے کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ان کو ذرہ کہنا ہی غلط ہوگا۔ ان ذروں کو سائنس کی اصطلاح میں الکٹرون (Electron) یعنی برقیہ کہتے ہیں اور انھیں ذروں کا مرکز پروٹون (Proton) کہلاتا ہے اس مرکزی ذرہ میں مثبت برق ہوتی ہے جس کی کشش سے الکٹرون یعنی دوسرے ذرے اس کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ الکٹرون میں منفی برق ہوگی۔

مادہ کی ساخت سے متعلق ان انکشافات کے بعد جو فکر اب تک اس کے متعلق رائج تھا وہ ایک بنیادی فکر کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب سائنس دان کائنات کی ساخت کی تشریح صرف اقلیدس کے ابعادِ ثلاثہ یعنی طول او رعرض و عمق سے نہیں کر سکتے۔ اب ابعادِ اربعہ کا علم ہندسہ ایجاد ہو چکا ہے جسے آئن سٹائن (Einstein) کے نظریۂ اضافیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

اس نظریہ کو احصائے ٹینسر (Tensor Calenlus) کے نہایت پیچیدہ اور دقیق عملِ ریاضی کو سمجھنے کے باوجود عام فہم زبان میں سمجھانا مشکل ہے۔ بہرحال عام اذہان پر ان نظریوں کا اتنا اثر ضرور ہوا ہے کہ وہ اس ٹھوس دنیا کو اب ایسا نہیں سمجھتے جیسا کہ وہ سطحی طور پر نظر آتی ہے یا محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح سائنس اور علم ہیئت (Astronomy) کے انکشافات میں جتنا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کائنات کے تصور میں وسعت پیدا ہورہی ہے۔ اس تصور سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے یہ سب انتشار ایک ہی ساعت اور ایک ہی نقطہ سے شروع ہوا ہوگا لیکن سائنس داں ہمیں یہ نہیں بتاسکے کہ اس کائنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اور نیز یہ کہ اس کی ابتدائی کیفیت کیا تھی؟ بہرحال پیدائشِ عالم کا وہ مذہبی تصور جسے کن فیکون سے تعبیر کیا جاتا ہے اب سائنس اس سے نہیں ٹکراتی یعنی اس کی مخالفت نہیں کرتی۔

سائنس کے افکار و نظریات عوام کی سمجھ سے بلند سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی سے متعلق عام لوگوں کے تخیل پر ان چیزوں کا کافی اثر ہوتا ہے۔ اگر سائنس مادیت پر اصرار کرے تو اس فلسفہ میں انسانی روح جیسی اہم چیز کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی لیکن اب جبکہ سائنس دانوں نے مادہ کو خود فنا کردیا ہے اور ان کا رجحان زیادہ تر اس نظریہ کی طرف ہے کہ مادہ اور روح کا باہمی اتحاد ایک دوسرے کے ساتھ امدادی حیثیت کا ہے یعنی وہ ایک ہی شے کے دو مختلف مظاہر ہیں تو اس کا اثر عام لوگوں پر یہ ہورہا ہے کہ اب وہ بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ محض مادی خوشحالی ان کی مسرت کا باعث نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ کہ مادی زندگی کا خوشگوار ہونا زندگی کا اعلیٰ نصب العین بھی نہیں ہے۔ اب ان کی توجہ زیادہ تر باطنی مسرت حاصل کرنے، اپنی شخصیت کے ارتقا اور مادی قوتوں کے ساتھ روحانی قوتوں کو بھی ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔

علمِ طب یا ڈاکٹری نے بھی ہمارے جسم کے اعضا اور ان کے وظائف و عوارض کی نسبت بہت کچھ معلومات فراہم کرکے اور قسم قسم کی دواؤں اور طریقہائے علاج کو دریافت کرکے ہمیں بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق صرف ہمارے جسم سے ہے اور کوئی شبہ نہیں

کہ جہاں تک جسمانی صحت کی نگہداشت اور اس کی حفاظت کا تعلق ہے یہ علم ہمارے لئے بیش از بیش فوائد کا حامل ہے لیکن اس سے کسی عام انقلابِ ذہنی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برخلاف فلاسفہ کے افکار و خیالات سوسائٹی کی ذہنیتوں پر جو اثر ڈالتے ہیں وہ بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔" یہ عجیب بات ہے کہ فلسفہ بعض اوقات ہمارے ذہن میں ایک ایسی چیز کا تصور پیدا کرتا ہے جو موجود نہ ہو، لیکن اس کے باوجود وہی چیز ہمارے لئے حسن و قبح کا معیار بن جاتی ہے۔ مثلاً جب ہم آئیڈیل (Ideal) کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری مراد ایک ایسا مکمل ذہنی تصور ہوتا ہے جس کا خارج میں وجود نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس تصور کو اصل قرار دے کر عملی زندگی میں اسی کی نقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ لفظ Ideal افلاطون کے فلسفہ سے لیا گیا ہے اس کے نزدیک ہر خارجی حقیقت کے لئے ایک عینی یا مثالی حقیقت کا وجود ضروری تھا جو عالمِ مثال میں پائی جائے۔

افلاطون کے برخلاف ارسطو مشاہدہ کا قائل تھا۔ اس کی تلاش اور جستجو کا نصب العین صداقت اور حقیقت تھا۔ اس کے نزدیک درست، معقول اور مناسب وہی چیز ہو سکتی ہے جو سب کے لئے مفید ہو اور سب اس سے مسرت حاصل کر سکیں۔ ارسطو کے نزدیک اصلی مسرت کا راز اعتدال اور توازن قائم رکھنے میں پنہاں ہے مثلاً فضول خرچی اور بخل کے درمیان کفایت شعاری حدِ اوسط ہے اور یہی اعتدال ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارسطو بہ نسبت افلاطون کے زیادہ حقیقت بیں اور حقیقت شناس تھا چنانچہ اس کی تعلیم کا اثر سکندر کے کارناموں سے ظاہر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد نے استاد کے نظریۂ اعتدال پر عمل نہیں کیا اسی وجہ سے سکندر کی زندگی میں متعدد مثالیں نہایت شدید بے اعتدالی کی ملتی ہیں اور عجب نہیں بے اعتدالیوں کے ہی باعث وہ ۳۳ سالہ زندگی کی قلیل مدت میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔ ارسطو کے فلسفہ کا اثر یورپ کے دماغ پر بھی بہت کچھ ہوا ہے۔

ایک فلسفی کی اپنی زندگی میں اس کے فلسفہ کا اثر اس کے ماحول یا عوام پر بہت کم ظاہر

ہوتا ہے لیکن اس کی وفات کے بعد جب دنیا اس کے خیالات کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کا فلسفہ رائج ہوتا ہے تو وہ انقلابِ عظیم پیدا کر دیتا ہے۔

روسو کے چیدہ چیدہ خیالات نے اپنے زمانے میں وہ روح پھونکی جس کے زیرِ اثر انقلابِ فرانس نے جنم لیا اور انسانی قید کی زنجیروں کو توڑ دیا۔ آزادی، مساوات اور اخوت وہمدردی کے الفاظ اب بھی ہمارے کانوں میں گونج کر ہمیں اس نصب العین کے حاصل کرنے کے لئے ابھارتے رہتے ہیں چنانچہ انقلابِ فرانس کے بعد دوسری قوموں نے جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے سر اٹھایا اور آزادی حاصل کی۔ حقیقتاً امریکہ کی سول جنگ غلامی کو دور کرنے کے لئے لڑی گئی تھی۔ ابراہیم لنکن گو صحیح معنٰی میں فلسفی نہ تھا لیکن طرزِ حکومت کی جو بنیاد اس نے رکھی ہے اس کا چار دانگ عالم میں اب بھی ڈنکا بج رہا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں پر خود اس قوم کے افراد اپنی قوم کی فلاح وبہبود کے لئے حکومت کریں۔

جیرمی بینتھم (Jeramy Beutham) اٹھارویں صدی کے انگریز مصنف نے فلسفۂ افادیت کی بنیاد رکھی یعنی یہ کہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں زیادہ سے زیادہ مسرت پہنچانا ہمارا انتہائی مقصد ہونا چاہئے۔ اس نظریے نے اس زمانہ کی نسل پر گہرا اثر کیا اور آئندہ اصلاحات کی بنیاد پھر اسی نظریئے پر رکھی گئی، جماعتی تفوق کا سدباب اس نظرئے کا لازمی نتیجہ تھا۔ چنانچہ اب بھی اس کے ماننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ یہ نئے نئے پیش آمدہ خیالات دراصل ہمارے علم میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتے بلکہ ان کی حقیقت کا اظہار ان جذبات سے ہوتا ہے جو کانوں میں پڑنے سے ابھرتے ہیں۔ وہ زندگی کے مقصد کی کوئی مفصل تشریح نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کے مقصد دریافت کرنے میں سنگِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

زندگی کی حقیقت کی تلاش اور مقصدِ زندگی متعین کرنے میں ہمیں ایک اور ذریعہ سے بھی مدد پہنچ سکتی ہے۔ مذہب ہمارے سوالات کا جواب الہامی انداز میں دیتا ہے۔ سائنس خارجی دنیا میں جو کچھ اسے نظر آتا ہے اس کا تجزیہ کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ فلسفۂ سائنس کے حقائق کی

روشنی میں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو یکجا کرکے ہمارے سامنے کائنات کے حقائق اور ان کے نتائج پیش کرتا ہے۔ نفسیات ہم کو خود ہمارے متعلق کچھ بتاتی ہے اور ہمیں خود اپنی فطرت و ذہنی ساخت سے آگاہ کرکے ہماری زندگی کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

نفسیات | ایک عرصہ تک ماہرینِ نفسیات بھی فلسفیوں کی طرح اپنے ماحول سے کچھ بے تعلق سے رہے۔ اس عرصہ میں ان کا مقصدِ جستجو یہی رہا کہ آیا انسان میں روح ہے یا نہیں۔ اور اگر روح ہے تو اس کا انسانی جسم سے کس قسم کا تعلق ہے۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں جدید انکشافات کے ذریعہ انھیں معلوم ہوا کہ انسان میں روح ہے اور اس کے وظائف سے ہم آگاہ بھی ہو سکتے ہیں۔

سائنٹفک طریقۂ تحقیق اختیار کرنے کے بعد علمِ نفسیات کے دائرے میں جو انکشافات ہوئے انھوں نے موجودہ زمانے میں انقلاب برپا کر دیا۔ گو ان کی تلاش و جستجو ابھی بہت کچھ تشنۂ تمام ہے پھر بھی جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں ان سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے۔ ان معلومات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ انھوں نے انسانی کردار کا گہرا مطالعہ شروع کیا اور اس کے متعلق بہت کچھ معلومات جمع کیں۔ مثلاً یہ کہ انسانی کردار کا منبع کیا ہے، فہم و ادراک کا ارتقا کس نہج پر ہوتا ہے۔ ایک انسان کی قوتِ ادراک میں کیا کیا عنصر شامل ہوتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ انھوں نے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جسم اور نفس کا آپس میں ایک دوسرے پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے یعنی جسم کا نفسِ انسانی اور کیریکٹر پر کیا اثر ہوتا ہے اور نفس کا جسم پر کیا اثر ہے۔

نفسیات کے عالموں کی جستجو کا عام نتیجہ جو برآمد ہوا، یہ ہے کہ ہم کو اس کے ذریعہ خود اپنے ہی کو سمجھنے میں نہیں بلکہ دوسروں کو بھی سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ یہ علم کہ ہمارے اعمال و افعال شعوری اور لاشعوری دونوں کیفیتوں کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ نفسیات سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے اخلاق کی بنیاد بچپن میں ہی پڑ جاتی ہے۔ وہ اثرات اور کیفیات جو بچپن میں جزوِ ذہن بن جاتی ہیں ان کا اثر تمام عمر باقی رہتا ہے علاوہ یہ اثرات اور کیفیات ہمارے ذہن میں لاشعوری طور پر محفوظ رہتی ہیں اور پھر آئندہ زندگی میں ہمارے افعال پر متواتر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں اور ہم اس کے اثر سے

بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔

بچپن کے یہ اثرات اکثر ہمیں مضر معلوم نہیں ہوتے لیکن جب ماحول یا بچپن کے خراب اثرات کی وجہ سے ہمارے کیریکٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جو ہمارے مقاصد کے حصول میں حارج ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یا زندگی میں اس کی وجہ سے کچھ دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں تو معالجہ نفسیات کے ذریعہ بارہا ایسی خرابیاں دور کی جا سکتی ہیں معالجۂ نفسیات کے کئی مسلک یا مذہب ہیں اور اسی اعتبار سے ان کے طریقۂ علاج میں بھی اختلاف ہے۔ بہرحال معالجہ کے اس جدید طریقے سے ہمیں کافی مدد مل رہی ہے اور آئندہ اور زیادہ ملنے کی توقع ہے۔

اگر ہمارے کیریکٹر میں کوئی خرابی یا خلل نہ بھی ہو تب بھی نفسیات ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے مثلاً کوئی شخص کسی جگہ ملازم ہے اور وہ اس جگہ سے کسی اچھی جگہ پر ترقی کر کے جانا نہیں چاہتا حالانکہ اس کے لئے مواقع بہت سے ہیں لیکن اپنی اسی ملازمت پر قانع ہے اور اس میں پست ہمتی کے سے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک معالجِ نفسیات سے ہو گئی۔ ماہرِ نفسیات نے اسے بتایا کہ چونکہ وہ اپنے ماں باپ کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور اس سے چھوٹے دو بچے اور بھی تھے۔ اس لئے جب اس کے والدین کے ہاں اس کے بعد کا بچہ پیدا ہوا تو ان کی توجہ اس کی بہ نسبت چھوٹے بچے کی طرف زیادہ ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پست ہمت ہو گیا اور خودداری اور ترقی کے جذبات اس سے بالکلیہ فنا ہو گئے۔ وہ شخص یہ معلوم کر کے اپنی غلطی کو محسوس کرنے لگا اور اس کے دل میں ترقی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ اس نے پھر آگے ترقی کی اور اپنی نفسیات کے سمجھنے میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

اسی طرح بچپن کی زندگی کا کوئی شدید صدمہ آئندہ زندگی میں اس کو بزدل یا خوفزدہ بنا دیتا ہے۔ بیشتر جرائم شعوری طور پر بے ارادے پر نہیں ہوتے بلکہ وہ اوائل عمر کے واقعات اور ماحول کے سبب کیریکٹر میں کسی خرابی یا خلل پیدا ہو جانے سے رونما ہوتے ہیں۔

بعض اشخاص میں ہر چیز کے جمع کرنے یا اٹھا لینے کی بری عادت ہوتی ہے۔ انھیں اشیا کے جمع کرنے میں جو طریقہ بھی اختیار کرنا پڑے وہ اس کے استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ بعض اوقات جو اشیا وہ چوری کرتے ہیں کوئی قیمتی یا ایسی نہیں ہوتیں جن کی ان کو حقیقتاً ضرورت ہو۔ ایسی بری خصلتوں میں بعض اچھے اور دولتمند گھرانوں کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس عیب کے علاوہ ان کے کیریکٹر میں اور کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ پہلے ایسے اشخاص کو چوری کا مجرم سمجھا جاتا تھا بلکہ سو سال پہلے شاید ایسے آدمی کو سخت سزا دی جاتی ہو، لیکن آج ہم اس کے اس جرم کو اس کے ذہن میں ایک خاص نقص یا کمزوری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے بجائے سزا دینے کے اس کے علاج کا فکر کرتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ تعزیرات کی اصلاحات جو آج کل ہو رہی ہیں وہ فقط انسانی محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ماتحت نہیں کی جا رہی ہیں بلکہ وہ انسانی کردار کی ماہیت و فطرت کے متعلق باقاعدہ علم کے مرتب ہو جانے کا ایک لازمی نتیجہ ہیں۔ اگر کسی ایسے شخص سے جس کا دماغ خراب ہو، کوئی مہلک جرم سرزد ہو جائے تو ہم اسے اس جرم کی اصلی سزا کا مستحق نہیں سمجھتے بلکہ اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔

طبعی کردار ہم اسے سمجھتے ہیں جو ایک صحت مند صحیح تربیت یافتہ انسان میں طبعی جبلت و فطری جذبات کی روشنی میں رونما ہو۔ ایک شخص بہت سی خلقی اور پیدائشی صفات اپنے ساتھ لاتا ہے، لیکن انسانی کیریکٹر میں بہت سے ایسے عنصر موجود ہوتے ہیں جو عام توقع کے خلاف اکتساب کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اخلاق کا مطالعہ کرے۔ علم نفسیات میں ایک خاص باب بچپن اور شباب کے زمانہ کے مسائل پر بحث کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ عنفوانِ شباب سے مراد مردوں کے لئے عمر کا وہ حصہ ہے جو ۱۴ سال سے پچیس سال تک کا ہوتا ہے اور عورتوں کے لئے ۱۲ سال سے ۲۱ سال تک کا۔ اس باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی فرد کے ذاتی اعمال میں عنفوانِ شباب کے ارتقائی زمانہ کو کتنا دخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھانے کی

کوشش کی گئی ہے کہ آئندہ زندگی کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے ایک بچے کی تربیت کن اصول کو پیشِ نظر رکھکر کرنی چاہیئے۔ ان نفسیاتی تحقیقات کے ذریعہ ہم اپنی اور آئندہ نسلوں کی زندگی سدھانے میں کافی مدد لے سکتے ہیں۔

گو ماہرینِ نفسیات طبعی کردار اور حقیقی کیریکٹر کے متعلق ہمیں کوئی کامل معیار مقرر کرکے نہیں دیسکتے پھر بھی مجموعی طور پر وہ اتنا بتلا سکتے ہیں کہ فطرت صحیح توازن قائم رکھنے اور کشاکش سے معرا حالت کا نام ہے۔ علمِ نفسیات دیکھا جائے تو ہمارے لئے ایک امید افزا پیغام ہے، ہماری زندگی کی فلاح و بہبود اور خوشی اور مسرت حاصل کرنے میں ماہرینِ نفسیات ہماری بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں یعنی وہ ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور ہم اپنے کیریکٹر کی خرابیوں کو خود سمجھ کر انھیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض اوقات یہ خرابیاں چھوٹی ہونے کی وجہ سے ہمیں محسوس نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ماہر نفسیات تحلیلِ نفسی کے ذریعہ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ آیا یہ خرابیاں چھوٹی ہیں اور چشم پوشی کے قابل ہیں، یا کوئی مہلک صورت اختیار کر سکتی ہیں یا کر چکی ہیں۔ غرض کہ عملی زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کے لئے نفسیات نے ہمارے لئے نئے نئے راستے پیدا کر دیئے ہیں۔

پیشے کے انتخاب میں بھی نفسیات ہماری رہنمائی کر سکتی ہے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کونسا پیشہ ہمارے لئے مناسب ہوگا یعنی یہ کہ ہم کس قسم کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اگر کسی کام میں یکسانیت ہو، یعنی صبح سے شام تک متواتر ایک ہی قسم کا کام انجام دینا ہو تو نفسیات ایسی صورت میں ہمیں تکان دور کرنے کے طریقے بتا سکتی ہے۔ تکان میں تخفیف ہو جانے سے ہمیں ان کاموں میں جو نہایت خطرناک قسم کے ہوتے ہیں بڑی مدد ملتی ہے۔ نفسیات کے اس شعبہ کا نام صنعتی نفسیات ہے۔ یہ شعبہ اس امر کی تحقیق کرتا ہے کہ انسان کے لئے اس کام کی ایک خاص رفتار کتنے عرصے تک قائم رکھی جا سکتی ہے اور کام کرنے والا کتنے عرصہ تک اپنی پوری توجہ اس کام کی طرف قائم رکھ سکتا ہے۔ نفسیات کی اس تحقیق سے مزدور اور مالکِ کارخانہ دونوں کا کام بخوبی ہو جاتا ہے۔ مالک کا کام بہتر ہونے لگتا ہے اور مزدور کو کام اس کے حالات اور صلاحیت کے مطابق ملتا ہے، مزدور کے مناسب آرام اور ضرورت

کا خیال رکھنے سے وہ خوشی خوشی کام بھی بہت کر لیتا ہے۔

اسی طرح نفسیات ہماری خرابیاں دور کرنے میں مدد کرتی ہے، وہ خرابیاں خواہ مہلک قسم کی ہوں یا معمولی قسم کی، ان کے دور کرنے کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فی الواقع ان خرابیوں کا ماخذ کیا ہے؟ ان کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہے؟ یہ معلوم ہونے کے بعد اس خرابی کا دور کرنا زیادہ مشکل نہیں رہتا اس عمل کا نام تحلیلِ نفسی (Psycho-analysis) ہے۔ نفسیاتی خرابیوں اور مشکلات کا منبع معلوم ہونے کے بعد ان کے دور کرنے کا راستہ پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر بسہولت دور ہو جاتی ہیں مثلاً فرض کیجئے ایک نہایت خوبصورت لڑکی ہے جس پر شرم و حیا اس درجہ غالب ہے کہ وہ اپنی بے تکلف ہمجولیوں میں بھی چپ چپ اور خاموش رہتی ہے وہ جن لوگوں سے ملنا چاہتی اور ان کو غم اور خوشی میں اپنا شریک بنانا چاہتی ہے ان سے بھی بات کرتی ہے تو بڑی جھینپی ہوئی ہو کر ایسی لڑکی کو اگر ایک ماہرِ نفسیات دیکھے گا تو وہ یہی تجویز کرے گا کہ اس لڑکی میں احساسِ کمتری Inferiority Complex بدرجۂ غایت موجود ہے۔ بچپن میں اس کے والدین نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی چونکہ وہ لڑکی سادہ مزاج تھی اور اسے صرف اپنے سے زیادہ عمر کے بچوں میں رہنے کا موقع ملا تھا اور وہ بچے اپنے احساسِ برتری کی وجہ سے اسے بڑی بے دردی سے ستاتے رہتے تھے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ اس لڑکی میں لاشعوری طور پر اپنی کمتری کا احساس راسخ ہو گیا اور وہ سب کے مقابلہ میں اپنے آپ کو حقیر و کمتر محسوس کرنے لگی۔

ایسے واقعات روزانہ ہمارے تجربے میں پیش آتے رہتے ہیں۔ ماہرِ نفسیات اس خرابی کو معلوم کر لیتا ہے اور وہ یہ بھی جان جاتا ہے کہ یہ خرابی کیونکر پیدا ہوئی۔ خرابی اور اس کا سبب معلوم ہونے سے نصف مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اخبار میں ایک لڑکی جس کی عمر ۱۷ سال تھی خودکشی کرنے کی خبر شائع ہوئی تھی لیکن اسے پانی میں ڈوبتے ڈوبتے بچا لیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں معلوم ہوا کہ ایک پرچہ میں جو اس نے خودکشی سے پہلے اپنی ماں کے نام لکھا تھا کہ چونکہ تمام لوگ اس کے مخالف ہیں اس لئے وہ اِس

دنیا میں اور زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی"۔

اس لڑکی پر جب خودکشی کا مقدمہ دائر ہوا تو اس نے عدالت میں بیان دیا کہ اس کے اپنے بہن بھائیوں سے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اس لئے وہ اس دنیا کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کا طبی معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اسے کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے اور اسے صرف معالجۂ نفس کی ضرورت ہے چنانچہ ماہر نفسیات کی یہ تشخیص تھی کہ کچھ عرصہ سے اس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا اور زندگی اسے بالکل بے مقصد چیز نظر آتی تھی۔

درحقیقت بچپن اور عنفوانِ شباب کے زمانہ میں بعض واقعات اور ماحول کی بنا پر ہمارے ذہن میں جذبات کی کچھ ایسی گرہیں لگ جاتی ہیں کہ پھر وہ تمام عمر نہیں کھلتیں۔ یہ گرہ اندر ہی اندر لاشعوری طور پر ہماری زندگی کو دشوار بنا دیتی ہے۔ یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد ہم اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی بہت کچھ درست کر سکتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات نے زندگی کے حقائق کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کے اندرونی امراض کے ایسے اسباب وعلاجات بیان کئے ہیں جن پر ہمارا دور کا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان انکشافات کے سمجھنے کے بعد ہم اپنے آپ کو اور دوسروں کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کا کوئی کامیاب مقصد بھی پیدا کر سکتے ہیں اور ذہنی اور جسمانی ہر دو اعتبار سے ایک کامیاب زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ یقیناً ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی صحت کے درست ہونے کو کون برا کہہ سکتا ہے جب تک دماغ اور جسم درست نہ ہوں گے زندگی کے حقیقی مقصد سے ہم بہت دور رہیں گے۔

انسانی اعمال واخلاق کی خامیاں دور کرنے اور ذہن ودماغ پر قابو پا لینے کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے علاوہ علمِ نفسیات نے جسم اور روح کے آپس کے تعلقات پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے یعنی یہ کہ نفس کا اثر روح کے لئے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اسی طرح روحانی امراض کا صدمہ جسم کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے اب تجویز یہ ہے کہ نفسیات اور تحلیلِ نفسی ڈاکٹری یا طب کے نصاب میں لازمی مضامین کی حیثیت سے شامل کر لئے جائیں۔

اس سلسلے میں غدود کے متعلق علمِ طب کا جدید نظریہ قابلِ غور ہے۔ ان غدودوں سے

جنھیں ہم محض بے کار سمجھتے تھے جدید معلومات کے مطابق ایسی رطوبات خارج ہوتی ہیں جن کا ہمارے جسمانی نشو و نما سے گہرا تعلق ہے مثلاً درقیہ (thyroid) غدود کی خرابی کا نتیجہ جسمانی اور روحانی دونوں صورتوں کی خرابی میں نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض وہمی مریض اپنے آپ کو مریض خیال کرتے ہیں۔ ظاہری علامات سے ان کی بیماری ظاہر بھی ہوتی ہے لیکن حقیقتاً ان کی بیماری کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ نفسیاتی یا دماغی کیفیت کی خرابی سے ہوتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ مثال قابلِ ذکر ہے اس سے آپ کو جسم پر لاشعوری نفسیاتی کیفیت کا اثر ظاہر ہو جائے گا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے دوران میں ایک سپاہی کا بازو شل ہو گیا۔ چنانچہ اسے لڑائی سے واپس بلا لیا گیا۔ طبی ماہرین اور ڈاکٹر معائنے کے بعد اس بات سے مطمئن تھے کہ واقعی وہ اپنے بازو کو حرکت نہیں دے سکتا۔ اس کے برخلاف ماہرینِ نفسیات کو اس بات کا یقین تھا کہ لڑائی کے میدان سے الگ ہونے کے لئے اس کے لاشعوری نفس نے یہ حیلہ اختیار کیا تھا۔ حقیقتاً اس کے بازو کے اعصاب و پٹھے بیکار نہیں ہو گئے تھے بلکہ لاشعوری نفس کا اس کے جسم پر پورا کنٹرول تھا اور خود سپاہی کو اس گرفت کی خبر نہ تھی۔

اسی طرح نفس پر جسم کے کنٹرول کی مثال بھی آسانی سے دی جا سکتی ہے چنانچہ جسم کا کوئی عیب یا نقص کا اثر انسان کی نفسیات اور اخلاق پر بہت گہرا پڑتا ہے اگرچہ یہ اثر لازمی نہیں ہے مثلاً تیمور لنگڑا تھا۔ راجہ رنجیت کی صرف ایک آنکھ تھی۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ اس عیب ہی کا ان کے کردار کو نمایاں اور کامیاب بنانے میں حصہ ہو۔ بعض انسان جسمانی نقائص پر غلبہ پا لیتے ہیں، امریکہ کے سابق پریذیڈنٹ روزویلٹ پر جوانی میں فالج گرا تھا لیکن اس مرض کا ان کے کیریکٹر یا کردار پر کوئی مضر اثر نہیں پڑا۔ بہت سے شاعر اور ادیب آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود شعر و ادب میں کمال رکھتے ہیں۔

ابھی نفسیات کے ماہرین کا کام مکمل نہیں ہوا ہے لیکن جتنا کچھ ہوا ہے وہ بہت ہے یہاں ہمارا مقصد نفسیات کے کام کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نفسیات زندگی کے معنی و

مقصد سمجھنے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہے۔ نفسیات ہمیں اپنے آپ کو، اپنے اخلاق، اپنی خصلت، اپنے جذبات، اپنے ماحول کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم نفسیات کے ذریعہ اپنی شخصیت کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم میں کیا کیا خوبیاں موجود ہیں اور ہم میں کس قسم کی کتنی صلاحیت ہے۔ جب ہم کوئی غلطی کرتے ہیں تو نفسیات ہمیں اس غلطی سے آگاہ کر دیتی ہے، اور ان خامیوں کے دور کرنے میں مدد و معاون بنتی ہے۔ بہرحال زندگی کا کوئی بھی مقصد ہو اس کے لئے نفسیات کی امداد از حد ناگزیر ہے۔

مذہب، سائنس، فلسفہ اور نفسیات کے علاوہ عوام الناس کی رائے کو بھی زندگی کے مقصد متعین کرنے میں کافی دخل ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر رائے عامہ کی طاقت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جمہوریت کے دور دورے میں رائے عامہ بھی ان طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے جس کا زندگی پر کافی اثر ہوتا ہے۔

زندگی کی حقیقت وہی بہتر سمجھ سکتا ہے جو فہم و ذکاوت سے کام لیتا ہے اگرچہ حقیقت و مقصد جزوی ہی کیوں نہ ہوں۔ قسمت کو اپنا مخالف سمجھ بیٹھنا ہمیں صحیح فیصلہ کرنے سے باز رکھتا ہے، دنیا کو بری جگہ یا اپنا دشمن تصور کرنے سے ہم زندگی کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے اور نہ اس کے صحیح مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

عام طور پر انسان روح کو جسم سے افضل تصور کرتا ہے لیکن وہ یہ بھی بخوبی سمجھتا ہے کہ روح کا اظہار جسم ہی سے ہوتا ہے۔ گویا زندگی میں نفس کو جسم پر اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ زندگی کی ظاہری یا خارجی مشکل حل کرنے سے پہلے نفس اور روح کا عقدہ حل کرنا لازم ہے۔ مادی اور روحانی قوتوں میں کامل اتحاد و اشتراک پیدا کرنا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہئے۔ اول تو اس وجہ سے کہ تناسب و اعتدال ہی اپنی جگہ باعث مسرت و راحت ہے اس کے علاوہ کامیابی اور استکمال نفس و روح کا یہی ایک راستہ ہے۔ استکمالِ نفس سے مراد وہ روحانی سکون ہے جسے مادی ملکیت یا مفاد کے مقابلہ میں ترجیح دی جائے لیکن مادی مفاد اور روحانی سکون میں امتیاز آسانی سے نہیں ہو سکتا۔

مندرجہ بالا نتائج کی روشنی میں مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کام یا عمل زندگی کا بہترین مقصد ہے لیکن کام اسی صورت میں اچھا مقصد ثابت ہوتا ہے جبکہ ہم اپنے فرائض کو فخر و مسرت سے انجام دیں۔ ایسے کام کرنے والے کو ایک روحانی سکون حاصل ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی کار آمد طور پر بسر ہو رہی ہے اس کی بجائے وہ شخص جو محض لالچ یا فائدے کی خاطر کام کرتا ہے اس کا کام کسی تعریف کا مستحق نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا شخص اخلاقی حیثیت سے قابل رحم ہے۔

کام کے علاوہ طاقت حاصل کرنے کی خواہش بھی زندگی کا ایک مقصد بن سکتی ہے یہ خواہش عام ہے اور تقریباً ہر انسان میں کم و بیش پائی جاتی ہے یہانتک کہ کسی شخص میں اس خواہش کا فقدان قابلِ حیرت ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ میں اور زندگی کے ہر شعبہ میں یہی خواہش مختلف صورتوں میں کار فرما نظر آئے گی۔ خواہ وہ سیاسی طاقت کی خواہش ہو یا دولت کی۔ خواہ وہ معاشرتی طاقت ہو یا فوجی طاقت۔ بہرحال یہ خواہش طاقت کے مختلف ذرائع کے حاصل کرنے سے متعلق ہوتی ہے۔ اس طاقت کے صحیح یا غلط استعمال ہی میں انسانی کیریکٹر کا سب سے بڑا امتحان مضمر ہے۔

مثلاً کسی شخص کو کسی پیشے میں خاص مہارت حاصل ہونے سے جو طاقت میسر آتی ہے وہ بھی ہوس کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ دنیا اس طاقت کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور یہ طاقت اس طاقت سے بہتر ہے جو زبردستی حاصل کی جائے۔

آج کل زندگی بسر کرنے کے لئے مختلف مقاصد کا انتخاب کیا جا سکتا ہے مثلاً آرٹ، طلب علم، لیڈری، خدمت خلق، سیر و سیاحت، فلسفہ و سائنس، تصنیف و تالیف، ملازمت غرض یہ اور اس کے ماسوا تمام اور کام ہر شخص کی طبیعت و افتاد کے مطابق الگ الگ مناسبت رکھتے ہیں۔ اس میں سے ہر کام کے لئے اس کے کرنے والے میں جو ضروری خصوصیات یا خوبیاں ہونی چاہئیں ہونی لازمی ہیں۔ غرض جو کام بھی کیا جائے اس میں بہتر سے بہتر طریقہ پر فرائض کی انجام دہی کو ملحوظ رکھا جائے اس میں کسی لالچ یا حرص کو دخل نہ ہو۔ ایسی صورت میں کام کرنیوالے

کے قلب کو یقیناً سکون حاصل رہے گا اور وہ خوش رہیگا۔ اسی طرح ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اس کا مقصد زندگی صحیح ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اسے اپنی قوتیں صحیح راہ پر لگانی چاہئیں پھر وہ جتنا اپنا مقصد زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا اتنا ہی اسے راحت و سکون حاصل ہوتا رہے گا۔ جو مقصد اپنی قابلیت وصلاحیت اور ماحول کا اندازہ لگا کر متعین کیا جائے اور بتدریج اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے وہی بہترین مقصدِ زندگی ثابت ہو سکتا ہے، اور اسی سے اطمینانِ قلب بھی نصیب ہو سکتا ہے اس لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے خود کو سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسروں کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

کیونکہ دوسروں کو سمجھے بغیر ہم ان کے ساتھ اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ دوسروں کو سمجھنے کے لئے بھی پہلے اپنے کو سمجھنا ضروری ہے۔ کسی حادثے کے وقت اگر ہم اپنی رنج کی کیفیت سے واقف ہوں گے تب ہی ہم دوسروں کے رنج کا احساس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر موقعہ پر جب ہم اپنے سے سوال کریں کہ میں ایسے موقعہ پر کیا محسوس کرتا، یا کیا عمل کرتا۔ تب ہی ہم دوسروں سے اس عمل یا احساس کی توقع کر سکتے ہیں۔ اسی لئے مذہب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ ہم دوسرے انسانوں ہی کو نہیں بلکہ خدا کو بھی جب ہی سمجھ سکتے ہیں جب ہم اپنے آپ کو سمجھیں۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ۔

آج کل اپنے کو جاننے کے لئے بھی ایک سائنٹفک علم اور عمل ہے لہذا ہمیں اپنے نفس کا تجزیہ قاعدے اور اصول کے ماتحت کرنا چاہئے۔ یہ قاعدے اور اصول یکساں طور پر ہر شخص کے لئے مقرر نہیں کئے جا سکتے بلکہ آپ اپنے نفس کے سامنے دیانتداری کے ساتھ اپنے متعلق سوچئے۔ ذاتی خوبیوں اور عیوب کا علم کسی اور کو ہو یا نہ ہو آپ کو خود ان کا علم ہونا ضروری ہے۔

مثلاً آپ پہلے اپنی جسمانی خصوصیات کا جائزہ لیں پھر اپنی ذہنی قابلیتوں کی جانچ کریں، اپنے جذبات کی کیفیتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اپنے بچپن کے واقعات اور اپنی سوسائٹی اور اس کے رجحانات کو مدِنظر رکھیں۔ اخلاقیات کے متعلق اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جماعتی میل جول میں اپنی کامیابی و ناکامیوں پر غور کریں پھر یہ دیکھیں کہ آپ کیا کیا ہنر جانتے ہیں جو ہنر جانتے ہیں وہ سطحی

طور پر جانتے ہیں یا واقعی ان کا آپ کو معتبر علم ہے اور اگر ابھی کمال حاصل نہیں ہوا تو اس کے حاصل کرنے میں آپ کتنی کوشش صرف کرتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔ زندگی آپ کے نزدیک کس نہج پر بسر ہونی چاہیئے۔

لیکن بعض اوقات انسان اپنے متعلق سوچتا ہے اور کافی سوچنے کے بعد بھی وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا اور نہ اسے قلبی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ جب یہ صورت ہو تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ نے اپنے کو ابھی نہیں سمجھا۔ اپنے آپ کو سمجھنا آسان نہیں ہے بعض اوقات اپنے متعلق متواتر غور کرنے اور اپنے حقیقی دوستوں کی اپنے متعلق رائے سننے کے بعد ہم اپنے آپ کو سمجھ پاتے ہیں۔ اس وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ گویا آپ نے اپنے کو پہلے کبھی اس روشنی میں نہیں دیکھا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اپنے متعلق بہت زیادہ سوچنا یا غور کرنا بھی مضر ہے۔ حد سے تجاوز کرنا ہر صورت میں نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ہمارے بہت سے فطری جذبات پر بے جا دباؤ پڑیگا جس کی وجہ سے صحیح راستہ سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ جذباتِ آقا ہیں اور دماغ و ذہن ان کا مطیع ہے۔ اس کے علاوہ اپنے متعلق صحیح کام انتخاب کرنے میں یا مقصدِ زندگی کی تلاش میں آپ کا ضمیر بھی آپ کی مدد کرسکتا ہے۔ ایک تپ دق کے بیمار کی زندگی اگر اس کی مرضی کے مطابق بسر ہونے لگے اور اس کے جذبات کا اظہار بغیر کسی روک ٹوک کے ہوسکے تو یقیناً اس کی تپ دق دور ہوجائے گی اور وہ صحیح اور طبعی زندگی بسر کرنے لگیگا۔ ہمارا کام زندہ رہنا اور کام کرنا ہے۔ ہر شخص خود اپنے متعلق دوسروں سے بہتر اور صحیح علم رکھتا ہے۔ آغاز و انجام ایسی چیزیں ہیں جن کا علم ہمیں نہیں ہے نہ دنیا کے آغاز و انجام کے متعلق ہمیں علم ہے اور نہ اپنے ہی متعلق کچھ اطلاع ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہم اپنے آغاز و انجام سے بے خبر ہیں اور اس زندگی کی مہم کو سر کرنے میں مصروفِ کار ہیں۔ حصولِ مقصد کی بہ نسبت حصول مقصد کی سعی اور اس کا زمانہ زیادہ دلچسپ اور مسرت آمیز ہوتا ہے اگر مقصد ہی مقصد ہماری گردن پر سوار ہے تو اس کا نتیجہ سوائے مصیبت اور گھبراہٹ کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ تاریخ بھی اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ کسی مہم کا سر کرنا انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے

روح افزا ہے۔ ناممکن کو ممکن بنانے میں زندگی کی مسرتیں پوشیدہ ہیں۔

لیکن ان لوگوں کا کیا ہو سکتا ہے جن کے لئے زندگی میں کوئی دلکشی ہی نہیں اور جو ہر صبح کو روزِ بد کا آغاز تصور کرتے ہیں۔

ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں ہے تب بھی آپ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور قرار دیں بشرطیکہ آپ کو اس کا طریقہ معلوم ہو، سب سے پہلا قدم اس سلسلے میں یہ ہونا چاہیئے کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی صاف وصریح مقصد مقرر کریں اور پھر غور کریں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ کیا عمل کر سکتے ہیں۔ آیا وہ عمل اس کے وصول کے لئے کافی ہے یا نہیں۔ پھر یہ دیکھیئے کہ آپ کے اس عمل سے وہ مقصد جو آپ کے تخیل میں موجود ہے کس حد تک پورا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ آپ کیا واقعی اپنی زندگی اس ارادے کی تکمیل کے لئے بسر کر رہے ہیں یا نہیں اگر آپ کی زندگی کا روزانہ عمل آپ کے اطمینانِ قلب کے لئے کافی نہ ہو تو آپ کو نئے راستے سوچنے پڑیں گے اور اس کے مطابق اپنے عمل کو بھی بدلنا پڑے گا اور اس میں کچھ تفریح طبع کے سامان بھی بہم پہنچائے جاسکتے ہیں اور روزانہ کام کے علاوہ کوئی تفریحی مشغلہ بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

زندگی کا مقصد متعین کرنے کے لئے ایک اور قدم بھی اٹھایا جاسکتا ہے جو اب تک یورپ وایشیا بلکہ تمام دنیا میں یکساں طور پر کامیاب ثابت ہوا ہے اور وہ خدمتِ خلق ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اصول زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ سوداگری جیسے خالص دولت اکٹھا کرنے کے پیشے میں بھی وہی سوداگر زیادہ کامیاب ہوتا ہے جو اپنے گاہکوں کی سب سے اچھی اور بہتر خدمت کرتا ہے۔ اسی اصول کے مدنظر مختلف کمپنیاں اپنے سروس اسٹیشن (Service Station) قائم کرتی ہیں اور اس طرح اپنے گاہکوں کے حلقے کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اگر ہم ہر صبح ایک شخص کو خوش کرنے کا تہیہ کرلیں تو سال میں تین سو پینسٹھ (۳۶۵) انسانوں کو خوش کرسکیں گے جرمنی کا فلسفی شاعر (Goethe) کہتا ہے کہ زندہ رہنے کا کمال یا آرٹ یہ ہے کہ ہم زندہ رہنے کے لئے اپنا وجود یا اپنی ذات تج دیں۔ یہ اصول اس لحاظ سے اور بھی قابلِ قدر ہے کہ انسان دوسروں

کے لئے ذاتیات ترک کرکے ان کی خدمت کے لئے مستعد ہوجائے۔ دراصل اسی اصول کی بنا پر انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق بنا ہے۔ یہی اصول تمام علوم۔ سائنس، تمدن وتاریخ اور مذہب کے کارناموں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ انسانی زندگی کا اس سے زیادہ افضل اور اشرف اور کوئی مقصد نہیں ہوسکتا۔ اس مقصد میں وہ طاقت اور وہ اثر پوشیدہ ہے جو مستقل طور پر انسانوں کے لئے مشعل ہدایت بنا رہا ہے اور آئندہ بھی بنا رہے گا۔ اسی اصول پر ہمارے پیغمبر ورہبر خود عمل کرکے بنی نوعِ انسان کے لئے ایک صحیح راستہ چھوڑ گئے ہیں جس پر چل کر انسان خود اپنے لئے اور بنی نوعِ انسان کے لئے مسرت اور فلاح وبہبود حاصل کرسکتا ہے۔

فیض الباری

مطبوعہ مصر

فیض الباری نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کی مشہور ترین اور مایۂ ناز کتاب ہے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ قدس سرہ جو اس صدی کے سب سے بڑے محدث سمجھے گئے ہیں فیض الباری آپ کی سب سے زیادہ مستند عظیم الشان علمی یادگار ہے جسے چار ضخیم جلدوں میں دل آویزی و دلکشی کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ مصر میں بڑے اہتمام سے طبع کرایا گیا ہے۔

فیض الباری کی حیثیت علامہ مرحوم کے درس بخاری شریف کے امالی کی ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص مولانا محمد بدر عالم صاحب رفیق ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑی قابلیت، دیدہ ریزی اور جانکاہی سے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریروں کے علاوہ فاضل مولف نے جگہ جگہ تشریحی نوٹوں کا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب کی افادی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے

مکمل چار جلدوں کی قیمت ۱۶ سولہ روپے

منیجر مکتبۂ برہان دہلی قرول باغ

منّی بیگم

ایسٹ انڈیا کمپنی کی محسنۂ خاص

از پروفیسر پریم ناتھ بھلا صاحب ایم اے سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی

میرے فاضل دوست بھلا صاحب نے یہ فاضلانہ مقالہ جو دراصل انگریزی زبان کے مشہور تاریخی رسالہ General of Indian History madras میں شائع ہو چکا ہے امپیریل ریکارڈس آفس کے بعض اہم دستاویزات اور سرکاری کاغذات کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ اس بنا پر وارن ہسٹنگ اور نظامت مرشد آباد کے باہمی تعلقات اور اس سلسلہ میں ہندوستان سے متعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی کی نسبت اس میں بعض ایسی مستند اور مفید معلومات آگئی ہیں جو عام طور پر دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ میں نے اس کو اردو زبان میں منتقل کر دیا ہے امید ہے کہ قارئینِ برہان اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔

سعید احمد

منّی بیگم جس کو "ایسٹ انڈیا کمپنی کی ماں" یا "گوہر بیگم" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نواب میر جعفر خاں کی محبوبہ اور منظورِ نظر تھی۔ یہ ایک بیوہ عورت کی بیٹی تھی جو سکندرہ کے قریب بلکنڈہ نامی ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ ماں اس قدر غریب تھی کہ جب وہ اپنی ایک بیٹی کا خرچ بھی برداشت نہ کر سکی تو آخر مجبور ہو کر اس نے منی بیگم کو سمیع علی خاں جو شاہجہان آباد میں رہتے تھے ان کی باندی بسو نام کے سپرد کر دیا۔ منی بیگم بسو کے پاس تقریباً چار پانچ سال رہی اور یہاں رہ کر اس نے

گانے بجانے اور ناچنے کا فن حاصل کیا۔

۱۷۴۵-۴۶ء میں نواب شہامت جنگ نے اپنے لے پالک اکرام الدولہ کی شادی کے موقع پر بسو اور اس کی پارٹی کو مرشد آباد بلایا تو منی بیگم بھی ان لوگوں کے ساتھ آئی۔ تقریب شادی کے ختم ہو جانے کے بعد یہ لوگ مرشد آباد میں کئی ماہ مقیم رہے۔ میر جعفر نے ان کے لئے پانسو روپیہ ماہوار کا روزینہ مقرر کر دیا اور منی بیگم کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ میر جعفر کا لڑکا نواب نجم الدولہ اسی کے بطن سے تھا۔[۵۱]

منی بیگم نے اپنی خوبصورتی اور قابلیت سے میر جعفر کے اقلیم دل پر قبضہ کر لیا اور وہ جلد ہی اس کی منظور نظر اور خانگی معاملات میں اس کی مشیر کار ہو گئی۔ جنگ پلاسی کے بعد جب میر جعفر مرشد آباد کی مسند پر بیٹھا تو اسے جواہرات اور ہیروں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی ملا جو اس کے پیشرووں نے مدتوں میں جمع کیا تھا۔ یہ تمام خزانے اندرون محل منی بیگم کی تحویل میں محفوظ کر دیئے گئے[۵۲]

۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو معزول کر کے کلکتہ بھیجا گیا اس وقت شاہ خانم نے جو میر جعفر کی اصل بیوی تھی اپنے شوہر کے ساتھ دونوں کی نا اتفاقی کے باعث کلکتہ جانے سے انکار کیا[۵۳]۔ لیکن اور دوسری خواتین کی طرح منی بیگم نے رفاقت کی اور میر قاسم کی معزولی کے بعد میر جعفر کے دوبارہ مسند مرشد آباد پر بحال ہونے کے وقت تک اس کے ساتھ کلکتہ رہی۔ میر جعفر کا جب انتقال ہونے لگا تو اس نے لارڈ کلایو کے لئے نقد اور جائیداد کی صورت میں پانچ لاکھ کی وصیت کی اور منی بیگم کو اس پر مامور کیا کہ وہ یہ رقم نواب کے انتقال کے بعد لارڈ موصوف کے حوالہ کر دے چنانچہ نواب نجم الدین کے عہد میں وصیت کے مطابق منی بیگم نے یہ رقم کلایو کے حوالہ کر دی۔ مشہور ہے کہ

---

۵۱ See Nanda Rai's letter to Clavering May 1775, C.R. 5; PP 64-5; No 17.

۵۲ سیر المتاخرین ج ۲ ص ۶۹۵۔

۵۳ See Vansittart and Col. Caillaud's letter to the Select Committee dated 1st oct 1760 - A narration of transactions in Bengal by Vansittart; Vol. 1. P.125

موصوف نے اسی رقم سے ۱۷۷۰ء میں ایک ٹرسٹ فنڈ قائم کیا تھا جس سے ہندوستان میں جو انگریز مرجاتے تھے ان کی بیوہ عورتوں اور بچوں کی خورونوش کا انتظام کیا تھا۔

نواب میر جعفر نے ۵ رفروری ۱۷۶۵ء کو انتقال کیا اس کے بعد منی بیگم کا بڑا بیٹا نجم الدولہ مسند پر باپ کا جانشین ہوا۔ اور اس طرح میرن کے بیٹے کے جائز مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اپنے اس فیصلہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے کہا کہ نجم الدولہ تو اپنے باپ کی زندگی میں ہی تخت کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا[۵۱]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجم الدولہ کو مسند مرشد آباد پر بٹھانے کی غرض سے منی بیگم اور نند کمار نے مرشد آباد اور بردوان کے ریزیڈنٹوں کو بھاری بھاری رشوتیں دے دی تھیں[۵۲]۔ چنانچہ انھوں نے یہاں آکر نوجوان شہزادہ کو تخت نشین کر دیا۔ نواب نجم الدولہ ۱۷۶۶ء میں اس دنیا سے چل بسا اور اب اس کا چھوٹا بھائی سیف الدولہ تخت پر بیٹھا ان دونوں بھائیوں کے عہدِ حکومت میں خانگی امور کا انتظام و انصرام تمام تر منی بیگم کے ہاتھوں میں ہی رہا۔ یہی ان دونوں کی سرپرست تھی اور تمام وظائف وغیرہ کی تقسیم کا کام اس کے ہی زیر نگرانی انجام پاتا تھا۔ اس مدت میں منی بیگم کے تعلقات محمد رضا خاں سے جو نائب ناظم تھا خوشگوار رہے۔

۱۷۷۰ء میں نواب سیف الدولہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب نواب مبارک الدولہ مرحوم کا جانشین ہوا۔ مبارک الدولہ کی ماں بہو بیگم اب تک گمنامی کی زندگی بسر کرتی رہی تھی ادھر محمد رضا خاں نائب ناظم کے تعلقات منی بیگم سے ناخوشگوار ہو گئے تھے اس لئے اب رضا خاں نے کوشش کی کہ نواب کے تمام خانگی انتظامات منی بیگم کے ہاتھ سے نکل کر بہو بیگم کے ہاتھوں میں آجائیں[۵۳]۔ لیکن محمد رضا خاں کی یہ کوشش کچھ زیادہ دنوں تک کے لئے بارآور نہ ہو سکی کیونکہ ۱۷۷۲ء میں اس پر خیانت اور غبن کا الزام لگایا گیا اور اس بنا پر اسے نائب ناظم اور نائب دیوان دونوں کے عہدوں سے الگ کر دیا گیا اور اس سلسلہ میں بہو بیگم کو بھی نواب کے خانگی انتظامات کی نگرانی سے برطرف کر دیا

---

۵۱ Secret proceedings 12. Feb; PP. 95—7.

۵۲ سیر المتاخرین ج ۲ ص ۷۷۱ ۔ ۵۳ ایضاً ج ۲ ص ۷۸۱

گیا اور اب کمیٹی آف سرکٹ نے منی بیگم کو سرپرست اور راجا گرداس کو نواب کا دیوان مقرر کیا۔
مارچ ۱۷۷۵ء میں نند کمار نے اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ۱۷۷۲ء میں لارڈ ہیسٹنگ نے مختلف اوقات میں خود اس سے اور منی بیگم سے تین لاکھ چون ہزار روپیہ کی رشوت اس غرض سے لی ہے کہ راجا گرداس کو نواب کا دیوان اور منی بیگم کو نواب کا سرپرست مقرر کر دیا جائے[۵۱]۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نند کمار نے ایک خط کا ترجمہ پیش کیا جو کہا جاتا ہے کہ ۲ ستمبر ۱۷۷۲ء کو منی بیگم نے لکھا تھا[۵۲]۔

خط کے واقعی ہونے کا ثبوت اب تک فراہم نہیں ہو سکا ہے منی بیگم کو اس کا اقرار تھا کہ اس نے ہیسٹنگ کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی رقم اس وقت پیش کی تھی جب وہ ۱۷۷۲ء میں مرشدآباد آیا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتی ہے کہ پہلے سے یہ طریقہ رائج تھا کہ جب کبھی گورنر جنرل نواب سے ملنے کے لئے مرشدآباد آتا تھا تو اسے دو ہزار روپیہ روزانہ بحق ضیافت دیا جاتا تھا[۵۳]۔ چنانچہ یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی رقم بھی اسی سلسلہ میں ہیسٹنگ کو پیش کی گئی۔ ہیسٹنگ بھی اس کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے یہ رقم بطور حقِ ضیافت وصول کی تھی۔ نند کمار کا یہ دعویٰ کہ منی بیگم نے ہیسٹنگ کو اس غرض سے رشوت دی تھی کہ اسے نواب کا سرپرست مقرر کر دیا جائے دستاویزات سے ظاہر نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ کچھ ایسا ناممکن اور غیر اغلب بھی نہیں ہے۔ ہیسٹنگ خود اور اس سے زیادہ اس کی بیوی ملک کی مختلف طاقتوں سے تحفے تحائف وصول کرتے تھے لیکن یہ کسی ذریعہ سے ثابت نہیں ہو سکا ہے کہ ان تحائف اور ہدایا سے اس کی پالیسی بھی متاثر ہوتی تھی۔

سرکاری کاغذات سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ ان تقررات کے کرنے میں ہیسٹنگ نہ تو اپنے کسی ذاتی جذبہ اور منفعت کو دخل دیتا تھا اور نہ ان سے اس کی کسی کی جانب داری مقصود

---

۵۱ Secret proceedings; O.C. 11 March. 1775; No 2.

۵۲ " " " 13 march 1775. No 6 (A)

۵۳ See munni Begum's letter Secret proceedings O.C. 24 july 1775. No 21

ہوتی تھی جیسا کہ برک اور نند کمار کا خیال تھا۔[۵۱] بلکہ ان تمام امور میں اس کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہتی تھی کہ وہ ہندوستان میں خود اپنی قوم کے مفاد اور اس کی حکومت کے لئے فضا ہموار کرے کمیٹی آف سرکیٹ نے اس سلسلہ میں جو رائے ظاہر کی ہے اس سے اور اس کے علاوہ ہیسٹنگ کے ایک خط سے جو اس نے کورٹ کے ڈائرکٹروں کے نام لکھا تھا دونوں سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ ہندوستان میں برطانیہ کی اس پالیسی کا مقصد کیا تھا؟ کمیٹی نے صاف لفظوں میں اس کا اظہار اس طرح کیا ہے!

"ہمارا یہ فرض ہے کہ آہستہ آہستہ (ہندوستان کی) حکومت میں اس طرح مکمل تبدیلی کا امکان پیدا کریں کہ موجودہ حکومت کی جگہ جو اس ملک پر قبضہ رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے ایک ایسی حقیقی طاقت پیدا ہوسکے جو اس ملک کی حفاظت کرے اور اس مقصد کو تدریجی طور پر مکمل کرنے کے لئے ایسے ذرائع اختیار کریں جو باقاعدہ طور پر دیانت داری کے ساتھ عمل میں لائے جاسکیں۔ نواب کی نابالغی اس نوع کے ذرائع بہم پہنچاتی ہے بحالات موجودہ پوری حکومت کو چلانے کا کام ہم کو خود اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہئے تاکہ ہندوستان کے لوگ برطانوی قوم کی خود مختارانہ حکمرانی کے عادی ہو جائیں نظامت کے عہدوں کو ہمیں تقسیم کردینا چاہئے اور نواب کے خانگی معاملات میں کسی دوسرے شخص کا دخل ہمیں گوارا نہ کرنا چاہئے۔" [۵۲]

منی بیگم کو نواب کے سرپرست کی حیثیت سے انتخاب کرتے ہوئے کمیٹی آف سرکٹ نے اپنی صفائی میں کہا تھا کہ

"ہمیں میر جعفر علی خاں کی بیوہ سے بہتر اور کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں ملتا جو نواب کی سرپرستی کے لئے ایسا موزوں ہو۔ اس معاملہ میں ہماری اپنی جو پالیسی ہے اس سے

---

۵۱ See Burk's speech. India Courier (extraordinary) 1, PP. 120–21 and P. 176

۵۲ Secret Proceedings, 11, July 1772. PP. 64–68.

قطع نظر یوں بھی منی بیگم کی حیثیت اور مرتبہ اس کو اس عظمت کا مستحق قرار دیتے ہیں
پھر چونکہ منی بیگم کی ذمہ داری نواب کے محل کی دیواروں کے اندر محدود رہیگی اس
بنا پر اس کا یہ انتخاب صنفی حیثیت سے بھی ملک کے موجودہ قوانین اور آئین کے
خلاف نہ ہوگا۔" ۵۱

اس عہدہ کے لئے بہو بیگم جو نواب کی ماں تھی اور نواب کا چچا احترام الدولہ یہ دونوں مدعی تھے۔ اس بنا پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں کے ہوتے ساتے منی بیگم کا انتخاب کس مصلحت سے عمل میں آیا۔ محمد رضا خاں کی برطرفی کے بعد احترام الدولہ نے درخواست کی کہ اس کو نائب صوبہ کا عہدہ تفویض کر دیا جائے لیکن اس کی درخواست نامنظور کر دی گئی۔ ۵۲ اس اپنے فیصلہ کی صفائی کرتے ہوئے ہیسٹنگ نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا تھا کہ

"احترام الدولہ کچھ زیادہ خطرناک قابلیتوں کا آدمی نہیں ہے اور نہ بظاہر حوصلہ مند معلوم ہوتا ہے۔ البتہ وہ ایک وسیع خاندان کا باپ ہے جس کو اگر مسند پر اسقدر اونچی جگہ دیدی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ صوبہ داری کے حق وراثت کا دعوی کر بیٹھیں گے اور اگر اس کی اولاد میں سے کوئی ایک بیٹا بھی مسند نشینی کا خواہاں ہوا تو اس کے لئے بہت آسان ہوگا کہ وہ کسی وقت نواب بن جائے۔ نواب کے نابالغ رہنے تک سرپرست کم از کم ناظم بھی ہوگا اور اس طرح ہماری وہ تمام امیدیں جو ہم اس سے پوری کرنی چاہتے ہیں برباد ہو جائیں گی۔ اگر اس جگہ پر کسی اور دوسرے شخص کا تقرر کیا جاتا تو نتیجہ بڑی حد تک پھر بھی یہی رہتا" ۵۳

اب رہی بہو بیگم! تو غالباً اس کے مطالبہ کو اس لئے ٹھکرا دیا گیا کہ وہ پہلے جو نواب کی سرپرست

---

۵۱ Secret proceedings; 11 July 1772. PP. 69 - 70
۵۲ " " 21 May 1772. PP 534 - 37
۵۳ Letter to the Secret Committee of the Court of Directors, dated 1st September 1772 (Gleig; 1. P; 253)

ہوئی تھی تو محمد رضا خاں کے توڑ جوڑ سے ہوئی تھی لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی اور محمد رضا خاں کمپنی کی نظر میں مشتبہ ہو گیا تھا اس کو اپنے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا تھا اور ہیسٹنگ کی خواہش یہ تھی کہ اس کی جگہ پر اب کوئی ایسا شخص آئے جس کے تعلقات محمد رضا خاں کے ساتھ خوشگوار نہ ہوں علاوہ بریں غلام حسین کا بیان ہے کہ صرف منی بیگم ہی ایک ایسی خاتون تھی جس سے نواب ڈرتا تھا۔[له] بہر حال منی بیگم کو سرپرست مقرر کر دیا گیا کچھ اس وجہ سے کہ اس کے کوئی اپنا بیٹا نہ تھا جس کو مسند نشین کرنے کے لئے وہ جد وجہد کرتی اور کچھ اس وجہ سے کہ نواب اسی سے ڈرتا تھا لیکن بڑی وجہ تو یہ تھی کہ منی بیگم کے پاس وافر دولت تھی جس کے باعث کمپنی اس کی پوجا ماں کی طرح کرتی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرپرستی کے لئے منی بیگم کا انتخاب غیر فطری معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ہندوستان سے متعلق ہیسٹنگ کی پالیسی کو ہم پیش نظر رکھیں تو ہمیں اس کی وجہ صاف معلوم ہو جاتی ہے۔

منی بیگم تین برس سے کچھ اوپر تک نواب کی سرپرست رہی۔ اس منصب کے مشاہرہ کے طور پر اس کو ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ سالانہ دیئے جاتے تھے اور یہ رقم ایک لاکھ چوالیس ہزار ہوگئی۔ اس رقم کے علاوہ تھی جو اس کو ہر سال بہ طور پنشن ملتی تھی۔ نواب کے خانگی امور کا اہتمام وانصرام اور وظائف نظامت کی تقسیم کا تمام کام اسی کے سپرد تھا۔ اس کے علاوہ نواب کی تعلیم و تربیت کی نگرانی بھی اسی کے ذمہ تھی۔ عملی طور پر اپنے معاملات میں وہ مکمل طور پر آزاد تھی ہیسٹنگ نے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اس کی ذمہ داریوں میں کوئی دخل نہ دیگا۔

منی بیگم کے عہدِ انتظام کو کسی طرح بہت زیادہ کامیاب نہیں کہا جا سکتا وہ جلد ہی اپنے خواجہ سرا اعتبار علی خاں کے زیر اثر آگئی جو ہر معاملہ میں اس کا نائب یا قائم مقام کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ گورنر جنرل نے بیگم کو متعدد خطوط لکھے اور ان میں تنبیہ کی گئی کہ وہ انتظامی معاملات خواجہ سرا کے ہاتھوں میں نہ چھوڑے خود ان کا انصرام کرے اور جہاں تک ممکن ہو دیوان کے مشورہ پر چلے۔[ٹه]

[له] سیر المتاخرین ج ۲ ص ۷۹۸

[ٹه] C.I. 6. PP125–7; No. 257; C.P.C; iv; L. 398.

لیکن ان خطوط کا بیگم پر ذرا اثر نہ ہوا۔ اعتبار علی خاں خائن اور لالچی شخص تھا۔ انتظامی قابلیت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ غلام حسین کا بیان ہے کہ اس نے ایک بہت بڑی رقم خورد برد کر دی تھی اور نواب میر جعفر کے اہل خاندان کے وظائف روک لئے تھے

مئی ۱۷۷۵ء میں گورنگ مرشد آباد آیا تو اس نے دیکھا کہ خزانہ بالکل خالی ہو گیا ہے[۵۱] یہاں اس کو تنخواہ داروں کی طرف سے درخواستیں موصول ہوئیں جن میں کہا گیا تھا کہ ان کو تین سال سے مقررہ وظیفے نہیں ملے ہیں[۵۲]۔ بیگم کی سرپرستی کے زمانہ میں نواب بھی نو لاکھ روپیہ کا مقروض ہو گیا تھا۔ گورنگ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ منی بیگم نے نواب کی تعلیم کی طرف سے کامل غفلت برتی ہے اور اس طرح جو ٹرسٹ اس کے سپرد کیا گیا تھا اس کا بیگم نے غلط استعمال کیا اور اپنے فرائض سے پہلو تہی کی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی کونسل میں اکثریت ہیسٹنگ سے پہلے ہی کچھ خوش نہ تھی۔ اب انھوں نے ہیسٹنگ کے انتظام پر یہ نکتہ چینی سنی تو انھیں اس کو تبدیل کر دینے کا ایک موقع مل گیا۔ ننداراۓ جو پہلے بیگم کی ملازمت میں تھا اس نے مسٹر گرانٹ اکاونٹنٹ پراونشل کونسل مرشد آباد کے سامنے بیان کیا کہ نو لاکھ سڑسٹھ ہزار چھ سو چونسٹھ کی ایک رقم منی بیگم پر واجب الادا ہے۔ گرانٹ یہ تمام حسابات کلکتہ لے آیا اور ۲ر مئی ۱۷۷۵ء کو اس نے ان کو بورڈ کے سامنے پیش کر دیا ۵ر مئی کو اس معاملہ میں گرانٹ پر پھر جرح کی گئی۔ اب اکثریت کا فیصلہ یہ ہوا کہ گورنگ کو مرشد آباد اس غرض سے بھیجا جائے کہ وہ حسابات کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے وہاں کے تمام کاغذات کو اپنے قبضہ میں کر لے اور بیگم کو نواب کی سرپرستی کے عہدہ سے برطرف کر دے۔ تاکہ اس کے اثر کی وجہ سے نوابی کے افسر سچی گواہی دینے میں تامل نہ کر سکیں۔ اس فیصلہ میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ مسٹر گورنگ ان تمام متعلقہ کاغذات اور حسابات کو اپنے قبضہ میں کر کے انھیں مسٹر میکسول

---

۵۱ Secret Proceedings. OC. 25 May 1775; No. 10.

۵۲ " " " 8 June, " No. 4.

مسٹر اینڈرسن اور مسٹر گرانٹ کے سامنے پیش کردیں۔ یہ لوگ ان کی جانچ پڑتال کرکے انھیں بورڈ کے سامنے پیش کریں۔ اس درمیانی مدت کے لئے راجہ گرداس کو نواب کا سرپرست عارضی طور پر مقرر کردیا گیا تھا۔ ہیسٹنگ نے اکثریت کے اس فیصلہ پر اعتراض کیا۔ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔[۵۱]

مسٹر گورنگ ۱۴ رمئی کو مرشد آباد پہنچے۔ ۱۶ رمئی کو انھوں نے نواب سے ملاقات کی اور تمام حکام کی موجودگی میں کونسل کے احکام پڑھ کر سنائے۔ اب انھوں نے نواب اور راجا گرداس کی معیت میں منی بیگم سے ملاقات کی اور اسے نواب کی سرپرستی کے منصب سے برطرف کردیا۔ علاوہ بریں بیگم کے ڈپٹی اور خاص خواجہ سرا اعتبار علی کو قید کردیا اور بیگم نے جو رقم خورد برد کی تھی اس کے حسابات سے متعلق تمام کاغذات کو اپنی تحویل میں لے لیا۔[۵۲] اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس معاملہ میں کوئی اور تحقیق و تفتیش بھی ہوئی تھی یا نہیں؟ بہرحال یہ ضرور ہے کہ کونسل کی اکثریت کے فیصلہ نے بیگم کو مجرم قرار دیدیا۔ بیگم کے ساتھ گورنگ کے اس برتاؤ نے مخالفت پیدا کردی، گورنگ نے منی بیگم کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کا معاملہ کیا تھا۔ ہیسٹنگ نے اس کا شکوہ کیا۔ اس سلسلہ میں خود نواب کا جو بیان ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس واقعہ کے بارہ برس بعد نواب نے سرجان شور کو جو خط لکھا ہے اس میں اس نے تحریر کیا ہے کہ گورنگ نے کونسل کے حکم کی جس طرح تعمیل کی تھی وہ مجھکو اب تک یاد ہے۔ اسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔[۵۳]

بہرحال اس طرح اکثریت کے عمل نے بیگم کو نواب کی سرپرستی اور نیابت کے عہدہ سے برطرف کردیا۔ ہیسٹنگ نے اپنے انتظام کی اس تبدیلی کو اپنی ذاتی توہین خیال کیا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں جو اس نے ۱۸ رمئی ۱۷۷۵ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کے نام لکھا ہے اس میں اس نے

۵۱ See Hastings letter to the Court of Directors, 18 May 1775; Secret proceedings; OC. 14. Sept. 1775; No. 2.
۵۲ CR. 5; PP. 93–100; No 27. CPC; iv; L. 1306
۵۳ See Shore's report, Secret proceedings. 11. June, 1787. P. 3321.

اس انقلاب کو جو اس قدر اچانک واقع ہوگیا تھا اور جو نتائج کے اعتبار سے بڑا اہم تھا ڈائرکٹروں کی اس ذلیل نیت کی طرف منسوب کیا ہے[۵۱] کہ یہ لوگ اس کو (ہیسٹنگ کو) اس کی موجودہ ذمہ داری سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ اور خود اپنے نائیدہ سند کمار کے اثر کو سراہ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہیسٹنگ برابر اس موقع کا منتظر رہا کہ وہ کسی طرح کونسل کے اس فیصلہ کو بدل کر پھر منی بیگم کو اس کے عہدہ پر بحال کر دے۔ لیکن دوسری جانب کونسل کی اکثریت اس فیصلہ میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی تھی چنانچہ ان لوگوں نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے نام جو خط بھیجا ہے اس میں وہ اس حقیقت پر بڑا زور دیتے ہیں کہ منی بیگم نے ایک بڑی رقم خورد برد کی تھی۔ اور نہایت افسوسناک طریقہ پر نواب کی تعلیم سے تغافل برتا تھا[۵۲]

اب بیگم کا حال سنئے! وہ اگرچہ اپنے منصب اور عہدہ سے الگ کر دی گئی تھی لیکن اس کے باوجود چونکہ اس کے پاس وافر روپیہ تھا بہت کچھ ذمہ داری رکھتی تھی اور ان سب سے زیادہ یہ کہ غیر معمولی طور پر ہوشیار اور زیرک بھی تھی اس بنا پر اس کا اقتدار پھر بھی قائم رہا اور ہر چیز پر اس کی نگرانی بدستور رہی[۵۳]

منی بیگم کی برطرفی کے بعد محمد رضا خاں جو بعد میں رہا کر دیا گیا تھا۔ اکثریت کے فیصلہ سے نواب کا سرپرست اور قائم مقام دوبارہ مقرر ہوگیا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اس سے اتفاق کیا لیکن ہیسٹنگ اکثریت کے فیصلہ کو ختم کر دینے کے لئے موقع کا برابر جویا تھا ہی اس کے لئے ایسا موقع جلد ہی آگیا۔ ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گذرنے پائی تھی کہ نواب مبارک الدولہ کی طرف سے محمد رضا خاں کی سرپرستی سے متعلق بے اطمینانی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ اس نے اپنے خط موصولہ ۱۲ فروری ۱۷۷۸ء میں گورنر جنرل اور کونسل دونوں سے اس بات کی درخواست کی ہے

---

۵۱ Secret proceedings; OC. 14 Sept 1775; No. 2.

۵۲ Secret proceedings; OC. 14 Sept 1775; No. 6.

۵۳ سیر المتاخرین ج ۳ ص ۷۶۔ (ترجمہ)

کہ اسے اپنے نائب اور سرپرست کو معزول کر دینے اور خود مختاری حاصل کر لینے کی اجازت دی جائے[۵۱]
۲ مارچ کے جلسہ میں جب کونسل نے اس خط پر غور کیا تو مسٹر وہیلز اور مسٹر فرانسس دونوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس معاملہ کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کے حوالہ کر دیا جائے[۵۲] - بارول اس جلسہ میں موجود نہ تھا اس لئے یہ تجویز منظور کر لی گئی - لیکن ۵ مارچ کو جب بارول موجود تھا۔ ہیسٹنگ نے اس معاملہ کو پھر اٹھایا اور اب اس کی رائے کے مطابق ہی فیصلہ ہوگیا کہ نواب کو کامل خود مختاری سپرد کر دی جائے۔ اس نے محمد رضا خاں کو برطرف کر دیا اور اس کی جگہ راجہ گرداس کو اپنا دیوان اور صدر الحق خاں کو نائب مقرر کر لیا۔ علاوہ بریں اس نے منی بیگم کو اس کی سالانہ پنشن کے علاوہ چھ ہزار روپیہ ماہانہ کا الاؤنس دینا بھی منظور کر لیا[۵۳]۔ ہیسٹنگ نواب کے ان تمام فیصلوں سے بالکل متفق تھا[۵۴]۔
غلام حسین کا بیان ہے کہ رضا خاں کی برطرفی کے بعد بیگم نے ایک بالکل نئی قسم کی زندگی کا آغاز کر دیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ صدر الحق خاں سے نیابت کا عہدہ چھین لے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکی[۵۵]۔ تاہم اس کے اختیارات کافی وسیع تھے۔ اس نے صدر الحق خاں کو مدد دینے سے دست کشی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سازش اور تعصب کے مضر اثرات کے ماتحت انصاف کا نظم و نسق بالکل ختم ہوگیا۔ اور ہیسٹنگ کو منی بیگم کے نام ایک نہایت سخت خط لکھنا پڑا جس میں بیگم کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے لوگوں کو صدر الحق خاں کے معاملات میں دخل دینے سے باز رکھے، پھر اس خط میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ اس تمام خلفشار اور بدنظمی کا اصل باعث اس کا (بیگم کا) معتمد خواجہ سرا اعتبار علی ہے۔ بیگم کو اس پر ہرگز اعتبار نہ کرنا چاہیئے"[۵۶]

---

۵۱ Secret proceedings; OC. 23 Feb. 1778. No. 15
۵۲ Secret proceedings; OC. 2. March. 1778 No 3. and No. 4.
۵۳ Secret proceedings; 4. May 1778; PP. 241-240.
۵۴ See the Resolution of the Board.
۵ Secret proceedings; 11 May 1778; P. 259
۵۵ سیر المتاخرین ج ۲ ص ۸۰۳ (اصل)
۵۶ CI. 10; PP. 115-17; No 184; C.P.C; V; L. 1133.

اس اثنا میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کو ان تبدیلیوں کا علم ہوا تو اس نے ان کو ناپسند کیا اور گورنمنٹ کو حکم بھیجا کہ محمد رضا خاں کو پھر اس کے عہدہ پر بحال کر دیا جائے۔ چنانچہ نواب کے احتجاج کے باوجود فروری ۱۷۸۰ء میں رضا خاں کو دوبارہ نائب صوبہ مقرر کر دیا گیا اور ساتھ ہی بیگم کے لئے چھ ہزار روپیہ ماہانہ کا جو الاؤنس منظور کیا گیا تھا اسے بھی بند کر دیا گیا۔ نواب کی بار بار کی درخواستوں کے باعث ہیسٹنگ نے ۱۷۸۱ء میں ہوم گورنمنٹ کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوئے رضا خاں کو نواب کے امور خانگی کے نگراں کے عہدہ سے برطرف کر دیا۔ البتہ اس کے بعد بھی رضا خاں اپنی وفات (۱۷۹۱ء) تک صوبہ کی عدالت فوجداری کے صدر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ [1]

ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہیسٹنگ کے ساتھ نواب کے اور خصوصاً منی بیگم کے تعلقات بہت خوشگوار اور دوستانہ تھے۔ منی بیگم اور ہیسٹنگ کے درمیان تو مسلسل خط و کتابت بھی تھی اور صرف اسی زمانہ میں نہیں جبکہ موخر الذکر ہندوستان میں مقیم تھا بلکہ یہ سلسلہ اس کے انگلینڈ چلے جانے کے بعد بھی قائم رہا۔ ہیسٹنگ منی بیگم کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے کونسل کی اکثریت کے فیصلہ کے خلاف بیگم کی مدافعت کی اور اس کو بحال کرنے کی جدوجہد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ۱۷۸۳ء میں جب بیگم کو نواب کی سرپرستی کے عہدہ سے الگ کرنے کے ساتھ اس کی ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن بھی بند کر دی گئی تھی تو اس کو دوبارہ جاری کرنے کے لئے ہیسٹنگ نے کورٹ آف ڈائرکٹرز سے بیگم کی سفارش کی۔ [2]
اسی طرح دوسری جانب منی بیگم ہیسٹنگ کے معاملات سے بڑی دلچسپی لیتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب ہیسٹنگ نے اپنے خط مورخہ ۸ فروری ۱۷۸۸ء میں نسبت تھومپسن سے یہ درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے لوگوں سے ان کے ساتھ خود اس کے رویہ کے متعلق مستند تصدیقات

---

[1] See governor general's minute Secret Proceedings; OC. 6 July 1781; No. 1.
[2] See extract of a general letter from Court 21 July 1786, Secret Proceedings, 11 June 1787 P.P. 3381-83.

فراہم کرکے بھیجدے تاکہ ہیسٹنگ کے خلاف لندن میں جو مقدمہ چل رہا تھا اس میں ان تصدیقات سے اس کو کچھ مدد مل سکے[۵۱] تو بیگم نے بڑی خوشی سے اپنا ایک تصدیق نامہ بھیجدیا۔ علاوہ بریں جب ہیسٹنگ کو اپنے انگلینڈ والے مقدمہ میں کامیابی ہوئی تو اس نے اس کے نام مبارکباد کا پیغام بھی ارسال کیا تھا۔[۵۲]

ہیسٹنگ کی دوسری بیوی میرین سے بھی منی بیگم کے بہت گہرے روابط تھے۔ ہیسٹنگ اور منی بیگم دونوں کے دوطرفہ خطوط سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے[۵۳]۔ کہ بیگم اور لیڈی ہیسٹنگ دونوں میں بہت ہی بے تکلفی تھی۔ جب تک لیڈی ہیسٹنگ ہندوستان میں رہی اور پھر اس کے انگلینڈ چلے جانے کے بعد بھی بیگم اس کے لئے ہاتھی دانت کی کرسیاں بطور تحفہ تحائف بھیجتی رہی[۵۴]۔ کلکتہ کے وکٹوریہ میموریل ہال میں اس قسم کی کرسیوں کا ایک سٹ اب بھی محفوظ ہے جو منی بیگم نے مسز ہیسٹنگ کو تحفۃً دی تھیں۔

نسبت تھومپسن اپنے ایک خط مورخہ ۲۵ مارچ ۱۷۸۶ء میں وارن ہیسٹنگ کو لکھتا ہے کہ مجھکو منی بیگم نے مسز ہیسٹنگ کے لئے ہاتھی دانت کی چار کرسیاں اور ایک میز دی ہے اور میں ان کو پہلے جہاز سے ہی انگلینڈ روانہ کردونگا۔ اس کے جواب میں ہیسٹنگ نے لکھا ہے کہ مسز ہیسٹنگ کو آپ کا خط مل گیا ہے وہ کہتی ہیں کہ ہاتھی دانت کی یہ کرسیاں بہت قیمتی چیزیں ہیں معمولی نہیں ہیں اور آپ ان کو پہلے جہاز سے ہی روانہ کردیں[۵۶]۔

ہمیں یقینی طور پر یہ علم نہیں ہے کہ جانبین سے تحفہ تحائف کا یہ سلسلہ ہندوستان میں ہیسٹنگ کی پالیسی پر بھی اثر انداز ہوتا تھا یا نہیں۔ البتہ مسٹر آرسی میکون نے ۱۹۱۰ء میں "امپائر" اخبار کے

---

۵۱ See Nesbitt-Thompson Correspondence. Bengal past and present; 1919. P. 181-82.

۵۲ See TR. 38; P. 631; No. 356.

۵۳ Letters of warren to his wife by Sydney C. Grie

۵۴ Cotton; Calcutta old and new; P. 825.

۵۵ See Bengal past and present; Vol. 16. P. 225

۵۶ " " " " " 17. P. 82.

ایک نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے بڑے زور سے کہا تھا کہ "ہیسٹنگ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی چہیتی بیوی ملک کی ریاستوں سے بڑے بڑے قیمتی ہدایا اور تحائف لیتی ہے اور ان سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کو ان ریاستوں کے ساتھ یک گونہ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن باایں ہمہ اس کی ہندوستان سے متعلق پالیسی پر ان چیزوں کا اثر نہیں ہوتا۔"[1]

جب ہیسٹنگ نے ہندوستان چھوڑا ہے نواب بنگال تمام اختیارات سے محروم ہو چکا اور سیاسی طاقت کے اعتبار سے اپنی اہمیت کھو چکا تھا اس کے ہاتھوں میں اب خود مختاری کی کوئی علامت نہ تھی اور اب وہ برطانوی حکومت کا صرف ایک پنشن خوار تھا۔ نواب کی مالی حالت اور بھی افسوسناک تھی۔ کمپنی کی طرف سے اس کا جو وظیفہ مقرر تھا اس سے نواب کے خانگی اخراجات پورے نہ ہو سکتے تھے۔ چوبیس سال کی عمر میں ہی نواب مبارک الدولہ گیارہ لڑکوں اور ایک درجن لڑکیوں کے باپ ہو چکے تھے۔ نسلی رفتار کی اس سرعت کے باعث نواب نے پنشن کے اضافہ کا مطالبہ کیا۔ علاوہ بریں محل کی تمام عمارتیں نہایت خراب و خستہ ہو رہی تھیں اور وہ ہرگز ایک نواب کی جائے رہائش بننے کے لائق نہ تھیں۔ ریاض السلاطین کے مصنف نے ۱۷۸۶ء اور ۱۷۸۷ء کے حالات میں لکھا ہے کہ محل کا وہ حصہ جو موتی جھیل اور ہیرا جھیل کہلاتا تھا اور جو ایک زمانہ میں نہایت خوبصورت تھا اب وہ بالکل خراب و ویران پڑا ہوا تھا۔[2] چنانچہ نواب گورنر جنرل کو ایک خط میں جو کسی بعد کی تاریخ میں لکھا گیا تھا بڑے درد کے ساتھ ان تکالیف اور شدائد کا ذکر کرتا ہے جن سے اس کا تمام خاندان دوچار ہو رہا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ لکھتا ہے "ہم لوگوں کو تو اب کھانے پینے کی چیزوں اور لباس تک کا توڑا پڑ گیا ہے۔ قلعہ میں جو محل میرے قبضہ میں ہیں وہ بڑی خرابی اور خستگی کی حالت میں ہیں۔ میں خود ان کی مرمت کرا نہیں سکتا۔ علاوہ بریں میری بہنیری لڑکیاں شادی قابل ہو گئی ہیں مگر میرے پاس ان کی شادی کے لئے روپیہ نہیں ہے جس کی وجہ سے میں بہت

---

[1] See Bengal - Past and present. Vol. 5. P. 384.

[2] ریاض السلاطین ص ۲۹ (ترجمہ)۔

پریشان ہوں ۔ ۵۱

نواب نے ایک میموریل آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے نام بھیجا جس میں اپنی مشکلات کا ذکر کیا تھا۔ کورٹ نے اسے اپنے خط مورخہ ۲۱ رجولائی ۱۷۸۶ء کے ساتھ گورنمنٹ کے پاس بھیجدیا اور ذیل کے لفظوں میں سفارش کی کہ اس میموریل پر اس لئے غور کیا جائے کہ نواب کی شان اور اس کی حمایت کو حاصل کرنے کے لئے یا تو نواب پر زیادہ کڑی نگرانی رکھی جائے یا اس کے خانگی انتظامات کو اقتصادی طور پر بہتر بنایا جائے اور یا فوراً اس کے وظیفہ میں اضافہ کردیا جائے ۔ ۵۲

ان احکام کی تعمیل کرنے کے لئے حکومت کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ نظامت کے معاملات میں ابتدائی چھان بین کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے مسٹر شور اور مسٹر ایوز مرشدآباد روانہ کردیئے گئے۔ ان دونوں حکام کی ۵۳ رپورٹ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظامت کے معاملات نہایت ابتر اور پراگندہ تھے جس کا باعث دیوان راجہ سندر سنگھ کی بدانتظامی تھی۔ نواب بہت زیادہ مقروض ہوگیا تھا اور نواب کے خانگی اخراجات میں کسی قسم کی کوئی کفایت شعاری ملحوظ نہ رہتی تھی۔ مسٹر ایوز نے تجویز کی کہ نواب کے قرض کو ادا کرنے کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جائے اور اسی سے نواب کے خاندان میں جو اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے لئے بندوبست کیا جائے۔ اس کے مطابق ۵۴ ۱۷۹۰ء میں لارڈ کارن والز نے ایک رپورٹ مورخہ ۳ رستمبر مرتب کی اور اس میں مسٹر ایوز کی اس تجویز کی جو وہ ۱۷۸۷ء میں پیش کرچکے تھے۔ اسی تاریخ کے ایک خط میں گورنر جنرل نے وظائف نظامت کے بخشی کو اطلاع دی کہ ہم مرشدآباد کی نظامت سے متعلق امور ذیل کو مناسب خیال کرتے ہیں۔

---

۵۱ See Nawab's letter received 2 Jan 1793. T.R. 333; No. 2. P.6.

۵۲ Public Proceedings, OC. 3 Sept. 1790. No. 1.

۵۳ For Shore's report see " Secret proceedings 11 June 1787. PP. 3329–69 For Ives report see Public proceedings OC. 3. Sept 1790. No. 1.

۵۴ Public proceedings OC. 3 Sept 1790. No. 2.

(۱) ہز ہائینس نواب مبارک الدولہ پر جو قرض ہے اس کو ادا کرنے کے لئے اس وظیفہ میں سے ہی جو کمپنی نے نواب کے لئے مقرر کر رکھا ہے ایک فنڈ قائم کیا جائے۔

(۲) نواب کے خاندان میں جو آئندہ چل کر اضافہ ہونیوالا ہے اس کے اخراجات کے لئے نواب کے وظیفہ میں سے ہی ایک فنڈ مہیا کیا جائے۔

(۳) نظامت کے مختلف شعبوں کو مختلف عنوانوں کے ماتحت مرتب اور منظم کر دیا جائے تاکہ پھر اس کے مطابق نواب کے لئے جو وظیفہ مقرر ہے وہ ٹھیک طور پر صرف ہو سکے[۵۱]

نواب ان تجاویز پر عمل کرنے میں متامل تھا۔ اس بنا پر گورنر جنرل نے منی بیگم کو لکھا کہ ان تجاویز کو عمل میں لانے کی نگرانی کرے۔ اس وقت نظامت کے حالات بہت ابتر ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود بیگم نے اس بوجھ کو اٹھانے کی ہامی بھر لی چنانچہ ۱۷۹۰ء سے ۱۸۱۳ء تک جبکہ اس کا انتقال ہوا ہے وہ برابر اپنے تجربہ اور عقلمندی سے امور نظامت کو مرتب اور منظم کرنے کی کوشش میں مصروف رہی۔ اس وقت اس کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی لیکن باایںہمہ وہ گورنمنٹ کی مختلف تجاویز کی تعمیل میں گہری دلچسپی اور چستی کا ثبوت بہم پہنچاتی رہی۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں جو ۲۴ر دسمبر ۱۷۹۵ء کو موصول ہوا ہے[۵۲] تفصیل سے بتاتی ہے کہ اس نے مرحوم نواب مبارک الدولہ کے ماتحت رہتے ہوئے کس طرح کارن والس کی تجاویز کو بروئے کار آنے میں مدد دی ہے۔ ۱۷۹۱ء کے آغاز سے ۱۷۹۳ء کے اختتام تک بیگم نے نواب کے قرض میں سے تقریباً چھ لاکھ روپیہ کا قرض ادا کر دیا تھا۔ قرض کی رقم میں کمی کے ساتھ ساتھ نظامت میں تمام الاؤنس بھی بروقت ادا ہونے لگے تھے جس کا اعتراف ہر شخص کرتا تھا۔ ہیرنگٹن اپنے ایک خط مورخہ ۲۷ر فروری ۱۷۹۴ء میں اڈمنسٹن کو منی بیگم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے "مجھکو یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ بیگم کے اثر اور رسوخ کے بغیر کارن والس کی تجاویز کو بہت سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔[۵۳]

---

۵۱ *Public Proceedings, OC. 3 Sept. 1790. No 2.*
۵۲ *TR. 38, PP. 819–37, No 432.*
۵۳ *Copies of Correspondence with the Supdt. of Nizamat affairs at Murshidabad (1788–1811) P. 219.*

۱۷۹۳ء میں نواب مبارک الدولہ کا انتقال ہوا اور نواب نصیر الملک (مبارک الدولہ ثانی) جانشین ہوا تو اب نظامت کے معاملات میں اور زیادہ ابتری پیدا ہوگئی۔ صحبتِ بد کی وجہ سے نواب جلد ہی بدقماش لوگوں کے اثر میں آگیا۔ چنانچہ اس نے امام قلی کو جو ایک بہت معمولی سمجھ کا انسان تھا اپنا میر سامان مقرر کیا۔ ایک دوسرا شخص شمس الدولہ جو خود اپنے لئے نائب ناظم کا عہدہ حاصل کرنا چاہتا تھا اس نے منی بیگم کی طرف سے نواب کو بدظن کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے زیر اثر نواب نے چاہا کہ بیگم کو نظامت کے تمام امور کے انتظام و انصرام سے الگ کر دے۔ مزید براں یہ ہوا کہ تقریباً ایک لاکھ روپیہ کا جدید قرض نواب کے ذمہ ہوگیا۔ چنانچہ ایک خط میں جو ۲۲ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو وصول ہوا ہے[۵۱] منی بیگم گورنر جنرل کو ان تمام بدانتظامیوں اور خرابیوں سے مطلع کرتی ہے جو نظامت کے انتظامات میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس بنا پر سر جان شور نے اب ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا۔ لیکن چونکہ منی بیگم اور نواب کے تعلقات باہمی بے اعتمادی اور شک و شبہ کی وجہ سے بہت کشیدہ ہو چکے تھے اس لئے اس نئی اسکیم کو کامیابی نہ ہو سکی۔

۱۷۹۷ء میں لارڈ ویلزلی گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو انھوں نے ۱۸۰۱ء میں نظامت کے اخراجات میں تخفیف کے پیش نظر تمام معاملات کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی لیکن اس کمیٹی کے سفارشات پر کوئی عمل نہ کیا گیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بیگم اور اس کے لائق دیوان رائے مانک چند کی کوششوں سے قرض کی رقم میں کافی تخفیف ہوگئی جس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ قرض خواہوں سے اس معاملہ میں کوئی مصالحت ہوگئی تھی اور کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ پس انداز رقم سے قرض ادا بھی کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں نظامت پر جو قرض تھا اس کی مقدار آٹھ لاکھ روپیہ تھی۔ لیکن ۱۸۰۷ء کے ختم پر یہ مقدار گھٹ کر پانچ لاکھ سے کچھ کم رہ گئی تھی۔[۵۲]

۱۸۰۷ء میں نظامت کے معاملات کی پھر چھان بین ہوئی اور اس مقصد کے لئے مسٹر پٹیل

---

۵۱ T R. 38, PP. 589-600 No. 337.

۵۲ P.A. Proceedings, OC. 23 July. 1816. No. 1.

کو خاص طور پر مرشد آباد بھیجا گیا۔ اور پھر مسٹر پیل کی سفارش پر ہی گورنمنٹ نے نواب کے ذمہ جو ذاتی قرض تھا اس کی ایک بڑی رقم ۱۸۰۸ء میں بیباق کی اور آئندہ کے لئے یہ انتظام کیا کہ باقی رقم قرض کی ادائیگی تدریجی طور پر ہوتی رہے۔ علاوہ بریں تعمیرات کے لئے کچھ رقم پیشگی بھی دیدی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح صورت حالات کسی قدر بہتر ہوگئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مستقل اصلاح اس وقت تک نہ ہو سکی جب تک کہ ۱۸۱۶ء میں نظامت ایجنسی امانت فنڈ . . . .
(Nizamat Agency Deposit fund). کا مستقل قیام عمل میں نہیں آگیا۔ مسٹر اڈمنسٹن نے ۱۸۱۶ء میں نظامت کے حالات و معاملات کے بارہ میں ایک یادداشت مرتب کی تھی اس میں اس نے بیگم کی خدمات کو بہت سراہا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

"ناظم کی وقتی نااہلیت جس کا باعث اس کی نابالغی اور کیرکٹر کی کمزوری تھی۔ اس کی وجہ سے نظامت کے انتظام میں جو خرابی پیدا ہوگئی تھی اس کی تلافی منی بیگم کی لیاقت و قابلیت، طبیعت کی استواری اور اس کے اثر ورسوخ سے ہوگئی۔" [۱]

منی بیگم اور نواب نصیر الملک میں جو اختلافات تھے ان کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ نواب ناتجربہ کار تھا اور بد قماش لوگوں کے زیر اثر تھا جو اس کے دربار پر چھائے ہوئے تھے بلکہ اس اختلاف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بیگم اقتدار پسند تھی اور ہر معاملہ میں اپنا دخل چاہتی تھی۔ چنانچہ ۱۷۹۲ء میں اس نے یہ خواہش کی کہ تمام معاملات کا انتظام و اہتمام اس کے اپنے ہاتھوں میں آجائے اور دیوان کا نام ہاد تقرر بھی اس کے اپنے انتخاب سے ہو۔ لیکن وظائف نظامت کے مہتمم نے اس تجویز کی مخالفت اس بنا پر کی کہ اگر ایسا ہو گیا تو بیگم کے ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت آجائے گی۔" [۲]

۱۸۱۰ء میں اس نے پھر کوشش کی کہ جانشینی کا معہود قاعدہ اڑا دیا جائے اور مسند پر اپنے

۱؎ Pol Proceedings, OC. 23 July 1816. No. 1.

۲؎ Copies of Correspondence with the Supdt, of Nizamat affairs at Murshidabad (1788-1811) PP. 222-24.

انتخاب کے مطابق کسی ایک نواب کو متمکن کرے۔ نواب نصیر الملک کی وفات پر اس نے گورنر جنرل کو لکھا کہ مرحوم کا بڑا لڑکا سید ضیاء الدین خاں ناتجربہ کار ہے اور مسند نشینی کے لئے جو صفات ضروری ہیں، ان سے بے بہرہ ہے۔ اس لئے اس نے سفارش کی کہ مرحوم نواب کے چھوٹے بھائی سید ابوالقاسم خاں کو جو عام طور پر منگلی صاحب کہلاتے تھے اور جن کی عمر اس وقت ۳۲ سال سے اوپر تھی اور بہت اچھی صفات سے مزین تھے۔ ان کو مسند نشین کر دیا جائے [۵۱] لیکن ریذیڈنٹ کی مخالفت کے باعث بیگم کی یہ کوشش بالکل ناکام رہی۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہئے کہ منگلی صاحب میں ہرگز وہ صفات موجود نہ تھے جو بیگم نے اس کی طرف منسوب کئے تھے۔ اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ بیگم کا مقصد اس تحریک سے بجز اس کے کچھ اور نہ تھا کہ وہ اس طرح اپنے لئے اقتدار حاصل کرنا چاہتی تھی جس کی آرزو اس کو آخری لمحۂ زندگی تک رہی۔ میر منگلی اگر مسند نشین ہو جاتے تو چونکہ ان کی یہ سرفرازی سرتاسر بیگم کے اثر و رسوخ کی ہی مرہون احسان ہوتی۔ اس بنا پر یہ لامحالہ نظامت کے تمام معاملات کا انتظام و انصرام اور اقتدار و اختیار بیگم کے ہاتھوں میں ہی دیدیتے۔" [۵۲]

منی بیگم کا انتقال ۱۸۱۳ء میں ۱۰ جنوری کو ۹۷ سال کی عمر میں ہوا۔ [۵۳] موت اچانک واقع ہوئی جس صبح کو اس کا انتقال ہوا ہے اس کی شب میں دیر تک بیٹھی ہوئی وہ محرم منانے کی تیاریوں میں مصروف رہی جس سے وہ بڑی دلچسپی لیتی تھی۔ صبح کو بیدار ہوئی تو اس وقت بھی تھکان کا کوئی اثر نہ تھا چنانچہ حسب معمول اس نے احکام جاری کرنے شروع کر دیئے۔ دس اور گیارہ بجے کے درمیان کا عمل تھا کہ وہ اچانک بیہوش ہو گئی اور طبی امداد کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کا مرغ روح قفس عنصری سے آزاد ہو گیا

---

۵۱ See her letter to Governor General. T.R. year 1810, PP. 243-47. No. 261.

۵۲ See Pol. Proceedings, O.C. July the 6th 1816. No. 46.

۵۳ For Controversy about the date of her death See Bengal - Past and present, Ap. to June 1925 PP. 153-4. In the Government Records the date 10th Jan, 1813.

اسی شام کو جعفر گنج کے خاندانی قبرستان میں اس کے شایانِ شان اعزاز و اکرام کے ساتھ اسے دفن کیا گیا۔[۵۱] سنہ ۱۸۱۶ء میں گورنمنٹ نے نظامت ایجنسی امانت فنڈ میں سے نو ہزار چھ سو روپیہ کی رقم اس لئے مخصوص کردی کہ اس رقم کے سود سے جو پانسو چھہتر ۵۷۶ ہوتے تھے مرحومہ کی قبر کے اخراجات کو پورا کیا جائے۔[۵۲]

بیگم نے اپنے ترکہ میں منقولہ اور غیر منقولہ دونوں قسم کی بہت بڑی جاگیر و جائداد چھوڑی۔ زمینوں، گھروں اور محل سے متصل چوک کے علاوہ سونے اور چاندی کے سکوں کی شکل میں اس نے جو خزانہ چھوڑا تھا وہ تقریباً پندرہ لاکھ روپیہ کا تھا۔ اس کے علاوہ بہتیرے گٹھر شالوں کے، ململ کے تھان اور دوسرے مختلف وضع قطع کے کپڑے وہ بھی بہت قیمتی تھے۔

بیگم کی کثیر دولت پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے نواب نے مرحومہ کی وفات کے فوراً بعد ہی ایک کاغذ پیش کیا جس میں بیگم کی یہ وصیت درج تھی کہ میرے بعد نواب میرے گھر، جائیداد و املاک کا مالک اور قابض ہوگا اور اس کو اختیار ہوگا کہ وہ جس طرح چاہے اس کو خرچ کرے۔ علاوہ ازیں میرے تمام رشتہ داروں متعلقین اور ملازمین وغیرہ کا سرپرست اور محافظ بھی وہی ہوگا"[۵۳] اس سلسلہ میں نواب نے اپنی ایک حرم کو بیگم کے خاص محل پر قبضہ کرنے کے لئے ڈیوڑھی بھی بھیجدیا۔ لیکن گورنمنٹ کو ایک تو اس وجہ سے کہ بیگم کی موت اچانک واقع ہوئی تھی اس بنا پر اس کو وصیت کرنے کا خیال کیسے ہو سکتا تھا اور پھر وصیت نامہ پر قاضی کی تصدیق بھی نہ تھی۔ وصیت نامہ کو مشتبہ سمجھتی تھی[۵۴] معاملاتِ نظامت کے سپرنٹنڈنٹ سے کہا گیا کہ وہ وصیت نامہ سے متعلق تمام حالات و واقعات

---

۵۱ *See letter from Supdt, of Nizamat affairs to Persian Secy, 11 June, 1813. Secret proceedings. OC. 26, Feb, 1813. No. 18.*

۵۲ *See Reports on the Accounts of Murshidabad Nizamat Stipend Fund (1816–68) P, 8.*

۵۳ *TR. 57, P. 25, No 22.*

۵۴ *Proceedings, OC. 26 Feb, 1813. No. 21.*

کی تحقیق و تفتیش کرے۔ اس سلسلہ میں جو گواہ تھے ان سے کہا گیا کہ وہ اس کے سامنے حاضر ہو کر حلف اٹھائیں لیکن ان لوگوں نے قسم کھانے سے انکار کردیا۔ علاوہ بریں خود نواب نے اپنے ایک خط مورخہ ۳۰ رجنوری میں اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ وصیت نامہ محض جعلی تھا اور اب وہ اس سلسلہ میں اپنے تمام دعاوی سے دست بردار ہوتا ہے [۵۱]

نواب کو توقع تھی کہ اس کی حرم کو منی بیگم کا مرتبہ حاصل ہوجائے گا لیکن اب اس کو یہ امید بھی نہ رہی تھی۔ تاہم گورنر جنرل نے اپنے ایک خط مورخہ ۸ رفروری ۱۸۱۳ء میں نواب کو یقین دلایا ہے کہ بیگم کی متروکہ جائیداد یا زرِ نقد کا کوئی حصہ کمپنی کے مفاد پر خرچ نہ ہوگا بلکہ اس کے برخلاف وہ کل کا کل نواب اور اس کے خاندان کے مفاد اور نظامت کے معاملات کی عام ضرورتوں پر صرف ہوگا۔ چنانچہ ۱۸۱۶ء میں پوری جائداد اور سارا خزانہ سب کا سب نواب کو دیدیا گیا۔ [۵۲]

برطانوی سیاح لارڈ ولنشیا (Lord Valentia) جس نے انیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان دیکھا تھا ۱۸۰۳ء میں وہ مرشد آباد بھی آیا تھا یہاں اس کی ملاقات نواب اور منی بیگم دونوں سے ہوئی تھی۔ بیگم کی نسبت اس نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

"بیگم تقریباً ڈیڑھ ایکڑ کے ایک باغ میں رہتی ہے جس کو اس نے میر جعفر کے انتقال کے بعد سے اب تک جس کو چالیس برس ہوگئے ہیں مرحوم کی یادگار ہونے کی وجہ سے ترک نہیں کیا ہے۔ بیگم ایک گلناری رنگ کے ریشمیں پردہ کے پیچھے سے گفتگو کررہی تھی جو ایک خوبصورت کشادہ کمرہ میں جو ستونوں پر قائم تھا پھیلا ہوا تھا۔ بیگم کی آواز اونچی اور تیز تھی۔ کبھی کبھی اس میں کپکپی بھی پیدا ہوجاتی تھی۔ مسیز پٹیلے جس نے اسے دیکھا تھا اس نے مجھکو بتایا کہ بیگم پست قامت فربہ اندام

---

۵۱ T.R. 57, P59, No 57 (Enc. 5)

۵۲ See letter from the Persian Secretary to th Supdt. of Nizamat affairs.
Walsh. History of murshidabad, P. 191.

اور ناک نقشہ کے اعتبار سے نہایت بدصورت ہے اگرچہ مزاج کے اعتبار سے وہ انتہا درجہ تشدد پسند ہے۔ تاہم نہایت سمجھدار عورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت مالدار ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے انتقال کے بعد اس کی دولت کا کیا ہوگا۔ کوئی چیز اسے وصیت کرنے پر راغب نہیں کرسکتی۔ دورانِ ملاقات میں وقفہ وقفہ سے بیگم حقہ کے کش بھی لیتی رہتی تھی۔"[۵۱]

لارڈ ولنشیا نے جب بیگم سے ملاقات کی ہے اس وقت اس کی عمر ۸۷ برس تھی اور یہ ظاہر ہے کہ اس سن رسیدگی میں یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ اس زمانہ میں بھی اس کی شگفتہ روئی اور رعنائی و زیبائی کا عالم وہی ہوگا جو اس کے عہدِ شباب میں تھا۔ جہاں تک اس کی آواز کے تیز و تند ہونے کا تعلق ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی آواز شروع سے ہی ایسی تھی۔ غلام حسین کا بیان ہے کہ بیگم اگرچہ نہایت مغرور و تند مزاج تھی تاہم وہ بڑی عقلمند اور حاضر جواب خاتون تھی[۵۲]۔ تقریباً اس عہد کے تمام مورخین نے ہی اس کی دانشمندی اور زیرکی کی داد دی ہے۔ لارڈ ولنشیا لکھتا ہے "ہر چند کہ بیگم کافی معمر ہے تاہم اس کی ذہانت اور ذکاوت اس میں اب تک پوری قوت کے ساتھ موجود ہے"[۵۳]۔

بیگم بڑی سخی اور فیاض تھی۔ غریبوں اور مفلسوں کو لڑکیوں کی شادی بیاہ کے اخراجات کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیتی تھی۔ سیر المتاخرین کے مصنف کا بیان ہے کہ جب میں مرشدآباد میں تھا تو وہاں بیچاری ایک غریب عورت تھی جو اپنی لڑکی کی شادی کا بندوبست نہ کرسکتی تھی۔ بیگم کو اس کا علم ہوا تو اس نے اس عورت کو ستر سے اسی تک سونے کی اشرفیاں دیں اور ان کے علاوہ شادی کی دوسری ضروریات بھی فراہم کیں[۵۴]۔

حکیم عسکری جو بیگم کے خصوصی معالج تھے وہ بھی بیگم کے الطاف و عنایات سے بہت کچھ

---

۵۱ Valentia, Travels in India. I. P. 227-8

۵۲ سیر المتاخرین ج ۳ ص ۱۴۷ (ترجمہ)

۵۳ Valentia, Travels in India, I. P. 73.

۵۴ سیر المتاخرین ج ۲ ص ۸۲۲ (اصل)

بہرہ مند ہوتے رہتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بیگم سولہ ہزار روپیہ سالانہ سے زائد خیرات اور صدقات پر خرچ کرتی تھی۔ نوکروں اور ماتحتوں کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ نرم اور فیاضانہ تھا۔ جو شخص ایک مرتبہ اس کی ملازمت میں داخل ہو جاتا تھا اسے وہ اس وقت تک الگ نہیں کرتی تھی جب تک اس سے کسی شدید قسم کا جرم سرزد نہ ہوتا تھا۔

ایک عام یقین یہ بھی ہے کہ بیگم بڑے وسیع پیمانہ پر تجارت کرتی تھی۔ برک کہتا ہے کہ بیگم ملک میں منشیات کی سب سے بڑی سوداگر تھی لیکن کبھی وہ ان چیزوں کی چنگی ادا نہ کرتی تھی اور خلافِ قانون ان کی تجارت کرتی تھی"[۱] لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ یہ بیگم نہیں بلکہ اس کا خواجہ سرا تھا جو اس تجارت سے بڑی دلچسپی لیتا تھا اور اس طرح اس نے بہت وافر دولت کمائی تھی[۲]

یہ ظاہر ہے کہ بیگم کسی شریف گھرانہ سے تعلق نہ رکھتی تھی اور اس نے تعلیم بھی حاصل نہ کی تھی۔ تاہم ایک وسیع مفہوم کے اعتبار سے وہ شائستہ ضرور تھی۔ اسے تعمیرات کا بڑا شوق تھا۔ ۱۷۶۷ء میں اس نے چوک مسجد بنوائی جو مرشد آباد کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ کپڑے اور ہاتھی دانت کی مقامی صنعتوں کی بھی وہ بڑی حوصلہ افزائی کرتی تھی اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے عہد کی بڑی نامور خاتون تھی۔ انگریز بھی اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور بسا اوقات اس کو "ماں" یا "بڑا بیگم" کہکر خطاب کرتے تھے۔

---

[۱] See Burke's Impeachment of Warren Hastings. P. 494.

[۲] See Pol Proceedings, OC. 6 July. 1816. No. 46.

بقیہ نظرات

روسی، یا فرانسیسی اس درجہ تک سکھائی جائے گی کہ وہ اس میں بے تکلف لکھ پڑھ سکیں اور تحریر و تقریر کر سکیں پھر ساتھ ہی فلسفۂ جدیدہ اور پولیٹکل سائنس کی بھی ان کو تعلیم دی جائے گی۔

(۴) فارغ التحصیل ہونے کے بعد ادارہ ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان کے لئے تبلیغ کا کوئی ایک خاص پروگرام تجویز کریگا اور ہر ایک کو اس ملک میں بھیجے گا جس ملک کی اس نے زبان سیکھی ہے۔

(۵) ادارہ ان کی معاش کے لئے جو ماہوار مقرر کرے گا انھیں بہر حال اسی میں گذر بسر کرنا ہوگا کسی اور ذریعے سے ایک پیسہ زائد بھی وہ حاصل نہ کر سکیں گے۔

(۶) مبلغین کا یہ کام صرف تحریر و تقریر اور کتابوں اور رسالوں کی تصنیف و تالیف تک ہی محدود نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اس بات کی کوشش بھی کریں گے کہ جہاں کہیں کوئی نظامِ باطل برسر اقتدار ہے اس کو شکست دیکر اس کی جگہ حق کا نظامِ حکومت قائم کریں۔ اس سلسلہ میں ابھی اور بہت سی باتیں ہیں جو قابلِ غور اور لائقِ گفتگو ہیں۔ تفصیل سے گفتگو کے وقت ان پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں نے تو تبلیغِ اسلام کی راہ میں جو کچھ کیا ہے شاید دنیا کی کوئی قوم اس میں ان کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔ لیکن آج کمونسٹ پارٹی کمونزم کو فروغ دینے کے لئے لالہ لاجپت رائے کی قائم کی ہوئی پیپلز سرونٹ ایسوسی ایشن اور ہندوؤں اور عیسائیوں کے دوسرے ادارے اپنے اپنے مقصد کے لئے جس طرح کام کر رہے ہیں ان میں بھی مسلمانوں کے لئے بڑی عبرتیں ہیں۔

سنہ ۴۳ء: قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ: تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں قیمت سے مجلد ہے

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ

سنہ ۴۳ء: مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت: صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپیے مجلد سات روپیے۔

خلافتِ بنی امیہ: تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات عہ مجلد ہے

سنہ ۴۴ء: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

سنہ ۴۵ء: قرآن اور تصوف: اس کتاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقامِ عبدیت مع الالوہیت مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اسی طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد ہے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ کے حالاتِ مبارکہ کا بیان قیمت صہ مجلد ہے

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ہے

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) **محسنِ خاص**:- جو مخصوص حضرات کم سے کم پانسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین**:- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین**:- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبّا**:- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپیے، ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبا کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ۳ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد سہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہر

۱۹۴۰ء نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہمِ قرآن جدید ایڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بےمثل کتاب قیمت عہ مجلد سہ

غلامانِ اسلام۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد سہ

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ مجلد سہ

۱۹۴۱ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت صہ مجلد سہ

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ [illegible] یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق [illegible] آٹھ ہر

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپیے مجلد ۳

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

بُرہَان

جلد ششدہم   شمارہ (۵)

مئی ۱۹۴۶ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ

فہرست مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۲۵۸
۲۔ حدیثِ افتراق اور اس کی اسناد پر ایک نظر	جناب مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی	۲۶۱
۳۔ حجاجِ ابراہیمی اور [illegible] مغالطہ	مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۲۸۹
۴۔ [illegible] ور علم النفس	جناب ہدایت الرحمٰن محسنی صاحب ایم اے	۳۰۱
۵۔ ادبیات:۔		
نہیں رہے	از جناب ماہر القادری	۳۱۳
تبرکات	از جناب حضرت شیخ الہند صاحب محدثؒ	۳۱۴
۶۔ تبصرے	م۔ ح	۳۱۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے پچھلے چند مہینوں میں اسلامی ہند کی بعض نامور شخصیتوں نے جو علم وادب اور دین وسیاست کے مختلف اعتبارات سے اپنا اپنا ایک نمایاں مقام رکھتی تھیں۔ اس جہانِ فانی کو وداع کہکر عالمِ جاودانی کی راہ لی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے سانحۂ ارتحال مولانا محمد میاں منصور کا پیش آیا۔ مولانا مرحوم ہمارے لائق اور عزیز دوست مولانا حامد الانصاری غازی اڈیٹر مدینہ کے والد ماجد اور دار العلوم دیوبند کے قدیم فرزند معنوی تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیضان صحبت نے جن چند خوش نصیبوں کے مس خام کو چمکا کر کندن بنا دیا تھا مولانا مرحوم بھی انھیں میں سے ایک تھے۔ چنانچہ وہ حضرت شیخ الہند کے مشن پر افغانستان گئے اور اتحادِ اسلامی کی تحریک کے سلسلہ میں وہاں رہ کر انقلابی قسم کے مختلف کام کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ان کے لئے خود ان کے وطنِ عزیز کی سرزمین ارضِ ممنوعہ قرار دیدی گئی۔ اور دوسری جانب دشمنوں کی ریشہ دوانیوں نے دار الہجرت (افغانستان) میں بھی ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ لیکن بااین ہمہ وہ تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف اور عملی جد وجہد کے ذریعہ مسلمانوں کو اسلامی انقلاب کی دعوت دیکر حضرت شیخ الہندؒ کے "خوابِ پریشاں" کی تفسیر وتعبیر سناتے رہے اور آخرکار عرصۂ طویل کی جلاوطنی کے بعد جان بحق تسلیم کو سپرد کرکے راہیِ ملک بقا ہو گئے۔ ہرچند کہ ان کی وفات وطن سے بہت دور ہوئی تاہم افغانستان اسلامی ملک ہونے کے باعث ان کے لئے "دیارِ غیر" نہ تھا چنانچہ جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھا اور فرمانِ شاہی کے مطابق فوجی اعزاز واکرام کے ساتھ تدفین کی رسم عمل میں آئی۔ رب السموات والارض ان کو صدیقین وشہدار کا مقامِ جلیل عطا فرمائے اور اپنے الطافِ خاص سے نوازے۔ آمین

دوسرا حادثۂ وفات پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کا ہے جو فروری کی آخری تاریخوں میں پیش آیا۔ مرحوم فارسی اور اردو دونوں زبانوں کی شعر وشاعری اور تاریخ ادب کے نامور محقق اور فاضل تھے۔ ذکاوت وفطانت کے ساتھ قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔ قرآن مجید کے حافظ تھے ہی۔ فردوسی کا شاہنامہ بھی انھیں ازبر یاد تھا۔ یورپ میں ایک مدت تک رہ چکے تھے اور وہاں کے نامور مستشرقین سے روابط رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی اور اردو کی قلمی کتابوں اور مختلف قدیم اسلامی سلطنتوں کے سکوں کو جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اور وہ علمی تحقیق وجستجو کے میدان میں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ فارسی اور اردو زبان کے شعراء کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں اور ان کے مجموعہائے کلام پر ان کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ اور علم عروض میں بھی بڑا درک رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بیس سال تک اس خدمت پر مامور رہنے کے بعد سنہ ۴۰ء میں اس سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن ٹونک میں خانہ نشین ہوگئے۔ اس مدت میں آپ نے بحیثیت نقاد ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت پائی۔ اس شہرت کا آغاز اس مقالہ سے ہوا جو "تنقید شعرالعجم" کے نام سے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں کئی سال تک مسلسل نکلتا رہا تھا۔ اور جواب اسی نام سے کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آب حیات، آزاد "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی" "رباعی کے اوزان" وغیرہ پر جو آپ کے تنقیدی مقالات اورینٹل کالج میگزین لاہور اور دوسرے رسائل میں شائع ہوچکے ہیں ان میں سے ہر ایک مقالہ معلومات اور تحقیق وژرف نگاہی کے اعتبار سے فارسی اور اردو ادبیات کے طالب علم کے لئے انمول موتیوں کا ایک خزانہ ہے۔ مستقل تصنیفات میں "پنجاب میں اردو" "فردوسی پر چار مقالے" "پرتھی راج راسا" اور "خالق باری" آپ کی قابل قدر علمی یادگاریں ہیں۔ تنقید کرتے وقت مرحوم کے لب ولہجہ میں کہیں کہیں درشتی اور تلخی ضرور آجاتی تھی جو بعض مواقع پر کسی ذاتی یا طبقاتی پرخاش کی غمازی کرتی تھی تاہم بحیثیتِ مجموعی انھوں نے اردو زبان میں فنِ تنقید کا

معیار اتنا اونچا کر دیا ہے کہ مغرب کے اربابِ تنقید بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

مرحوم جنھوں نے اپنی تنقید سے بڑے بڑے اربابِ تحقیق مصنفوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا خود ایک عرصہ سے ضیق النفس کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ آخر یہ مرض ان کی جان لیکر رہا! حق تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور دامانِ مغفرت میں چھپالے۔ آمین۔

سب سے آخر میں رنج واندوہ کے گہرے جذبات کے ساتھ ہمیں اپنے مخدوم اور بزرگ مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری کے حادثۂ وفات کا ماتم کرنا ہے جو ۲۰ مارچ کو پیش آیا مولانا کی عمر اس وقت تقریباً اسّی برس کی تھی۔ سرسید کے زمانہ میں مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں تعلیم پائی تھی۔ عربی کی استعداد معمولی تھی لیکن انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بے تکلف تحریر و تقریر کی قدرت رکھتے تھے۔ مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ قومی اور سیاسی مسائل میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ چھوٹے بڑے سینکڑوں مقالات اور رسائل کے علاوہ مرحوم کی ایک عظیم الشان تصنیفی یادگار "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوصف صورت وسیرت اور وضع قطع کے اعتبار سے بالکل ٹھیٹ مُلّا معلوم ہوتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ سادگی اور انکساری تھی۔ ساری عمر مسلمانوں کے لئے نہایت ٹھوس اور تعمیری کام کرتے رہے لیکن خود نمائی اور شہرت طلبی کا کہیں آس پاس بھی گذر نہ ہوا تھا۔ اخلاق وعادات کے لحاظ سے اسلامی شرافت ونیک نفسی کے پیکر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اخلاق کے بزرگ ہماری نظروں سے بہت کم گذرے ہیں۔ ایک زمانہ میں جوازِ سود کے قائل تھے لیکن بعد میں اس سے رجوع کر کے علمائے حق کے ہی ساتھی ہو گئے تھے۔ ایک عرصہ سے چند در چند امراض کا شکار تھے لیکن اپنے فرائض وواجباتِ زندگی کو ادا کرنے میں آخر دم تک جوانوں سے بھی زیادہ باہمت اور مستعد رہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو عنبریں کرے اور نعمائے جنت سے بہرہ اندوز فرمائے۔ آمین۔

حدیث افتراقِ امت

اور

اس کی اسناد پر ایک نظر

از جناب مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی ندوۃ المصنفین دہلی

ابوہریرہؓ کی حدیث

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال تفرقت الیھود علی احدی وسبعین او ثنتین وسبعین فرقۃ والنصاری مثل ذلک وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ (ترمذی)

ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے یہود ۷۱ یا ۷۲ فرقوں میں منقسم ہوئے اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں منقسم ہوئے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں منقسم ہوجائے گی۔

عبداللہ بن عمروؓ کی روایت

امام ترمذیؒ نے حدیث مذکور کی روایت کرنے والوں میں چار صحابہؓ کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمروؓ کی روایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے اور حضرت سعدؓ اور عوف بن مالکؓ کا صرف حوالہ دیکر چھوڑ دیا ہے پھر اول الذکر صحابی کی حدیث پر صحت کا حکم لگایا ہے اور ثانی الذکر[1] کی حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

حافظ سخاویؒ نے بھی مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے اور شیخ محمد طاہر نے تذکرۃ الموضوعات میں اسے نقل فرما کر کوئی اختلافِ رائے ظاہر نہیں کیا۔

امام شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام میں ابوہریرہؓ کی روایت پر کئی جگہ صحت کا حکم

---

[1] حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمن بن زیاد افریقی ہے وہ ضعیف ہیں (مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸)

لگایا ہے۔[۵۱]

حدیثِ افتراق کے پندرہ راویوں کے نام

شارح سفر السعادۃ نے امام ترمذی کے پیش کردہ ناموں پر گیارہ صحابہ کا اور اضافہ کیا ہے انس[۱]۔ جابر[۲]۔ ابو امامہ[۳]۔ ابنِ مسعود[۴]۔ علی[۵]۔ عمرو بن عوف[۶]۔ عویمر[۷]۔ ابو الدرداء[۸]۔ ابو معاویہ[۹][۵۲] ابن عمر[۱۰]۔ واثلہ[۱۱] رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ اس طرح اس حدیث کے رواۃ کی تعداد ۱۵ تک پہنچ جاتی ہے جن میں ابوہریرہ رضؓ کی روایت کے متعلق جہاں تک ہمیں معلوم ہے کسی نے کوئی قابلِ ذکر ردوقدح نہیں کی۔ بعض دوسرے صحابہ کی روایات میں البتہ کچھ کلام کیا گیا ہے جو مختصراً درج ذیل ہے

حضرت انس رضؓ کی روایت

شیخ جلال الدین سیوطیؒ حضرت انس رضؓ کی روایت عقیلی اور دارقطنی کے حوالہ سے پیش کر کے تحریر فرماتے ہیں۔ والحدیث المعروف واحدۃ فی الجنۃ وھی الجماعۃ (یعنی معروف حدیث کے الفاظ یہ ہیں" ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ مسلمانوں کی جماعت ہوگی) پھر بطریق ابنِ عدی نقل کر کے کہتے ہیں والمحفوظ فی المتن (یعنی اس متن کے جو الفاظ محفوظ ہیں یہ ہیں)" تفترق امتی عن ثلاث وسبعین فرقۃ کلھا فی النار الا واحدۃ"[۵۳]

اہلِ علم جانتے ہیں کہ معروف و محفوظ منکر و شاذ کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور شاذ و منکر میں صرف راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا فرق ہے گویا پہلے الفاظ کے خلاف روایت کرنیوالے راوی ثقہ نہیں ہیں اور دوسرے متن کے خلاف راوی اگرچہ ثقہ ہیں مگر ان کے الفاظ میں شذوذ ہے۔ بہر حال معروف و محفوظ کہکر حافظ سیوطیؒ نے حضرت انس رضؓ کی روایت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔

---

۵۱ دیکھو ج ۲ ص ۱۶۳ و ۱۷۰ و ۲۰۶۔ اور الموافقات ج ۴ ص ۱۷۷۔ حاکم نے حدیثِ مذکور کو دو جگہ روایت کیا ہے (مستدرک ج ۱ ص ۶ و ۱۲۸)۔ ذہبی فرماتے ہیں علی شرط مسلم۔ یعنی یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔

۵۲ مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ مسند احمد و ابوداؤد صحابی کا نام معاویہ ذکر کیا ہے اگر کتب حدیث میں کہیں ابو معاویہ کی روایت مل جائے تو خیر ورنہ بظاہر یہاں راوی معاویہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کنز العمال میں بھی راوی کا نام معاویہ ہے بحوالہ مسند احمد و طبرانی۔ مستدرک (دیکھو ج ۱ ص ۵۴) مستدرک میں بھی معاویہ ہے (دیکھو ج ۱ ص ۱۲۸)

۵۳ اللآلی ص ۲۴۸ و ۲۴۹

حافظ نورالدین ہیثمی نے اس مقام پر قدرے مبسوط کلام کیا ہے اور اس حدیث کے طرقِ سنن مشہورہ کے علاوہ مسند ابو یعلیٰ، مسند بزار اور طبرانی سے پیش فرما کر ہر صحابی کی روایت پر تنقید کی ہے۔ چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت کو بطریق مسند ابو یعلیٰ ایک طویل سیاق کے ساتھ نقل فرما کر لکھتے ہیں:

ویزید الرقاشی ضعفہ الجمہور وفیہ توثیق لین وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح۔ [1]	اس میں ایک راوی یزید رقاشی ہے جس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے اور ہلکے درجہ پر اس کی توثیق بھی کی گئی ہے بقیہ تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔

ایک جگہ اسی حدیث کا دوسرا طریقہ پیش کر کے اس پر حسب ذیل کلام کرتے ہیں۔

رواہ ابو یعلی وفیہ ابو معشر نجیح وفیہ ضعف۔ [2]	اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی ابو معشر نجیح ہے اس میں قدرے ضعف ہے۔

حضرت ابو امامہؓ کی روایت حضرت ابو امامہ کی روایت کے متعلق فرماتے ہیں۔

رواہ ابن ماجہ والترمذی باختصار رواہ الطبرانی ورجالہ ثقات [3]	اس کو ابن ماجہ اور ترمذی نے مختصراً روایت کیا ہے اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

ساتویں جلد میں اتنی تفصیل اور مذکور ہے۔

رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر بنحوہ وفیہ ابو غالب وثقہ یحیی بن معین وغیرہ و	اس حدیث کو طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور معجم کبیر میں بھی اسی کے قریب قریب الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اس میں ایک راوی ابو غالب ہے [4] یحییٰ بن معین

---

[1] مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۲۶ - [2] ایضاً ج ۷ ص ۲۵۸ - [3] ایضاً ج ۶ ص ۲۳۴ -
[4] ابو غالب کے نام میں اختلاف ہے کوئی حزور کوئی سعید بن حزور اور کوئی نافع کہتا ہے۔ تہذیب التہذیب کی بارہویں جلد میں حافظ ابن حجر نے ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے بعض کتب میں ابو غالب کی بجائے ابن ابی غالب لکھا گیا ہے ہمارے نزدیک اس حدیث کے راوی ابو غالب ہی ہیں اسی طرح کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۳۲ میں زار کی بجائے حزور راء کے ا... لکھا ہے وہ بھی کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

بقیۃ رجال الاوسط ثقات — وغیرہ نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے بقیہ معجم اوسط کے
وکذ احدی اسناد الکبیر — سب راوی ثقہ ہیں اور اسی طرح معجم کبیر کی ایک
لہ — اسناد کا حال ہے۔

حضرت سعد بن وقاص کی روایت [5] | حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت مسند بزار سے نقل کر کے لکھتے ہیں۔

رواہ البزار وفیہ موسی بن عبیدۃ — مسند بزار میں اس کو روایت کیا ہے اور اس میں ایک
الربذی وھو ضعیف ؎۲ — راوی موسیٰ بن عبیدۃ ربذی ضعیف ہے۔

حضرت ابن عمر کی روایت۔ [6] | پھر اسی جلد میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے متعلق حسب ذیل ارشاد ہے۔

رواہ ابو یعلیٰ وفیہ لیث بن — اس کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اس میں ایک راوی
ابی سلیم وھو مدلس و — لیث بن ابی سلیم ہے جو مدلس ہے۔ بقیہ راوی [4]
بقیۃ رجالہ ثقات۔ ؎۳ — ثقہ ہیں۔

حضرت ابو الدرداء و واثلہ کی روایت [7] | پھر حضرت ابو الدرداء، ابو امامہ، واثلہ اور انس کی روایات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

رواہ الطبرانی وفیہ کثیر بن مروان — اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی
وھو ضعیف جداً ؎۵ — کثیر بن مروان ہے اور وہ بہت ضعیف ہے۔

حضرت عمرو بن عوف کی روایت [9] | اس کے بعد حضرت عمرو بن عوف کی روایت بحوالہ طبرانی نقل کر کے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

رواہ الطبرانی وفیہ کثیر بن عبداللہ — اس میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے ترمذی نے
وھو ضعیف وقد حسن الترمذی لہ — اس کی ایک حدیث کی تحسین بھی کی ہے بقیہ تمام راوی
حدیثاً وبقیۃ رجالہ ثقات ؎۶ — ثقہ اور قابلِ اعتبار ہیں۔

۱و۲ مجمع الزوائد ج ۷، ص ۲۵۹ - ۳ ایضاً -
۴ یہ راوی مختلف فیہ ہے باایں ہمہ اس کو ثقہ بھی کہا گیا ہے -
۵ مجمع الزوائد ج ۷ ص ۲۵۹ - ۶ ایضاً ج ۷ ص ۲۶۰ - و مستدرک ج ۱ ص ۱۲۹

بلاشبہ کثیر بن عبداللہ کے بارے میں محدثین کی رائے اچھی نہیں ہے اور اسی وجہ سے امام ترمذی کی تحسین کو بھی قابلِ اعتراض سمجھا گیا ہے مگر اہلِ علم وتجربہ جانتے ہیں کہ ضعیف رواۃ کی روایات کی اگر ترمذی تحسین کرتے ہیں تو بیشتر اسی جگہ کرتے ہیں جہاں تعامل یا خارجی دلائل سے فی نفسہ روایت کی قوت ثابت ہوجاتی ہے۔ صرف اس ضعیف طریقہ ہی پر ان کی نظر نہیں ہوتی بنابریں اگر ابوہریرہؓ کی روایت کی صحت کے بعد اس طریقہ کی بھی تحسین کردی جائے تو گنجائش ہے

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت [۱۰] | باب افتراقِ امت کے خاتمہ پر حافظ نورالدین نے حضرت ابنِ مسعودؓ کی حدیث تحریر فرماکر لکھا ہے۔

رواہ الطبرانی باسنادین و	اس حدیث کو طبرانی نے دوسندوں سے روایت کیا ہے
رجال احدھما رجال الصحیح	جس میں ایک سند کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے راوی
غیر بکیر بن معروف	ہیں سوائے بکیر بن معروف کے کہ وہ صحیح کا راوی
وثقہ احمد وغیرہ وفیہ	نہیں ہے مگر امام احمد وغیرہ نے اس کی توثیق کی
ضعف۔	ہے اور اس میں کچھ ضعف ہے۔

حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت [۱۱] | عوف بن مالکؓ کی روایت مستدرک حاکم میں موجود ہے اور اور اس کے متعلق حاکم کے الفاظ یہ ہیں۔

ھذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین[۱]	یہ حدیث بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

حاکم کی تصحیح کو عام طور پر علماء بنظر اعتبار نہیں دیکھتے مگر یہاں حافظ ذہبی نے بھی سکوت کیا ہے اور ان کے خلاف کوئی نکتہ چینی نہیں کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہبی کو بھی ان سے اتفاق ہے ورنہ وہ حسبِ عادت یہاں بھی اپنا اختلاف رائے ظاہر کرتے۔

حضرت علیؓ کی حدیث [۱۲] | علامہ شاطبیؒ نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کرکے لکھا ہے لا أضمن عھدۃ صحتہ میں اس کی صحت کی ذمہ داری نہیں لیتا[۲]۔ مگر کوئی خاص جرح بھی نہیں فرمائی۔

---

[۱] مستدرک ج ۴ ص ۴۳۰۔ [۲] الاعتصام ج ۲ ص ۲۱۱۔

حدیث معاویہؓ[۱۳] | اور ابوہریرہؓ کی حدیث نقل کر کے حاکم فرماتے ہیں۔

هذه اسانيد تقام بها الحجة في تصحيح هذا الحديث [۱] — یہ اسانید ایسی ہیں کہ ان کی بنا پر حدیث کو صحیح کہا جا سکتا ہے۔

اتنی بات کو ذہبیؒ نے بھی تسلیم کیا ہے۔

۱۵ صحابہ میں سے تیرہ صحابہ کی احادیث پر علماء کے یہ خیالات ہیں ان میں ابوہریرہؓ۔ عبداللہ بن عمرو۔ انس۔ ابوامامہ۔ عمرو بن عوف۔ معاویہ۔ ابن عمر۔ عوف بن مالک کی روایات صحیح یا حسن کے درجہ پر آسکتی ہیں بقیہ روایات کی اسانید اگرچہ ضعیف ہوں مگر تعدد طرق کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بھی قاطبۃً نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔ اب اس مجموعہ روایات کو سامنے رکھکر انصاف کیجئے کہ جو حدیث اتنے صحابہ سے مختلف صحیح اور حسن طریقوں سے مروی ہو کیا محض چند شبہات کی وجہ سے اس سے صرف نظر کر لینا درست ہوگا۔

کسی حدیث پر اجمالی حکم اس کے مجموعہ طرق پر حکم نہیں ہو | مذکورہ بالا بیان سے مختصراً یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ایک حدیث کتنے کتنے صحابہ سے روایت کی گئی ہے۔ پھر ایک ایک صحابی کی حدیث کے کتنے کتنے طرق ہیں۔ اس لئے کسی حدیث کے متعلق ضعف یا صحت کا حکم دیکھکر پہلے یہ تحقیق کر لینا چاہئے کہ یہ حکم اس کے تمام طریقوں پر حاوی ہے یا کسی خاص صحابی کی حدیث یا اس کے کسی خاص طریقہ سے متعلق ہے پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر محدث کے سامنے ہر حدیث کے جملہ طرق مستحضر ہوں۔ امام ترمذی جیسا جلیل القدر امام حدیث یہاں صرف چار صحابہ کا پتہ دیتا ہے حالانکہ ان کے علاوہ گیارہ صحابہ اور بھی ہیں جو اس کو روایت کرنے والے ہیں۔ پس اگر کوئی محدث کسی حدیث پر کوئی اجمالی حکم لگاتا ہے تو یہ صرف اس کے علمی استحضار کے لحاظ سے ہی۔ اب اگر خارجی ذرائع اور تحقیقات سے کسی خاص طریقہ کا ضعف و صحت ثابت ہو جائے تو یہ اس کے مبہم حکم کے ہرگز معارض نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے علم میں

---

[۱] مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸۔

یہ طریق نہ ہو ہاں اگر ان طرق کے علم کے بعد بھی اس کی رائے وہی رہتی ہے تو اب اس کو مخالف یا موافق کہنا درست ہو گا اس کے بعد اختلافِ رائے کا مرحلہ پھر زیر بحث رہے گا۔ راویوں اور روایات کے سلسلہ میں تضعیف و توثیق کا معاملہ اہلِ علم کے نزدیک دن رات کی بات ہے۔ ایک ناواقف ایک محدث کی رائے نقل کر کے اسے سارے طریقوں پر حاوی بنا دیتا ہے اور اس ایک رائے کو سارے محدثین کی رائے سمجھ بیٹھتا ہے اور واقفِ حال کو تحقیق کے بعد غور کرنا پڑتا ہے کہ دلائل کا پلہ کس طرف بھاری ہے۔ یہی حدیث جس کے متعلق آپ نے یہ تفصیل پڑھی۔ اب آئیے اس کے مخالف آرار کا حال دیکھئے۔ علامہ مجد الدین فیروز آبادی سفر السعادۃ کے خاتمہ پر . . . . اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں۔

لم یثبت فیہ شئ — اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی

احادیث پر تنقید کی تین تعبیرات اور ان کا فرق

ان الفاظ کو دیکھکر بعض لوگ تو یہاں تک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مصنف کے نزدیک یہ حدیث گویا موضوع ہے۔ کاش ان حضرات نے اگر اس کتاب کی ذرا ورق گردانی کی ہوتی تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ مصنف نے احادیث پر حکم لگانے کے لئے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں کہیں "باطل موضوع" اور کہیں "لم یصح فیہ حدیث" اور کہیں "لم یثبت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان تینوں الفاظ میں بڑا فرق ہے پہلی تعبیر کا مطلب یہ ہے کہ اس مضمون کو حدیثِ رسول کہنا ہی غلط ہے اور دوسرا لفظ صرف صحت کی نفی کرتا ہے خواہ کسی درجے حدیث ثابت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قنوت جہر بسم اللہ اور وضوء بالنبیذ کی احادیث پر بھی مصنف نے یہی حکم لگایا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب احادیث بے اصل ہیں۔ اسی طرح "لم یثبت" کا لفظ ضعیف طرق کی نفی نہیں کرتا۔ اگر ان تعبیرات کے فروق کی رعایت کی جائے تو پھر بہت سے مواضع پر مصنف کے کلام سے اعتراض اٹھ جائیگا۔[1]

---

[1] مولانا عبدالحی صاحبؒ نے رسالہ الرفع والتکمیل میں ان فروق کی پوری تشریح فرما دی ہے صفحہ آئندہ کے حاشیہ پر ملاحظہ ہو

علاوہ ازیں شارح سفر السعادۃ لکھتے ہیں کہ علامہ مجدالدین کا یہ حکم صرف ان الفاظ پر ہے جو یہاں انھوں نے نقل کئے ہیں یعنی ۷۲ فرقوں میں امت کا افتراق۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ لفظ تمام طریقوں کے خلاف ہے۔ حافظ سیوطی نے حضرت انسؓ کی روایت کے صرف ایک طریقہ میں یہ لفظ پیش کیا ہے بقیہ سب طرق و روایات میں ۷۳ کا لفظ ہے مگر مشکل یہ ہے۔ کہ سفر السعادۃ کے بعض نسخوں میں دو کی بجائے تین کا لفظ بھی موجود ہے اس کے متعلق شارح فرماتے ہیں "اگر ایں چنیں است محل سخن است" اگر ۷۳ کی روایت کے متعلق بھی مصنف کی یہی رائے ہے تو اس میں کلام ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کثیرا ما یقولون لا یصح اولا یثبت ہذا الحدیث ویظن منہ من لا علم لہ انہ موضوع او ضعیف وہو مبنی علی جہلہ بمصطلحاتہم وعدم وقوفہ علی مصرحاتہم۔ فقد قال علی القاری فی تذکرۃ الموضوعات لا یلزم من عدم الثبوت وجود الوضع انتہی۔ وقال الحافظ ابن حجر فی تخریج احادیث الاذکار المسمی بنتائج الافکار ثبت عن احمد بن حنبل انہ قال لا اعلم فی التسمیۃ فی الوضوء حدیثا ثابتا قلت لا یلزم من نفی العلم ثبوت العدم وعلی التنزل لا یلزم من نفی الثبوت ثبوت الضعف لاحتمال ان یراد بالثبوت الصحۃ فلا ینتفی الحسن وعلی التنزل لا یلزم من نفی الثبوت عن کل فرد نفیہ عن المجموع۔ وقال نور الدین السمہودی قلت لا یلزم من قول احمد فی حدیث التوسعۃ علی العیال یوم عاشوراء لا یصح ان یکون باطلا فقد یکون غیر صحیح وہو صالح للاحتجاج بہ اذا الحسن رتبۃ بین الصحیح والضعیف اھ۔ وقال الزرکشی فی نکتہ علی ابن الصلاح۔ بین

بسا اوقات محدثین لا یصح یا لا یثبت کا لفظ فرماتے ہیں ناواقف اس کا مطلب یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک موضوع یا ضعیف ہے یہ خیال ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ ملا علی قاری تذکرۃ الموضوعات میں فرماتے ہیں کہ عدم ثبوت کہنے سے اس کا موضوع ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نتائج الافکار میں فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے تھے کہ میرے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق کوئی حدیث ثابت نہیں میں کہتا ہوں کہ پہلے تو کسی شخص کے نہ جاننے سے اس چیز کا فی الواقع نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر نفی ثبوت سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو ہر ہر فرد کے نفی ثبوت سے مجموعہ کا ثبوت ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ نور الدین سمہوری فرماتے ہیں کہ امام احمد کے عاشوراء کی حدیث کے متعلق (لا یصح) فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ باطل ہو، ہو سکتا ہے کہ صحیح تو نہ ہو مگر قابل استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کے درمیان ایک مرتبہ حسن کا بھی ہے زرکشی نکت ابن صلاح میں فرماتے ہیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

ابن حزم بھی زیر عنوان "الکلام فیمن یکفر ومن لا یکفر" اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں۔

هذان حدیثان لا یصحان اصلا عن طریق الاسناد۔ [1]

یہ دونوں حدیثیں اسنادی لحاظ سے بالکل صحیح نہیں۔

یہاں بھی صحت کی نفی ہے اب ان دونوں حضرات کے یہ مجمل حکم دیکھئے اور اس کے مقابلہ میں وہ ساری تفصیلات سامنے رکھئے جہاں ایک ایک روایت کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔

ابن حزم کی رائے فیصلہ کن نہیں ہے ہمیں معلوم نہیں ہے کہ ان حفاظ حدیث کے سامنے وہ سب طرق موجود بھی ہیں یا نہیں اور اگر موجود بھی ہیں تو کیا اصول حدیث کا یہ کوئی ضابطہ ہے کہ جس طرف ابن حزم ہو جائیں بس راہ صواب اسی میں منحصر ہو جائے گی اگر ایک طرف حافظ ابن جوزی کا تشدد امت میں ضرب المثل ہے تو اس کے ساتھ ہی ابن حزم کی زبان کا سیف حجاج ہونا بھی مشہور ہے [2]

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) قولنا موضوع وبین قولنا لا یصح بون کثیر فان الاول اثبات الکذب والاختلاق والثانی اخبار عن عدم الثبوت ولا یلزم منہ اثبات العدم وهذا یجیٔ فی کل حدیث قال فیہ ابن الجوزی لا یصح ونحو اھ۔ وقال علی القاری ... مع ان قول السخاوی لا یصح لا ینافی الضعف والحسن اھ۔ قال الزرقانی ونقل القسطلانی عن ابن رجب ان ابن حبان صححہ فیہ رد علی قول ابن دحیہ لم یصح فی لیلۃ نصف شعبان شئ الا ان یرید نفی الصحۃ الاصطلاحیۃ فان حدیث معاذ هذا حسن لا صحیح اھ

کہ ہمارے (لا یصح) اور (موضوع) کہنے میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ موضوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا جھوٹ اور وضع ثابت ہو گیا ہے اور لا یصح میں صرف عدم ثبوت کی خبر ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس کا عدم ثابت مان لیا جائے یہی بات ان تمام حدیثوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے جن کے بارے میں ابن جوزی نے لا یصح یا اسی طرح کا کوئی اور حکم لگا دیا ہے۔ اھ۔ زرقانی کہتے ہیں کہ قسطلانی نے حافظ ابن رجب سے یہ نقل کیا ہے کہ ابن حبان نے شب نصف شعبان کی فضیلت کی حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث کے متعلق ابن دحیہ کا لم یصح کہنا غلط ہے مگر یہ کہ اس کے کلام میں اصطلاحی صحت کی نفی مراد لی جائے کیونکہ معاذ کی یہ حدیث اصطلاحی طور پر یقیناً صحیح نہیں ہے گو حسن ہو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کتاب الفصل ج ۳ ص ۱۳۸ ۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

بہرحال حدیث کا معاملہ ما و شما کے تابع نہیں ہے۔ حدیث کے اسانید اب بھی موجود ہیں۔ ان مبہم اور مجمل کلمات کو چھوڑ کر اس کے رجال پر تفصیلاً نظر کر لینا چاہئے اس کے بعد بھی اگر رجحان ابن حزم اور علامہ مجد الدین کے ساتھ رہتا ہے تو امر دیگر ہے۔[۱] پھر یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ حافظ ابنِ حزم اپنی وسعتِ نظر کے باوجود خود امام ترمذی اور ان کی کتاب الجامع سے ناواقف ہیں اس لئے ان کا لایصح کہنا اور بھی بے اثر ہو جاتا ہے۔

حدیث کی صحت پر معنوی قرائن

حنفیۃ اور یہودیۃ و نصرانیۃ کا تقابل | قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی دنیا میں دین حنیف کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ۲ اس کی وجہ حافظ ابنِ حزم نے اپنی تصنیف مداواۃ النفوس میں خود تحریر فرمائی ہے

ولقد اصابتنی علۃ شدیدۃ ولدت علی ربوا فی الطحال شدیدا فولد ذلک علی من الضجر وضیق الخلق وقلۃ الصبر والنزق امرا حاسبت نفسی فیہ فانکرت تبدل خلقی واشتد عجبی من مفارقتی لطبعی۔

میں ایک شدید بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میری تلی بہت بڑھ گئی تھی اس لئے میرے مزاج تنگی تیزی و بداخلاقی جلد بازی پیدا ہو گئی ہے جب میں اپنی پہلی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میرے عادات و اخلاق کس قدر تبدیل ہو گئے ہیں اور میں اپنی اصلی طبیعت سے کتنا دور ہو گیا ہوں۔

(توجیہ النظر ص ۱۳ تحت استدراک فی الفائدۃ السابعہ)

(حاشیہ صفحۂ ھذا) [۱] حافظ ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ ابنِ حزم اپنی جلالتِ قدر کے باوجود امام ترمذی جیسے شخص سے بالکل ناآشنا ہیں حتی کہ جب ان کے سامنے امام ترمذیؒ کا تذکرہ ہوا تو تعجب سے فرمایا " و من محمد بن عیسی بن سورۃ ؟ یہ محمد بن عیسیٰ کون شخص ہیں (دیکھو الباعث الحثیث الی معرفت علوم الحدیث)۔

حافظ ابنِ حجر امام ترمذی کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ واما ابو محمد بن حزم فانہ نادی علی نفسہ بعدم الاطلاع فقال فی کتاب الفرائض من الایصال محمد بن عیسی بن سورۃ مجھول۔ ابن حزم کو اس بات کا خود اقرار ہے کہ وہ محمد بن عیسیٰ (ترمذی) سے واقف نہیں ہیں چنانچہ ان کو مجہول لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔ ترمذی کے بارے میں ابنِ حزم کا قول کہ وہ مجہول شخص ہیں کچھ قابلِ التفات نہیں ہے کیونکہ ان کو نہ امام ترمذی کی کتاب جامع سے واقفیت ہے اور نہ ان کی کتاب العلل کا علم ہے (میزان الاعتدال)

حریف صرف دو مذہب ہیں یہودیۃ اور نصرانیۃ عہدِ نبوۃ میں بھی حریفانہ جنگ ان ہی دو کے درمیان نظر آتی ہے اور احادیث صحیح بھی ان ہی دو کے درمیان مستقبل میں کشمکش کا پتہ دیتی ہیں آیاتِ ذیل کو بغور پڑھئے اور اس جذبہ کا اندازہ کر لیجئے۔

قَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ	کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا نصرانی بن جا تو راہ پا
تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ	ہو گے آپ ان سے کہدیجئے بلکہ میں حضرت ابراہیمؑ
حَنِيفًا۔	کی ملت کا تبع ہوں جو ایک طرف ہو جانیوالا تھا۔
مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا	حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ
وَلَٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا۔	ایک طرف ہو کر خدا کے فرمانبردار تھے۔

غیر المغضوب علیہم میں اتباع یہود و نصاریٰ کی طرف ایک لطیف اشارہ

غالباً اسی لئے قرآن کریم نے صراطِ مستقیم کی تفسیر کرتے ہوئے اثباتی پہلو میں منعم علیہم کا اور سلبی پہلو میں مغضوب علیہم اور ضالین ہی کا ذکر کیا ہے اور اس اہتمام سے کیا ہے گویا جب تک یہ سلبی پہلو ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک صرف صراط الذین انعمت علیھم اس کے پورے مفہوم کو ادا ہی نہیں کرتا پھر یہود و نصاریٰ کے راستے سے پنجوقتہ علیحدگی کی دعا، تعلیم کرنے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملتِ حنیفہ کے متعلق شاید سب سے زیادہ خطرہ اگر ہے تو ان مغضوب علیہم اور ضالین کی اتباع کا ہے جس کا دوسرا نام یہودیۃ و نصرانیۃ ہے۔

مشرکین اور یہود کے تعلقات

کتب سیرت کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیۃ و نصرانیۃ بھی گو آسمانی دین تھے مگر مشرکین کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات قائم تھے جونہی اسلام نے دنیا میں قدم رکھا سب سے پہلے مشرکین کے ساتھ اس کے مدمقابل ہی یہودی و نصرانی تھے حالانکہ دینِ سماوی میں اشتراک کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو دینِ حنیفی کے ساتھ پوری ہمدردی ہوتی اور بجائے مشرکین کے ان کا رُخ اسلام کی طرف ہو جاتا لیکن جیسے جیسے اسلام ترقی کرتا رہا اسی قدر یہودیۃ و نصرانیۃ بڑھ بڑھ کر اسی کے مقابلہ پر آتی رہی یہاں تک کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو مشرکین

عرب نے اسلام کے سامنے سپر ڈالدی، شریعت مطہرہ کو اتنا اطمینان میسر ہوا کہ صاف لفظوں میں اعلان کردیا گیا۔

ان الشیطان قد أیس ان یعبدہ المصلون فی جزیرۃ العرب۔	شیطان اب اس بات سے ناامید ہوچکا ہے کہ نمازی مسلمان پھر کبھی جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں گے۔

پیغمبر اسلام کا یہود و نصاریٰ کی طرف سے خطرہ کا آخری الارم

لیکن اس کے بالمقابل یہودیۃ و نصرانیۃ کا علم جنگ برابر لہراتا رہا اور کسی وقت بھی اسلام کو ان کی وسیسہ کاریوں سے اطمینان میسر نہ ہوا حتی کہ صاحب شریعت کے آخریں لمحات حیات کی وصیتوں میں ایک اہتم بالشان وصیت یہ تھی

اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب	یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب کے چپے چپے سے باہر نکالدینا۔

اسی حریفانہ کشمکش کا نتیجہ تھا کہ جب حنفیۃ کا زمین پر اقتدار ہوا تو یہودیۃ و نصرانیۃ دونوں مغلوب ہوگئے اور جب کبھی یہودیۃ و نصرانیۃ کا غلبہ ہوا تو وہ حنفیۃ کو کبھی گوارا نہ کرسکے۔

یہود و نصاریٰ سے جزیہ قبول کرنے کی وجہ

اس سلسلہ میں یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہودیۃ و نصرانیۃ کے مسخ ہوجانے کے باوجود اسلام نے محض دین سماوی ہونے کے باعث ان کی بڑی رعایت کی ہے۔

موافقت اہل کتاب کی عام سنت فتح مکہ تک تھی

چنانچہ اسلام فتح مکہ سے قبل تک جن امور میں جدید ہدایات نازل نہ ہوئیں بہ نسبت کفار کے ان کی موافقت کو ترجیح دیتا رہا لیکن جب اس سلوک کے بعد بھی ان کا دل نہ پسیجا تو یہ ثابت ہوگیا کہ اب ان کے سینہ پر کینہ سے اسلام کی عداوت نکلنے والی نہیں ہے اس لئے مخالفت کا حکم دیدیا گیا اور آئندہ ان تمام مواقع پر جہاں جہاں سے حنفیۃ کو یہودیۃ و نصرانیۃ سے خطرہ ہوسکتا تھا امت کو خبردار کردیا گیا۔

مشترکہ حدود کی نگرانی میں اسلام کی خیر مضمر ہے

روزہ، نماز، شکل و شباہت، دعا و سلام میں غرض جہاں بھی اسلامی حدود ان سے ملتے نظر آتے تھے۔ ملت حنفیہ کے حلقہ بگوشوں کو تنبیہ

کردی گئی کہ اپنے حدود کی نگرانی رکھیں اور ان سے ملنے نہ دیں۔ اس کے باوجود صاحبِ نبوۃ کی دور بین نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ اس حریف کا ایک دن پھر غلبہ ہوگا اور پیروانِ ملتِ حنیفی اس کے پیچھے پیچھے چلتے نظر آئیں گے۔ اسی عہدِ نامسعود کا نقشہ صحیح بخاری کی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے۔

اس امت میں یہود و نصاریٰ کی اتباع کی پیشگوئی

قال لتتبعن سنن الذین من قبلکم شبراً بشبر وذراعاً بذراع حتی لو دخلوا فی جحر ضب لاتبعتموہ قلنا یا رسول اللہ الیھود والنصاریٰ قال فمن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ضرور گذشتہ لوگوں کے قدم بقدم چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر ان میں کوئی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوا ہوگا تو تم بھی داخل ہو گے ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ گیا لوگوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں آپ نے فرمایا کہ اور کون۔

دوسرے الفاظ میں اس مجنونانہ اتباع کی غایت یہانتک بیان کی گئی ہے کہ اگر کسی نے ان میں اپنی ماں سے علانیہ زنا کیا ہوگا تو تم میں بھی ایسے افراد ہوں گے جو یہ روسیاہی کرکے رہیں گے۔

بعض نومسلموں کی مشرکین کی نقالی کی تمنا اور آپ کی سرزنش

چنانچہ اس ہولناک مستقبل کا خفیف سا عکس اسلام کے ابتدائی عہد میں بھی نظر آگیا ہے۔

"ابوواقد لیثی فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ خیبر کی سمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئے اس وقت ہم نومسلم تھے وہاں مشرکین نے ایک درخت اپنے ہتھیار لٹکانے کے لئے مقرر کر رکھا تھا ہم نے اسے دیکھکر کہا یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی درخت ہتھیار لٹکانے کے لئے مقرر کر دیجئے آپ نے تعجباً تکبیر کہی اور فرمایا یہ تو وہی بات ہوئی جیسا بنی اسرائیل نے (سمندر عبور کرنے کے بعد کچھ بت پرستوں کو پوجا کرتے دیکھکر کہدیا تھا) اے موسیٰ جیسا خدا ان کا ہے ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی خدا بنا دیجئے۔ تم ضرور یہود و نصاریٰ کی نقالی کرکے رہو گے۔"

یہ لوگ نومسلم تھے مگر نگاہِ نبوت نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ یہود و نصاریٰ کی نقالی کے جذبات ان میں ایسے سرایت کئے ہوئے ہیں کہ اگر زمانۂ شباب میں اپنا اثر نہ دکھائیں تو نہ دکھائیں لیکن ضعف کے حال میں اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔ یہ تو آپ نے اہلِ اسلام کے عہدِ طفولیت کے جذبات دیکھے آیئے اب عہدِ شباب کے جذبات ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مقداد بن الاسود جنگِ بدر کی تیاری کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں کہتے ہیں یا رسول اللہ ہم وہ نہیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ کہدیں ۔ اے موسیٰ جا تو اور تیرا رب لڑ آ۔ ہم تو آپ کے دائیں بائیں آگے اور پیچھے رہ کر آپ کے ساتھ جنگ کریں گے۔ (بخاری شریف)

ان دونوں جذبات کا موازنہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی بات یعنی حرصِ اتباع جو پہلے غیر اختیاری طور پر منہ سے نکل رہی تھی اب انتہائی قابلِ نفرت و عار بن گئی ہے مگر نقطۂ اتحاد دونوں جگہ وہی بنی اسرائیل ہیں۔ عہد طفولیت اور شیخوخت کا دور چونکہ بلحاظ جذبات و خواہشات تقریباً یکساں ہو جاتا ہے اس لئے اسلامی دورِ انحطاط میں پھر وہی اتباعِ بنی اسرائیل کا جذبہ لوٹ آئیگا اور زمانۂ شباب میں بنی اسرائیل کی جو مشابہت انتہائی قابلِ نفرت و حقارت معلوم ہوتی تھی پھر لائقِ رغبت بن جائے گی۔ امت محمدیہ کے اسی رجعتِ قہقریٰ کو صحیح بخاری کی حدیث بالا میں بیان کیا گیا ہے یعنی وہی بات جو آپ کے زمانہ میں قابلِ تعجب تھی آئندہ دور میں ناگزیر طور پر ہونے والی بات ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر یہود و نصاریٰ میں کسی نے ماں سے زنا کیا ہوگا تو اس بے حیائی میں بھی یہ امت ان کی اتباع کرکے رہے گی۔

امتِ محمدیہ شغفِ اتباع ہی کی بدولت صفتِ افتراق میں بھی اتباع کریگی

اس شغفِ اتباع سے یہ مترشح ہو رہا ہے کہ یہ امت جب ہر معقول اور نامعقول بات میں ان کے نقشِ قدم پر چلے گی تو یقیناً ضلالت اور گمراہی کی وہ سب راہیں جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کی تھیں یہ بھی اختیار کرے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جتنے فرقِ ضالّہ ان میں نمودار ہوئے تھے اس میں بھی نمودار ہوں گے اور افسوس یہ ہے

کہ بلند تر جب گرتا ہے تو یہاں بھی فروتر رہتا ہے اسی لئے امتِ محمدیہ جب دورِ عروج و کمال میں بلند تر تھی تو اسے اپنے دورِ انحطاط میں بھی فروتر رہنا چاہئے اور اسی لئے وصفِ افتراق میں یہود و نصاریٰ سے آگے نظر آئے گی۔ آخر جو مسندِ اعلیٰ علیین پر جلوہ نما تھا جب ایمان اور عملِ صالح سے محروم ہوا تو اس کا ٹھکانا قعرِ اسفل السافلین ہی نظر آیا۔

شدتِ اتباع اور حدیثِ افتراق کا تناسب

غالباً اسی عمیق تناسب کی وجہ سے صحیح بخاری کی اس حدیث کو جامع ترمذی میں حدیثِ افتراق کے لئے بطور مقدمہ اداء کیا گیا ہے یا یوں سمجھئے کہ اس شدید افتراق کو اس مبالغہ آمیز اتباع کا ثمرہ اور نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو باتیں بنی اسرائیل میں ہوئیں وہ ٹھیک ٹھیک سب میری امت میں ہوں گی حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی نے بے محابا اپنی ماں سے زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی کوئی ایسا بدبخت ہوگا جو اس بیحیائی کا ارتکاب کرے گا، اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹے تھے۔ (آخر حدیث تک)

اس سیاق کو پڑھئے اور بغور پڑھئے اور اس عمیق ربط کی تہ تک پہنچ جائیے جو اس شدید اتباع اور شدید اختلاف کے مابین مستور ہے اگر آپ اس ربط کو پالیں تو یقیناً آپ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ حدیثِ افتراق درحقیقت صحیح بخاری کی حدیثِ اتباع کا ایک تتمہ تھا جو وہاں رہ گیا ہے اور یہاں مذکور ہے۔ بہرحال اگر ہمارے پاس صرف صحیح بخاری ہی کی یہی ایک حدیث ہوتی تو افتراقِ امت کی اجمالی داستان پڑھنے کے لئے وہی کافی تھی۔ آئندہ اوراق میں اس پر آیاتِ قرآنیہ کے کچھ اشارات بھی آپ کے ملاحظہ سے گذریں گے لیکن اس سے قبل ہم مفہومِ اختلاف کو ذرا واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

لفظِ اختلاف کی توضیح

ہر یکساں حالت کے بعد جب اس کے خلاف کوئی دوسری حالت رونما ہوتی ہے تو اس کا نام ہم اختلاف رکھتے ہیں اس لحاظ سے اگر اس عالم پر عرش سے لیکر فرش تک نظر ڈالیں تو سارا عالم

اسی اختلاف کی آماجگاہ نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس عالم کی کوئی زیادہ سے زیادہ صحیح تعریف ہو سکتی ہے تو بس یہی ایک لفظ اختلاف ہے۔

اختلاف زبان | لیل ونہار، شہور وسنین، پھر اس میں فصول ومواسم کا ایک اختلاف ہے جسے اختلافِ زبان کہنا مناسب ہے اس اختلاف کو آیۂ ذیل میں ذکر کیا گیا ہے۔

وله اختلاف الليل والنهار — شب وروز کا یہ اختلاف اللہ تعالیٰ ہی کا تصرف ہے

اختلاف السنہ والوان | اس سے آگے بڑھئے تو حیوانات ونباتات وجمادات کا اختلاف پھر ان میں اجناس اور اجناس میں انواع اور انواع میں اصناف اور اصناف میں افراد کا اختلاف ہے پھر ان افراد میں طبیعتوں، مزاجوں، رنگوں اور زبانوں کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اختلاف السنتكم والوانكم — تمہاری زبان اور رنگوں کا اختلاف

آفاق وانفس کا یہ اختلاف دیکھکر صاف طور پر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ افتراق واختلاف اس جہان کی فطرۃ ہے اور اسی پر اس کی آبادی کا مدار ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن — اے ذوق اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے

اختلاف ضلالت وہدایت | لیکن اس وقت یہ اختلافات زیر بحث نہیں ہیں بلکہ اس سے بالاتر ضلالت و ہدایت کا ایک اختلاف ہے وہی ہمارا مرکز بحث ہے۔ اس لحاظ سے اگر مجموعۂ عالم پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ امم سابقہ ایک طرف ہیں اور امتِ محمدیہ دوسری طرف اسی کو حسب ذیل آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ — تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری سنانے والے اور
وَمُنْذِرِيْنَ .... ڈرانیوالے پیغمبر بھیجے۔
فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا — تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے مومنین کو ان باتوں میں
فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ۔ — ہدایت نصیب فرمادی جس میں کہ پیشتر امتوں نے ناحق اختلاف کیا تھا

امتحانی سوالات میں امتِ محمد کی کامیابی کے مقامات | مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت میں اختلاف ہوا کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی، خدائے قدوس نے امتِ محمدیہ کو ہدایت نصیب فرمائی کہ یہ دونوں خیال غلط ہیں وہ دراصل حنیف تھے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اختلاف ہوا، یہود نے ان کا انکار کیا اور نصاریٰ نے خدا ٹھیرایا، یہاں امتِ محمدیہ کو ہدایت نصیب ہوئی اور جادۂ مستقیم ان ہی کے لئے مقدر ہوا۔

قبلہ کے بارے میں بھی ایک رائے یہی ہے کہ وہ امتوں کے انتخاب پر رکھا گیا تھا مگر انھوں نے یہاں بھی صحیح انتخاب نہ کیا اور جو اصل قبلہ تھا اس کی ہدایت اسی امت کو نصیب ہوئی۔

جمعہ کا دن بھی اسی اختلاف کی ایک کڑی ہے پہلی امتوں نے یوم التعطیل میں غلطی کی کسی نے یوم السبت اور کسی نے یوم الاحد مقرر کیا، امتِ محمدیہ کو یہاں بھی راہِ ہدایت نصیب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ اسی اختلاف کی طرف آیتہ ذیل میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاس	اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی
امّۃ واحدۃ ولا یزالون مختلفین	راستہ پر ڈال دیتا لیکن وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے
الّا من رحم ربك ولذلك	بجز ان کے جن پر آپ کا پروردگار رحم فرمائے اور
خلقهم۔ (هود)	اسی اختلاف کے لئے انھیں پیدا کیا ہے۔

اختلافِ امم | عطار اور مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہاں مختلفین سے یہودیۃ ونصرانیۃ مجوسیۃ وحنفیۃ کا اختلاف مراد ہے اور الا من رحم ربک سے مراد حنفاء ہیں۔ شاید اس لئے بھی اس امت کو امت مرحومہ کا خطاب دیا گیا ہو۔

اختلاف امتِ محمدیہ | لیکن اس اختلاف کے علاوہ ایک اور اختلاف ہے جو خود اس امتِ محمدیہ میں مقدر ہے وہ جماعت اہلِ حق اور باطل فرقوں کا اختلاف ہے اس بنا پر فرقِ باطلہ مختلفین کا مصداق رہیں گے اور اہلِ حق الا من رحم ربک کا۔

اختلاف اہلِ حق | اس سے بھی آگے خود جماعت اہلِ حق کا اختلاف ہے جس پر ہم آئندہ بحث کریں گے

اختلاف کا تکوینی راز | پہلے آیت کی مراد سنئے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نقاشِ عالم کو اپنے ہی صفتِ جلال وجمال کی جلوہ نمائی منظور تھی اس لئے اس نے انسانوں کو ایسے ہی قوی فکریہ وعملیہ سے مرکب فرمایا ہے کہ وہ ہمیشہ اسبابِ سعادت وشقاوت میں اختلاف کرتے ہی نظر آئیں گے اور اسی باہمی کشمکش میں خدائی قہر و مہر کا سامان مہیا ہوتا رہے گا۔ اگر اس دنیا میں یہ اختلاف رونما نہ ہوتا تو یہ محشرستان، عالمِ خموشاں بن جاتا اور یہاں کے بسنے والے یا صرف خدائی مہر کے مظہر ہوتے یا صرف قہر کے لیکن عالمِ تقدیر کو ایک ناتمام کمال کا مظاہرہ ناپسند تھا اس لئے اس نے اختلاف اس کی بنیاد میں ڈالدیا اور اب ضروری ہوگیا کہ دنیا جس قدر پھیلتی جائے اختلاف کا دامن بھی اسی قدر وسیع ہوتا چلا جائے حتیٰ کہ یہود اگر ا۷ فرقوں میں بٹے ہوں تو نصاریٰ ۷۲ فرقوں میں بٹیں اور امتِ محمدیہ جو آخری اور سب سے بڑی امت ہے، وہ تہتر فرقوں میں منقسم ہوجائے۔

سورۂ ہود کی اس آیت میں مختلفین کو "الامن رحم ربک" کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ تکوین نے تکوینی طور پر تمام انسانوں کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے (۱) اہلِ اختلاف (۲) مرحومین

اختلاف کرنا رحمت سے محرومی کی علامت ہے | اس تقابل سے مفہوم ہوتا ہے کہ جو اہلِ اختلاف ہیں وہ رحمت کے تحت نہیں ہیں اور جو رحمت کے نیچے آچکے ہیں وہ قرآن کی نظر میں اہلِ اختلاف کی فہرست میں داخل نہیں اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ نجات صرف اس جماعت کے لئے ہے جو "الامن رحم ربک" کی مصداق ہے اور بقیہ اہلِ اختلاف کے لئے نجات نہیں۔ سورۂ انعام میں اس اختلاف کی مزید تشریح ملتی ہے۔

وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ	میرا سیدھا راستہ یہ ہے اسی پر چلو اور دوسرے
ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم	راستوں پر مت چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ
عن سبیلہ۔ (انعام)	سے جدا کرکے تتر بتر کردیں گے

راہِ حق ایک ہے اور ناحق بہت | آیتِ بالا میں صراطِ مستقیم کے لئے لفظ مفرد اور بقیہ اہلِ اختلاف کے لئے "السبل" لفظِ جمع اختیار کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راہِ مستقیم ایک ہی ہے

اور ضلالت و گمراہی کے راستے بہت ہیں۔

صراطِ مستقیم اور سبلِ متفرقہ کا نقشہ

مسند احمد اور نسائی وغیرہ میں ہے کہ اس معنوی افتراق و تشتت کو محسوس طور پر سمجھانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کے دائیں بائیں اور بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا دیکھو یہ سیدھا خط تو صراطِ مستقیم ہے اور اس کے دائیں بائیں جو خطوط ہیں وہ سُبل اور ناپسندیدہ راہیں ہیں جن کی طرف شیاطین دعوت دیتے ہیں اس کے بعد آیتِ مذکورہ تلاوت فرمائی۔

قرآنِ کریم میں حدیث افتراق کی طرف اشارہ ہے

اب اگر سورۂ ہود اور سورۂ انعام کی ان ہر دو آیات کے نتائج کو ملاؤ تو حدیثِ افتراقِ امت کا پورا پورا مفہوم سامنے آجاتا ہے صرف فِرَقِ باطلہ کی تحدید اور عدم تحدید کا فرق باقی رہتا ہے اور اگر دونوں آیتوں کے نتائج کا تجزیہ کرو تو حسب ذیل ہوگا۔

آیتِ انعام۔ (۱) صراطِ مستقیم صرف ایک ہے (۲) سبلِ متفرقہ بہت ہیں۔

سورۂ ہود۔ (۳) نجات صرف ایک جماعت کے لئے ہے (۴) اہلِ اختلاف کیلئے نجات نہیں۔

یہی چاروں امور حدیثِ افتراق کا مفہوم ہیں اور بس۔ ضلالت و ہدایت کے اس اختلاف کو سورۂ بقرہ میں بھی حسب ذیل پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

كان الناس امة واحدة	سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر انھوں نے
فبعث الله النبيين مبشرين	دین میں اختلاف ڈالا) تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری
ومنذرين وانزل معهم الكتاب	سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور ان کے
بالحق ليحكم بين الناس فيما	ساتھ سچی کتاب اتاری تاکہ جن باتوں میں انھوں نے
اختلفوا فيه۔	اختلاف ڈالا تھا فیصلہ کرے۔

رسول دنیا میں ناروا اختلافات کو مٹانے کے لئے آتے ہیں

یعنی خدائے قدوس نے تو رسولوں کو اس لئے بھیجا تھا کہ ناروا اختلاف ختم کر دیا جاتا اور یک جہتی کے ساتھ اس قانون پر عمل کیا جاتا جو

• الکتاب" کے نام سے اتارا گیا تھا مگر افسوس کہ ناعاقبت اندیشوں نے اس سامانِ اتحاد کو بھی سامانِ اختلاف بنالیا اور اس طرح بعثتِ انبیاء اور تنزیلِ صحف کا جو اصل منشاء تھا اسی کو برباد کرڈالا۔ اس کے مخفی راز کو سورۂ ہود کی آیت" ولذلك خلقهم" میں سمجھایا گیا تھا جس کی طرف ہم مضمون کے شروع میں اشارہ کرچکے ہیں۔

قرآن کریم میں لفظِ اختلاف کی توضیح اب اس اختلاف کی حقیقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے آیاتِ ذیل پر غور کیجئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (انعام)	جنھوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور بہت سی پارٹیاں بن گئے آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں،
مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ۔ (الروم)	اور ان لوگوں میں سے مت بنو جنھوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالدی اور پارٹیاں بن گئے ہر پارٹی اپنے اپنے خیال میں مست ہے۔
اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (انعام)	خدائے تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اگر چاہے تو تمہاری پارٹیاں بنادے اور تم کو آپس میں بھڑا دے۔

عذابِ افتراق عذابِ استیصال کا بدل ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی تھی کہ آپ کی امت پہلی امتوں کی طرح ہلاک نہ ہو، وہ دعا مستجاب ہوئی اور "عذابِ استیصال" ہمیشہ کے لئے اٹھالیا گیا مگر آپس کے افتراق وتشتت کا مقدر عذاب پھر بھی باقی رہا۔ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ پارٹیوں سے اہلِ اہواء کا اختلاف مراد ہے اور آپس میں بھڑانے کا مصداق یہ ہے کہ ایک دوسرے کو کافر کہکر جنگ شروع کردے جیسا کہ خوارج نے حضرت علیؓ کے ساتھ کیا تھا۔ (الاعتصام ۳۹/۱)

افتراقِ مذموم کی حدود ان ہر سہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں جو افتراق مذموم ہے وہ یہ ہے کہ ملت کی ہیئت اجتماعیہ پارہ پارہ ہوجائے، محبت ومودت، تعاون وتناصر، ہمدردی وسازگاری کے سارے رشتے ٹوٹ جائیں اور جماعتی شیرازہ اوراقِ پریشاں کی طرح منتشر ہوجائے۔

دین میں پارٹی بندی برداشت نہیں | یہ اختلاف، یہ پارٹی بندی دین میں ایک لمحہ کے لئے قابلِ برداشت نہیں اسی لئے فرمایا "لست منھم فی شئ" ایسی مفسد جماعت سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا گویا یہ مکمل بائیکاٹ کا اعلان ہے۔

اب سوال صرف یہ رہتا ہے کہ وہ کونسا اختلاف ہے جو کم کی طرح پھٹ کر ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ دورِ صحابہ میں بھی مذہبی اختلافات نظر آتے ہیں اور خلافتِ راشدہ ہی کے زمانہ میں فرقہ بندیوں کے نشانات کا پتہ چلتا ہے پھر کیا یہ مقدس قرن بھی اس اختلاف کا مصداق ٹھیرایا جا سکتا ہے اس شبہ کا جواب ہمیں خود قرآن کریم سے ہی دینا ہے لیکن بطور مقدمہ پہلے یہ سن لیجئے کہ اختلاف ائتلاف کی ضد ہے جس کے معنی باہمی الفت ومحبت کے ہیں اگر ائتلاف کے ساتھ اختلاف ہے تو درحقیقت یہ اختلاف ہی نہیں۔

اختلافِ دین وملت | حقیقی اختلاف دلوں کا اختلاف ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) دین وملت کا اختلاف ظاہر ہے کہ قدرت نے بنی نوعِ انسان کے لئے ایک ہی دین اتارا تھا نوعِ انسانی پر واجب تھا کہ وہ یک جہتی کے ساتھ یک زبان ہو کر مضبوطی سے اس کو اختیار کرتی لیکن وہ باز نہ آئی اور طرح طرح کی بہانہ بازیوں اور حیلہ سازیوں سے اس کے قبول کرنے میں پس و پیش شروع کیا۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہمیشہ وحدت کی دعوت پر پارٹیاں اور اجتماع کی آواز پر افتراق وتشتت پیدا ہوتا رہا۔ ان پارٹیوں میں ہمیشہ آتشِ بغض وعناد بھڑکتی رہی حتیٰ کہ ایک ملک ایک شہر، ایک خطہ، ایک قبیلہ وخاندان کے ہو کر ایسے جدا ہوئے کہ کسی وصف میں گویا ایک دوسرے کے شریک ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ معاشرت وتمدن کا کوئی گوشہ نہ رہا جس میں یکجہتی کی کوئی جھلک نظر آئی۔ شکل وشباہت بدلی، نشست وبرخاست کے طریقے بدلے، طعام ولباس کے طریقے جدا جدا ہو گئے۔ جب ایک جماعت دوسرے کے ساتھ یہ اختلاف پیدا کر لیتی ہے تو اصطلاح میں ایسی دو مختلف پارٹیوں میں ایک کو مسلم اور دوسرے کو کافر کا لقب دیا جاتا ہے اور اب یہ اختلاف فطرۃِ انسانی کے لئے ایسا تباہ کن اختلاف ہو جاتا ہے

کہ اگر قدرت اپنے غیبی ہاتھ سے اس بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا نہ کرتی رہے تو عالم فنا ہو جائے عجیب بات ہے کہ اس عالمِ اختلاف کی بقار کا سبب بھی یہی اختلاف ہے اور اس کے فنا کا سبب بھی یہی، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے　　اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اس کا نام اختلافِ ملت اور اختلافِ دین ہے۔

ایک ملت میں اصول و کلیات کا اختلاف

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ایک ملت ایک دین سے وابستہ ہو پھر اس میں اندرونی اختلاف پیدا ہو جائے اب اگر یہ اختلاف صرف جزئیات کی حد تک ہے تب بھی یہ کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں نہ اس اختلاف سے قلوب میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تنافر پیدا ہوتا ہے نہ الفت و محبت کے رشتوں پر اثر پڑتا ہے۔ ہاں اگر یہ جزئی اختلافات بھی اس کثرت سے پیدا ہو جائیں کہ اصول و کلیات کی جگہ لے لیں تو ظاہر ہے اس کا حکم دوسرا ہوگا۔

اختلافِ اصول موجبِ افتراق ہے

اور اگر دین میں اشتراک کے بعد اس کے بعض اصول و کلیات میں اختلاف ہو جائے تو یہ اختلاف البتہ اختلاف ملت و دین کی طرح افتراقِ قلوب کا موجب بن جاتا ہے۔ دیکھو معتزلہ، خوارج، مرجیہ، اہل سنت، سب ایک ہی ملت اور ایک ہی دین سے وابستہ ہیں مگر بعض اصول و کلیات میں اختلاف کی وجہ سے اس طرح گروہ اندر گروہ ہو گئے ہیں کہ جو عداوت و بغض اختلافِ ملت کا ثمرہ تھا وہی ان اختلافات کا نتیجہ بن گیا ہے

فروعی اختلاف اختلاف نہیں

اب ہم قرآن سے ہی یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس کی نظر میں اصول و کلیات کے اتحاد کے بعد فروع کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں۔

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ　　اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین میں ان ہی
نوحا والذی اوحینا الیک　　باتوں کی راہ ڈالی ہے جن کا حضرت نوحؑ کو حکم
وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ　　دیا تھا اور جو حکم کہ ہم نے آپ پر بھیجا اور حضرت

وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا
تتفرقوا فیہ۔ (الشوریٰ) یعنی یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف ڈالو۔

ادیانِ سماویہ میں اختلاف نہیں

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک شریعتوں اور منہاج کا کھلا ہوا اختلاف رہا۔ مگر پھر بھی قرآن کریم نے اس کو ایک ہی دین قرار دیا ہے اور شرائع کے باہمی فروعی اختلاف کو وحدت دین کے منافی نہیں سمجھا، اگر فروعی اختلاف بھی افتراق واختلاف کی حد میں آسکتے تو اس افتراق کے ہوتے ہوئے پھر "ولا تتفرقوا فیہ" (دین میں افتراق مت پھیلاؤ) کا خطاب کیونکر درست ہوتا۔ پس جس طرح شرائع سماویہ اور صحفِ انبیاء علیہم السلام فروعی اختلافات کے باوجود ایک ہی دین کہلائے ایک کا مصدق دوسرے کا مصدق رہا، ان کے ماننے والے سب ایک ہی رشتۂ اتحاد واخوۃ میں منسلک رہے۔ تحزب وتعصب اور بغض وعناد کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی اور اسی لئے وہ "کانوا شیعا" کی حد میں نہیں آئے۔ اسی طرح ایک دین حنیف کے اندر فروعی اختلافات اس کی شانِ اجتماع ووحدت میں خلل انداز نہیں ہوتے۔

اجتہاد بھی دین کا ایک اصول ہے

اجتہاد کے موقع میں اجتہاد کرنا بھی دین کی ایک سمجھائی ہوئی بات ہے اور اسی کا قائم کردہ اصول ہے اُسے دین میں اختلاف کیونکر کہا جا سکتا ہے اختلاف یہ ہے کہ اس کے کسی مقرر کردہ اصول یا کسی تصریح کردہ جزئی کا خلاف کیا جائے لیکن جہاں اس نے سکوت کیا ہے اور یہ سکوت قصداً کیا گیا ہے وہاں ہر مجتہد کو اس کی اجازت دیدی ہے کہ وہ پوری جدوجہد اور ملکۂ استنباط واجتہاد کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ مآخذ دین سے اس کا حکم معلوم کرے۔

صحابہ کرام کا اختلاف

اب آیئے صحابہؓ[1] کے اختلافات کو دیکھیں۔ حدوث وقدم صفات کی عین وغیر، اور جبر وقدر کے باریک ودقیق مسائل میں قدم رکھنا تو اُن کا اصول ہی نہ تھا اس لئے

---

[1] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۰۔

ان چیزوں میں اختلاف کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا وہاں اگر سوال تھا تو صرف امتثال و اطاعت، فرمانبرداری اور وفاشعاری کے طریقوں میں تھا اس بنا پر اگر اختلاف تھا تو یہی کہ فلاں چیز سے وضوء ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ تیمم وضوء کا قائم مقام کب ہو سکتا ہے۔ کوئی آمین زور سے کہنا پسند کرتا تھا کوئی آہستہ سے۔ کوئی رکوع کو جاتے اور آتے ہاتھ اٹھا لیتا تھا کوئی نہ اٹھاتا تھا۔ پھر یہ اختلافی رنگ بھی اس قدر پھیکا تھا کہ ان اختلاف کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہی مسجد میں نمازیں ادا کر لیتے بلکہ خوشی خوشی ایک دوسرے کے پیچھے اقتدا بھی کر لیا کرتے تھے خصومت و جدل تو درکنار موافقت و مخالفت کے تصور سے بھی ان کے دماغ خالی تھے اسی لئے اخوۃ اسلامی، نصح و خیر خواہی، محبت و مودت کی اتنی سچی مثال تاریخ کبھی کسی دوسری جماعت میں نہیں دکھلا سکتی۔ اندریں حالات ان فروعی اختلافات کو ان کے یہاں کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا سکتی۔ ہاں خلافت کے دورِ ثالث و رابع میں جو کچھ ہنگامہ آرائیاں ہوئیں ان میں تعصب و تحزب کا وجود ناقابل انکار حقیقت ہے مگر الفاظِ قرآنی پر غور کیا جائے تو اس کا جواب بھی ان ہی آیات میں موجود ہے۔ سورۂ انعام اور سورۂ روم کی مذکورہ بالا آیات کو ایک بار پھر پڑھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن یہاں جس فرقہ بندی کی ممانعت کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دین میں اختلاف برپا کر کے اس کو مختلف دینوں کی طرح بنا دیا جائے یہ اختلاف اس کے اصول و کلیات میں اختلاف ہی کے بعد ہو سکتا ہے آیتِ ذیل کو بغور ملاحظہ کیجئے

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ	جنھوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور
وَکَانُوْا شِیَعًا۔	بہت سی پارٹیاں بن گئے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ان پارٹیوں کا ذکر ہے جن کی پارٹی بندی کی بنیاد عقائد و اعمال کا اختلاف ہو، اسی اختلاف کو اختلاف فی الدین کہا جا سکتا ہے۔

صحابہ کا اختلاف آپس کا اختلاف تھا نہ کہ دین کا

اب اس معیار کے مطابق ان پارٹیوں کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عقائد و اعمال کا ان کے درمیان کوئی ذکر ہی نہ تھا وہ ایک ہی عقیدے یکساں عمل اور ایک ہی دین کے حامل تھے اور اسی ایک متفقہ دین کی خاطر ہی ایک دوسرے سے

برسرِ پیکار تھے ان میں اگر اختلاف تھا تو یہ تھا کہ اس متفقہ دین کا اس وقت علمبردار کون ہے پس جس فرقہ بندی کی ممانعت آیات مذکورہ بالا میں کی گئی ہے ان حضرات کا اختلاف اس سے بہت دور تھا۔

یہاں ان شکوک وشبہات کی جوابدہی مقصود نہیں ہے جو مدت دراز کے یکطرفہ تصور کے بعد دماغوں میں راسخ ہوچکے ہیں بلکہ صرف اس علمی حقیقت کو واشگاف کرنا ہے کہ کیا صحابہ کے دور کا اختلاف ہمارے زیرِ بحث اختلاف کا مصداق بن سکتا ہے ؟ ہمارے نزدیک صحابہ کرام کے مشاجرات ہرگز "اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ" کی حد میں نہیں آتے۔ ہاں اگر الفاظِ قرآنیہ کو خواہ مخواہ کے لئے وسعت دیکر اُن مشاجرات کو داخل کرنا ہی منظور ہو تو امر دیگر ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرام میں اگر اجتہادی وفروعی اختلافات تھے تو اس بنیاد پر ان میں کوئی پارٹی بندی نہیں تھی، اور جب پارٹیاں نہیں تو ان کی بنیاد عقائد واعمال یعنی تفرق فی الدین نہ تھی۔ آگے چل کر ہم اس کو اور واضح کریں گے کہ قرآن وحدیث میں سیاسی گروہ بندیاں زیرِ بحث نہیں۔

اب آپ کو اختیار ہے کہ اس اختلاف کو اختلاف ہی نہ کہئے یا اختلافِ مذموم سے جدا کرلیجئے۔ مجاہد پہلے مشرب کے معلوم ہوتے ہیں وہ "الا من رحم ربك" کی تفسیر میں فرماتے ہیں فان اهل الحق ليس فيهم اختلاف[1] اہلِ حق میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور حسن کا دوسرا مشرب معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں فان اهل رحمة الله لا يختلفون اختلافا يضرهم[2] یعنی اہلِ رحمت ایسا اختلاف نہیں کرتے جو ان کو مضرت رساں ہو۔ کیونکہ یہ اختلاف ان ہی مسائل میں ہے جہاں کوئی نص نہیں ہے۔

دین میں اختلاف کے رفع کا اصول۔ ان مسائل میں شریعت نے خود اپنی جانب سے اختلافات دور کرنے کا حسب ذیل ضابطہ مقرر کردیا ہے۔

فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ   پھر اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو لوٹا دو اسے خدا اور

---

[1] الاعتصام ج ا ص ۳۹۔ [2] ایضاً ج ا ص ۱۲۵۔

الی اللہ والرسول   اس کے رسول کو سپرد کردو

یہ زریں قانون اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ دینی اختلاف اختلاف نہ رہے بلکہ ردّ الی اللہ والرسول کی وجہ سے وہ حکم منصوص ہی کا رنگ اختیار کرلے ۔اور اس طرح اس اختلاف میں پھر ایک شانِ وحدت پیدا ہو جائے۔

آیتہ فان تنازعتم کی نادر تفسیر

امام ابو اسحاق شاطبیؒ نے موافقات جلد رابع میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس طرح اصولِ شریعت میں کوئی اختلاف نہیں ہے اسی طرح اس کے فروع میں بھی کوئی اختلاف نہیں اور اس سلسلہ میں آیتہ " فان تنازعتم" کی تقریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رفع تنازع و اختلاف ہی کے لئے تو ردّ الی اللہ والرسول کا حکم ہوا ہے اب اگر کتاب وسنۃ میں بھی اصول و فروع میں اختلاف تسلیم کر لیا جائے تو اس رد کا فائدہ کیا ہوگا۔ اختلاف پھر اپنی جگہ بحال رہیگا۔ ایک اختلاف دوسرے اختلافی آئین سے ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اس آئین سے ختم ہو سکتا ہے جس میں خود کوئی اختلاف نہ ہو۔ [1]

محقق دمیاطی محشی موافقات کو اس دعوی میں کچھ تردد ہے ہمارے نزدیک امام شاطبیؒ کا دعویٰ بالکل درست ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اصول شریعت میں کوئی اختلاف نہیں

اس کا حاصل یہ ہے کہ مقصد شریعت نہ اصول میں مختلف ہے نہ فروع میں بلکہ اتحادِ اصول کے بعد فروع میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ فروع اصول کے ہمیشہ تابع رہتے ہیں۔ اس لئے جب اصول میں اختلاف نہیں تو فروع میں کیسے ممکن ہے لیکن آیت میں اس امر کا دعویٰ نہیں ہے کہ ردّ الی اللہ والرسول کے بعد ہر شخص کو وہ حکم قصدِ شارع کے مطابق حاصل بھی ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ بعض مرتبہ ایک جزئی میں اصول متفرقہ صادق آنے کی صلاحیت ہوتی ہے ہر مجتہد اپنے اپنے خیال کے موافق اُسے ایک اصل کے ماتحت داخل کرتا ہے اور اس اصل کے مطابق اس کا حکم اخذ کر لیتا ہے اس لئے اجتہاد و آراء کے اس تجاذب کی وجہ سے

[1] ج ۴ ص ۱۱۹ و اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۴۱۔

فروع میں اختلاف رونما ہوجاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ مختلف حکم خود شریعت کے بیان کردہ نہیں ہیں اس نے ایک ہی قانون بنایا ہے اور اس کے مطابق اس کا ایک ہی حکم ہونا چاہئے حتیٰ کہ اگر عہدِ نبوة ہوتا اور آپ سے براہِ راست اس جزئی کے متعلق سوال کیا جاتا تو اس کا ایک ہی جواب ملتا، لیکن بعد میں جب راہِ صواب کا انتخاب صرف افہام پر موقوف رہ گیا تو اب اختلاف افہام وعقول کی وجہ سے مجتہد فیہ جزئیات میں اختلاف ضروری ہوگیا یہ دوسری بات ہے کہ شریعتِ حنیفیہ نے قانونِ یُسر کے موافق یہاں خطاء وصواب دونوں صورتوں میں اجر کا وعدہ کرلیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درحقیقت اس کے آئین میں اُس جزئی کے لئے دو حکم ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف موجود تھے

مفہومِ اختلاف کی اس توضیح کے بعد مناسب ہے کہ اب اس کے اسباب پر بحث کی جائے۔

اسباب اختلاف وتفرق

یہ پہلے بتلایا جاچکا ہے کہ یہاں ہمارا مطلب اختلاف سے بعض اصول وکلیات کا اختلاف ہے اس لئے اسی کے اسباب پر ہمیں غور کرنا ہے۔ جہاں تک استقراء اور تلاش سے دریافت ہوسکتا ہے اس کے تین اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) ناقص اور سطحی علم۔ (۲) اتباعِ ہوٰی وخواہشِ نفس (۳) اتباعِ رسوم وعادات — ان اسباب پر غور کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس دور پر غور کرنا ضروری ہے جہاں مذہب کی سطح پر اختلاف کا کوئی چھوٹا سا بلبلہ بھی تیرتا نظر نہیں آتا پھر وہ کیا اسباب ودواعی ہوئے کہ یہ سمندر دفعةً متحرک ہوا اور ایسا متحرک ہوا کہ اس کی امواج معمورۂ عالم کو محیط ہوگئیں۔

دورِ اول کا طریق تحصیلِ علم | غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی قوم جس کو قرآنِ کریم نے امتی ہونے کا لقب دیا ہے اور جس کو خود بھی اپنے امی ہونے پر فخر تھا تحصیل علم کے لئے جس پہلی درسگاہ میں داخل ہوئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ مبارک تھی یہاں نہ کسی رسمی درسگاہ کا سند یافتہ معلم ان کا مربی تھا نہ کوئی مرتب کتاب ان کے سامنے تھی صرف ان ہی میں کا ایک امی انسان ان کے پیشِ نظر تھا جسے وہ خدا کا رسول تسلیم کرچکے تھے اور بس۔

دورِ اول میں اختلاف نہ ہونے کے اسباب

اسی بنا پر اس کی نشست و برخاست، نطق و سکوت، طعام و لباس، آمد و رفت غرضکہ جملہ عادات و عبادات کی جو وضع دیکھ لیتے اسی کو اپنا دستور العمل بنا لیتے جو کہہ دیتا اُسے خدا کا حکم تصور کرتے اور جو کر لیتا اسے رضاءِ الٰہی کا یقینی ذریعہ سمجھتے خلاصہ یہ کہ آپ کے کلماتِ طیبات کا سننا اور یاد کرنا یہی ان کا سبق تھا اور اپنے عمل کو آپ کے عمل کے مطابق بنانے میں لگا رہنا یہی ان کا عمل تھا اس لئے ان کی سادہ فطرۃ اور سادہ دماغ میں جو پہلا نقش قائم ہوا وہ حق ہی حق اور صواب ہی صواب تھا پھر مزید براں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرِ صحبت کران علوم نے ان میں ایسا رسوخ اور ایسی نورانیۃ پیدا کر دی تھی کہ وہ خود ایک معیارِ حق و باطل بن گئے تھے۔ اسی طرح قرآن کی ایک ایک آیت ان کے سامنے اترتی رہی اور وہ اس کی صحیح سے صحیح تفسیر آپ کے طرزِ عمل میں پڑھتے رہے یہاں تک کہ تمام کا تمام دین انھوں نے نہایت سہولت اور صحت کے ساتھ اس طرح سیکھ لیا جس طرح ایک بچہ بلا کسی تکلف و تکلیف اپنے والدین کے پورے پورے رنگ ڈھنگ اور طور طریق سیکھ لیتا ہے۔ ایسے ماحول میں اختلاف و افتراق کا کیا گذر ہو سکتا تھا۔

قرآنِ کریم کی اس عملی اور زندہ تصویر کے روپوش ہو جانے کے بعد گو تحصیل دین میں اب وہ سہولت تو باقی نہیں تھی مگر چونکہ اصل کی عکسی تصاویر بکثرت چلتی پھرتی موجود تھیں اس لئے قرآن پڑھنے والے اگر کہیں اٹکتے تو ان عکسی تفسیروں سے اس کا حل کر لیتے لیکن جب یہ عکسی تصاویر و تفاسیر گم ہوتی چلی گئیں۔

دوسرے دور کا طریقہ ذہنی انتشار اور ماحول کا اختلاف فہم مراد میں مخل ہوتا ہے

ادہر اسلام عرب سے نکل کر مختلف سمتوں میں پھیل گیا تو وہ طریقِ تعلیم و تعلم بھی بدل گیا۔ علومِ رسمیہ اور اہلِ عجم کی کثرتِ اختلاط کی وجہ سے ذہن منتشر ہو گئے اندازِ فکر بدل گیا۔ قرآنِ کریم کے صرف الفاظ سامنے رہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات و تفصیلات کا جو ذخیرہ پہنچا وہ بھی بشکلِ الفاظ پہنچا اس لئے چون و چرا اور لا و نعم کا دروازہ کھل گیا عقلاء نے اپنی عقل کے بھروسہ پر اور بے علموں نے اہلِ علم ہونے کی غلط فہمی میں دین کو تختۂ مشق بنا لیا اور رفتہ رفتہ وہ اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے جن کی بنیاد عقائد تھی اور جن کو دین کا اختلاف کہا جا سکتا تھا۔ (باقی آئندہ)

محاجِ ابراہیمی

اور

نمرودی مغالطہ

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

برہان ۱۹۵۶ء دسمبر میں "محاجِ ابراہیمی" کے متعلق جن ملاحظ و نقاط نظر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کو دیکھ کر فقیر میں بھی اپنے ایک پرانے خیال کو اہلِ علم و فکر کے حلقہ میں عرض کرنے کی جرأت پیدا ہوئی ہے گویا ایک "خیال مدفون" کے احیار کا موقعہ نکل آیا۔ مجھے اپنے اس خیال پر اصرار نہیں ہے اگر کوتاہیوں پر مجھے مطلع کیا جائے گا تو انشاء اللہ اپنی اصلاح کے قبول کرنے سے کبھی گریز نہیں کروں گا۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

جو جانتے ہیں وہ تو خیر جانتے ہی ہیں لیکن جو نہیں جانتے ہیں ان کے لئے میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس قصہ کو قرآن میں ان مشہور آیتوں کے بعد بیان کیا گیا ہے جو عام طور پر آیۃ الکرسی کے نام سے موسوم و مشہور ہیں۔

میرے نزدیک اس قصے کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے آیۃ الکرسی کے الفاظ پر غور کیا جائے صرف یہی ایک قصہ نہیں بلکہ آیۃ الکرسی کے بعد مسلسل چند قصے قرآن میں جو بیان کئے گئے ہیں یعنی ایک تو یہی محاجِ ابراہیمی کا واقعہ پھر اس شخص کا قصہ جنھوں نے ایک برباد شدہ قریہ کے کھنڈر پر گذرتے ہوئے کہا تھا کہ

اَنّٰی یُحْیِیْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا کیسے جلائے گا اللہ اس کو اس کی موت کے بعد

جس کے بعد خدا نے ان پر موت طاری کی اور سو سال کے بعد پھر زندگی بخشی گئی یعنی عموماً لوگ جسے حضرت عزیر علیہ السلام کا قصہ کہتے ہیں اس کے بعد چار پرندوں کے مارنے اور جلانے کا قصہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام ہی سے متعلق ہے۔ بہرحال میرے نزدیک قرآن کے ان تینوں قصوں کا تعلق آیۃ الکرسی ہی کے مضامین سے ہے، چونکہ اس وقت دوسرے قصوں سے بحث نہیں ہے۔ اس لئے صرف "محاج ابراہیمی" کے قصہ کا آیۃ الکرسی سے میرے نزدیک جو تعلق ہے اسے بیان کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ آیۃ الکرسی کی ابتدا ان الفاظ سے کی گئی ہے یعنی

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ — اللہ نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہی جو زندہ قیوم ہے

جس کا مطلب یہی ہے کہ کائنات کا بنیادی وجود جس کا نام "اللہ" ہے اس کے خصوصی صفات کو ظاہر کرتے ہوئے قرآن نے پہلے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے یعنی پہلی صفت تو اللہ کی الحی (زندہ) ہے اور دوسری امتیازی صفت خدا کی القیوم ہے۔

میرے خیال میں الحی کے لفظ سے ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو "سرچشمۂ کائنات" کو حیاتی صفات سے محروم فرض کرکے مادے کے نام سے اس کو روشناس کراتے ہوئے کائنات کی توجیہ کرتے ہیں یعنی مذہب کے خدا اور فلسفہ کے مادے میں پہلی امتیازی صفت یہی ہے کہ مذہب کا خدا حیاتی صفات کا سرمایہ دار ہے اور فلسفہ کا مادہ حیاتی کمالات سے محروم و مفلس ہے اور سچ پوچھئے تو خدا کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں اختلاف کا حقیقی نقطہ یہی بحث ہے ورنہ خدا کے متعلق یہ خیال کہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو کسی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ خود بخود ہے ایک ایسا ناقابلِ ازالہ یقین ہے کہ خدا کے منکر ہوں یا معتقد، دونوں اس حقیقت کے ماننے پر مجبور اور بے بس ہیں۔

میں نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں بہ تفصیل بتایا ہے کہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کے متعلق اتنی بات یعنی اس کا خود بخود ہونا ایک ایسا عقیدہ ہے کہ اس کا اقرار تو خیر اس عقیدے کا

اقراری ہے لیکن تماشا تو یہ ہے کہ اس عقیدہ کا انکار بھی ٹھیک اپنے انکار کی حالت میں الٹ کر اسی عقیدے کا اقرار بن جاتا ہے۔

میں نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ اس حد تک خدا کی ذات کا مسئلہ چونکہ اتنا بدیہی ہے کہ اس کا ہر انکار اسی مسئلہ کا اقرار بن جاتا ہے اسی لئے بجائے ذات کے قرآن نے اپنی بحث کا آغاز خدا کی صفات سے کیا ہے یعنی قرآن کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین ؑ سے کی گئی ہے۔[۱] اور یہاں بھی یعنی آیۃ الکرسی میں بھی بجائے ذات کے خدا کے دو امتیازی صفات الحی اور القیوم ہی کو بطور دعوی کے پیش کرکے ہر ہر دعوی کی دلیل قصے کے رنگ میں پیش کی گئی ہے، گویا یہ دعوی کرکے کہ اللہ اس ذات کا نام ہے جس کی امتیازی صفات زندہ ہونا اور ساری کائنات کا قیوم (تھامنے والا) ہونا ہے، آگے جو قصے بیان کئے گئے ہیں وہ ان ہی دو دعووں کے دلائل ہیں۔

میرے نزدیک حضرت عزیر کا قصہ اور چار پرندوں کا قصہ ان دونوں کا تو تعلق القیوم سے ہے اور "حجاج ابراہیمی" کے قصے کا جہاں تک میں سمجھتا ہوں الحی کی صفت سے تعلق ہے یعنی قرآن نے سرچشمۂ کائنات کے متعلق یہ دعوی جو پیش کیا ہے کہ وہ حیاتی صفات کا سرمایہ دار ہے، مادہ نہیں ہے جو حیات ولوازم حیات سے محروم ومفلس ہو، اس دعوے کی دلیل میں ایک ایسے قدیم تاریخی مناظرے کو اس نے نقل کیا ہے جس میں بحث کا "محور" سرچشمہ کائنات کی یہی امتیازی صفت یعنی حیات اور زندگی تھی۔

جس مقدمہ پر اس استدلال کی بنیاد قائم ہے قرآن ہی میں اس کا تذکرہ مختلف مقامات میں

---

[۱] جس کا حاصل یہی ہے کہ وہ سارے کمالات ومحاسن جن کی تعریف وستائش کی جاتی ہے خواہ ان کمالات ومحاسن کا ظہور نباتی شکل میں ہوا ہو یا حیوانی وجمادی یا کسی اور شکل میں، قرآن مدعی ہے کہ ان سارے کمالات ومحاسن کی تعریف اور ان کی حمد وستائش اللہ ہی کے ساتھ مختص ہے۔ اور وجہ اس کی وہی ہے کہ کائنات کے کسی شعبہ میں جو کمال جو حسن وجمال نظر آتا ہے ان میں نظر ہی نہیں آسکتا تھا جب تک کہ کائنات کے اصل سرچشمہ میں وہ کمال وحسن نہ ہو، جب بنیادی وجود ہی کمالات سے خالی ہوگا تو جو چیزیں اس بنیادی وجود سے پیدا ہوئی ہیں ان میں کسی کمال کے ظہور کی آخر شکل ہی کیا ہو سکتی جو نہ تھا وہ ہوگا کیسے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "الدین القیم" ۱۲

کیا گیا ہے جس کا حاصل اگر سمجھا جائے تو قرآن کی یہ مشہور آیت بھی ہو سکتی ہے، فرمایا گیا ہے کہ

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ — کیا وہ پیدا کئے گئے ہیں "غیر شی" سے (یعنی جو کچھ نہ ہو)

اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ — یا وہ اپنے پیدا کرنے والے خود آپ ہیں۔

جس میں دو شقوں کو پیش کر کے اور دونوں کو بدیہی البطلان قرار دیتے ہوئے خدا کے وجود کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے، ان دو شقوں میں پہلی شق یعنی "ام خلقو من غیر شی" کا کھلا ہوا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ "غیر شی" یعنی "لاشی" اور "نیستی" سے "ہستی" کی پیدائش کا تصور آدمی نہیں کر سکتا اسی طرح دوسری شق یعنی ہم میں ہر شخص اپنا خالق و آفریدگار خود آپ ہو، اس کا غلط ہونا بھی بدیہی ہے۔

بہر حال پہلی شق یعنی نیستی سے ہستی کی پیدائش کا ناقابلِ تصور ہونا یہ ایک ایسی بات ہے جو ذات کے سوا صفات پر بھی صادق آتی ہے جیسے یہ بات کہ "کچھ نہ تھا" اور یکایک اسی "نہ کچھ" یا "غیر شی" سے کچھ ہو گیا، لکڑی نہ تھی اور کرسی اچانک خود بخود پیدا ہو گئی، مٹی نہ تھی اور گھڑا خود بخود اچانک پیدا ہو گیا۔ نیستی سے ہستی کی پیدائش کی یہ ساری صورتیں جیسے ہمارے لئے ناممکن التصور ہیں۔ اسی طرح جہاں علم نہ ہو، اس سے علم کا پیدا ہونا جہاں فکر نہ ہو اس سے فکر، جہاں ارادہ نہ ہو وہاں سے ارادہ۔ الغرض جہاں زندگی نہ ہو، اس سے زندگی کا پیدا ہونا، اگر غور کیا جائے تو وہی "نیستی" سے ہستی کی پیدائش کو گویا تسلیم کر لینا ہے۔ جس کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش انسانی فطرت میں نہیں رکھی گئی ہے۔

اب اسی مقدمہ کو سامنے رکھ لیجئے اور آیۃ الکرسی میں کائنات کے بنیادی وجود کی پہلی خصوصیت "الحی" (زندہ) جو بتائی گئی ہے اس قرآنی دعوے کے لئے دیکھئے کہ "حجاج ابراہیمی" سے کتنی صاف ستھری دلیل نکل آتی ہے۔ نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب یعنی خدائے زندہ "الحی" کے متعلق جھگڑ رہا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس واقعہ کو پیش کرتے ہوئے کہ کائنات میں "حیات و موت" کا جو سلسلہ جاری ہے۔ گویا یہ سوال کیا ہے کہ یہ

زندگی اور حیات عالم کے مختلف طبقات میں آرہی ہے جارہی ہے، کہاں سے آرہی ہے؟ کیا انسان تصور کرسکتا ہے کہ زندگی وہاں سے پیدا ہو، جہاں زندگی نہیں ہے جس میں خود حیات نہیں ہے۔ کیا وہ دوسروں کو حیات بخش سکتا ہے؟ اور یہی مطلب ہے میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْت میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے

کا الغرض "حیات" اور "زندگی" کے جس قانون کی نمائش اس عالم کے مختلف شعبوں میں ہورہی ہے اس قانون کی توجیہ صرف مادہ جیسے محروم الحیاۃ والکمالات وجود سے کیا ممکن ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ ایسی گرفت تھی کہ آج باوجودیکہ سائنس اور کیمیا کے تحقیقاتی مباحث عروج کے انتہائی نقاط تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن "حیات" اور "زندگی" "روح" اور "جان" کی توجیہ مادی قوانین کی پشت پناہی میں قطعاً ناممکن ہے۔ لیکن نمرود نے اس استدلال سے گریز کی راہ اختیار کی قرآن نے ان الفاظ میں اس کے گریز کو ادا کیا ہے یعنی نمرود نے کہا۔

اَنَا اُحیٖ وَاُمِیْت میں ہی جلاتا اور مارتا ہوں۔

نمرودی الفاظ کا عام طور سے ایک فرضی قصے کو پیش کرکے جو مطلب بیان کیا جاتا ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ کسی واجب القتل قیدی کو بلاکر اس نے رہائی کا حکم دیکر کہدیا کہ یہ میرے دعویٰ احیاء کا ثبوت ہے اور کسی قسمت کے مارے کو بلاکر قتل کرادینے کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ میری اماتت کے دعوے کا یہ ثبوت ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر قرآنی قصہ ہے اور قرآنی الفاظ پر منطبق بھی نہیں ہے یعنی پہلی بات کا احیاء سے دور کا بھی تعلق نہیں، واجب القتل آدمی تو خود زندہ تھا۔ نمرود نے اس کو اگر چھوڑ دیا تو زیادہ سے زیادہ اس کی تعبیر "ابقار حیات" سے ہم کرسکتے ہیں۔ یعنی جس کی حیات کے ازالہ پر نمرود بظاہر اپنے آپ کو قابو یافتہ محسوس کرتا تھا، بجائے ازالہ کے اس نے اس کی حیات اور زندگی و باقی رہنے کا موقعہ دیا۔ لیکن یہ بات کہ جس میں زندگی اور حیات نہ تھی اس میں اس نے حیات

اور زندگی پیدا کی جو احیا، کا مفہوم ہے اس سے نمرود کے اس مفروضہ فعل کو کیا تعلق؟ بہر حال اس خود ساختہ غیر قرآنی مفروضہ قصے کو بیان کر کے عموماً مفسرین نمرودی دعوی کی جو تشریح کرتے ہیں میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی۔ اب رہی یہ بات کہ احیا اب اس کا مطلب کیا ہے؟

جہاں تک میں خیال کرتا ہوں خواہ مخواہ ایک فرضی قصے کی طرف لوگوں کا ذہن جو منتقل ہو گیا اگر بجائے اس کے وہ نمرودی ذہنیت رکھنے والوں کے عام طریقۂ عمل پر غور کر لیتے جن کی کسی زمانے میں اور غالباً کسی مقام میں کبھی کمی نہیں رہی ہے تو مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا تھا مطلب یہ ہے کہ حوادث کونیہ یعنی روزمرہ پیش آنے والے واقعات کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسے منسوب کرنے والے عموماً اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ ایک کھلی ہوئی مثال اس کی مرزا غلام احمد قادیانی تھے۔ عموماً ان کی پیشگوئیوں میں آپ کو یہی بات نظر آئیگی کہ قدرتی واقعات جو قدرتی قوانین کے زیر اثر پیش آتے رہتے ہیں لیکن مرزا صاحب ان واقعات کے ایک بڑے حصہ کو اپنی طرف منسوب کر لینے کے عموماً عادی تھے مثلاً ہندوستان میں طاعون آیا، یا حیدر آباد میں طوفان برپا ہوا۔ بہار میں زلزلہ آیا، یا اسی طرح کوئی مرتا ہو، جیتا ہو مرزا صاحب موصوف اور ان کے بعد ان کے مریدوں کی عام عادت ہے کہ اسے وہ مرزا صاحب کی نبوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں (میں نے اسی مغالطہ کا نام قرآن کے اسی قصہ کی بنیاد پر "نمرودی مغالطہ" رکھدیا ہے) جیسا کہ میں نے عرض کیا مرزا صاحب کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس "نمرودی مغالطہ" سے کام لینے کا عادی ہر زمانہ میں انسانوں کا ایک طبقہ پایا گیا ہے۔ اور اب اس کے بعد آپ نمرود کے الفاظ پر غور کیجئے۔

انا احی وامیت — میں ہی جلاتا ہوں میں ہی مارتا ہوں

یعنی ابراہیم علیہ السلام احیار و اماتت کے اس قانون کو جو کائنات میں ہر جگہ جاری و ساری نظر آ رہا تھا اسی کو خدا کی طرف منسوب کر کے حق تعالی کی اس صفت کو بیان کر رہے تھے جس کی وجہ سے خدا کی ذات مادے سے ممتاز ہو جاتی ہے لیکن نمرود نے احیار و اماتت کے اس

قانون کو بجائے قدرت کے اپنی طرف منسوب کرکے

اَنَا اُحیِ وَ اُمیت　　میں ہی جلاتا ہوں میں ہی مارتا ہوں۔

کے مغالطے کو دعوے کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے پیش کردیا۔ گویا اس نے کہا کہ دنیا میں جو لوگ زندہ ہو رہے ہیں ان کو میں ہی زندہ کرتا ہوں اور جو مر رہے ہیں انھیں میں ہی مارتا ہوں اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ نمرود تو خیر نمرود ہی تھا جس کسی کا جب جی چاہے اس قسم کا دعویٰ کرسکتا ہے، آخر میں پوچھتا ہوں کہ دلی میں روزانہ جو لوگ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں اگر ان کے متعلق کوئی دلی ہی کا رہنے والا یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں ہی ان پیدا ہونے والوں کو پیدا کرتا ہوں اور مرنے والوں کو مارتا ہوں تو آپ اس کا کیا کرلیں گے، مرزا صاحب جب ہر اس نمایاں حادثے کو جو ان کے دعویٰ ہونے کے بعد ہندوستان میں پیش آتا تھا اپنی طرف منسوب کرلیتے تھے تو دنیا نے ان کا کیا کرلیا۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اس میں بیچارے مرزا صاحب کی کوئی تخصیص نہیں، سوسائٹی میں ایک طبقہ اس قسم کی نمرودی ذہنیت رکھنے والوں کا عموماً پایا جاتا ہے، ان لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی ملازمت مل جائے کسی معاملہ میں کچھ کامیابی ہو جائے۔ تو کسی نہ کسی طرح وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کامیابیوں کو وہ اپنی طرف منسوب کرلیں۔ اور لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ فلاں صاحب جو آج فلاں عہدے سے سرفراز ہیں خاکساری کی توجہ و کوشش کا نتیجہ ہے۔

بلکہ اہل السنت والجماعت کا جو عقیدہ خلق افعال کے متعلق ہے، اگر اسی کو واقعہ تسلیم کرلیا جائے اور جہاں تک نصاً و کشفاً واقعہ کا تعلق ہے حقیقت بھی وہی ہے جس کی یافت حضرات اشاعرہ کو ہوئی ہے لیکن ان کے مقابلہ میں معتزلہ افعال کے خالق اپنے آپ کو جو قرار دیتے ہیں تو میرے نزدیک یہ بھی "نمرودیت ہی کی ایک اعتزالی شکل ہے۔

بہرحال میرے خیال میں "نمرودی مغالطہ" مغالطہ کی دنیا میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور حاصل اس کا وہی ہے کہ حوادث کو، یا قدرتی واقعات کو بجائے قدرت کے

آدمی خواہ مخواہ اپنی طرف منسوب کرلے، نمرودی الفاظ کی تشریح اگر اس طریقہ سے کی جائے تو ہمیں قرآنی آیت کی تشریح کے لئے کسی فرضی غیر قرآنی قصہ کے فرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اور نہ اس اعتراض کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ واجب القتل مجرم کو چھوڑ کر نمرود نے تو ابقاء حیات کا کام انجام دیا تھا پھر اس کو "احیاء" قرار دینے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ اس برخود غلط مدعی کے مغالطی ادعا کے مطلب کا خلاصہ یہی تو ہوگا کہ قدرتی قوانین قدرت کی مرضی کے نہیں بلکہ اس مدعی کی مرضی کے پابند ہیں میرے نزدیک نمرود کے دعویٰ "انا احی واسیت" کے اسی حاصل کو پیش نظر رکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے یہ بات پیش کی کہ جب احیاء واماتت یعنی جلانے اور مارنے جیسے قدرتی قوانین کے متعلق تو مدعی ہے کہ تیرے قبضۂ اقتدار میں ہیں تو روزمرہ کا یہ عام حادثہ یعنی دن رات کی پیدائش بھی تیری ہی مرضی اور فرمان کے تابع ہوگی۔ کیونکہ حیات وموت کے قانون کے مقابلہ میں گردش لیل ونہار کا یہ واقعہ ایک معمولی واقعہ ہے اب اگر قدرتی قوانین تیری مرضی کے تابع ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے مطالبہ کیا کہ اس وقت تو دن اور رات کی پیدائش کا ظہور اس شکل میں ہو رہا ہے کہ خدا آفتاب کو پورب سے نکالتا ہے لیکن بجائے خدا کے اگر آفتاب کا پورب سے نکلنا یہ تیری مرضی کا کرشمہ ہے تو بجائے مشرق کے آفتاب کو مغرب سے نکال کر ذرا دکھادو اور یہی ماحصل میرے خیال میں حضرت ابراہیمؑ کے ان الفاظ کا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ — اللہ لاتا ہے آفتاب کو مشرق سے تو لاتو

فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ — اس آفتاب کو مغرب سے۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حوادث کونیہ اور قدرتی قوانین کو بجائے قدرت کے اپنی طرف منسوب کرنیوالے مدعیوں کو خاموش کرنے کی تدبیر اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے یہ گرفت ہی ایسی تھی کہ

فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ — پس ہکا بکا ہو کر رہ گیا جس نے کفر کیا۔

کے سوا اس کا کوئی دوسرا نتیجہ ہو ہی نہیں سکتا تھا آگے ارشاد فرمایا گیا کہ

وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ اور اللہ تعالیٰ راہ نمائی نہیں فرماتا ظلم کرنیوالوں کو

"الظالمین" ظلم کرنے والوں کو کہتے ہیں ظلم فطری حدود سے تجاوز کو کہتے ہیں قدرتی واقعات کو بجائے قدرت کے محض کسی وقتی اقتدار سے متاثر ہو کر اپنی طرف منسوب کر لینے کی عادت ظاہر ہے کہ حقیقت سے انحراف و تجاوز ہے اور ایک غلطی کے بعد انسان کی فطرت غلطیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے، یہی وجہ ہوتی ہے اس بات کی کہ ظالم پھر حقائق و واقعات کی یافت سے محروم ہو جاتا ہے۔

"نمرود" کو کسی خاص قطعہ ارضی (یعنی میسوپٹیمیا یا عراق عرب) کی حکومت ملی تھی لیکن کسی علاقہ کی حکومت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس علاقے کے قدرتی قوانین بھی صاحب حکومت کی مرضی کے تابع ہو جاتے ہیں مگر کیا کیجئے کہ حکومت کا مغالطہ عموماً حکمرانوں کو اس مغالطہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ بن جاتا ہے، آج مغربی اقوام کی "نمرودیت کی بنیاد بھی اسی "ان آتاہ اللہ الملک"[1] ہی کے مسئلہ پر تو مبنی ہے، حق تعالیٰ کا وقار ان کے قلوب سے آج جو نکلا ہوا نظر آرہا ہے تحلیل و تجزیہ کے بعد یہاں بھی آخر میں جو چیز "نمرودیت جدیدہ" کے نیچے چھپی نظر آئے گی وہ یہی "ان آتاہ اللہ الملک" کے ساتھ مغربی اقوام کی سرفرازی ہے۔ بلکہ مشہور قرآنی آیت

اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ قطعاً زمین کا وارث اللہ تعالیٰ اپنے صالح بندوں کو بناتا ہے۔

میں جس "وراثت" کو حق تعالیٰ نے اپنے صالح بندوں کی طرف منسوب کیا ہے اس وراثت کا ترجمہ لوگوں نے حکومت کے لفظ سے کر کے خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو جو مغالطہ میں مبتلا کر دیا ہے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ "وراثت" نام ہے اس چیز کا کہ "مورث" جس اقتدار کو کسی شے کے متعلق رکھتا تھا وارث تک جب وہی اقتدار منتقل ہو جاتا ہے تب کہتے ہیں فلاں مورث کا فلاں

---

[1] یہ کہ خدا نے اس کو ملک عطا کیا تھا ۱۲

شخص وارث ہوگیا، اب ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں "اپنے عباد صالحون" کی طرف جس وراثت کو حق تعالیٰ نے منسوب فرمایا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ خدا کی وراثت ہے جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے جن بندوں کو ان کے صلاح و تقوی کی وجہ سے اپنا محبوب بنا لیتے ہیں ان کے ساتھ یہ برتاؤ اختیار کیا جاتا ہے کہ ان کا ارادہ گویا خدا کا ارادہ اور ان کا اقتدار گویا خدا کا اقتدار بن جاتا ہے۔ صحیح بخاری کی مشہور حدیث میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ ایسے محبوب بندوں کی خدا وہ آنکھ بن جاتا ہے جن سے وہ دیکھتے ہیں اور ان کی وہ شنوائی بن جاتا ہے جن سے وہ سنتے ہیں، ان کا ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ پکڑتے ہیں اور پاؤں بن جاتا ہے جن سے وہ چلتے ہیں، میرے خیال میں تو جس وراثت کا ذکر عباد صالحون کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہے اسی قرآنی وراثت کی تفسیر و تشریح دوسرے الفاظ میں بخاری کی اس حدیث میں کی گئی ہے، حاصل اس کا یہی ہے کہ ان عباد صالحون کو وہ اقتدار بخشا جاتا ہے جو خالق کے سوا مخلوقات کے متعلق اور کسی کو حاصل نہیں ہے آگے کی آیت

اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ○ اسی میں بلاغ (صلائے عام) ہی عبادت کرنے والوں کے لئے سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ "عباد صالحون" سے یہاں مراد بنی آدم کا وہ طبقہ ہے جس نے "عبدیت" کے مقام پر اپنے قدم کو استوار کیا ہو اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق مسلمانوں کے ارباب صدق و صفا میں ہمیشہ سے بعض خاص اصطلاحات مشہور بھی ہیں سمجھا جاتا ہے کہ "عبدیت" کے مقام پر قدم جمانے والے لوگ قطبیت و غوثیت، اوتادیت وغیرہ وغیرہ کے مقامات سے سرفراز ہوتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان بزرگوں کو حق تعالیٰ کی طرف سے ایسے اقتدارات بخشے جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ہر قسم کے تصرفات پر قادر بنا دیئے جاتے ہیں[1]

---

[1] اگرچہ صوفیا رکرام کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے لیکن علماء رسوم کہتے ہیں کہ شریعت میں ان کے اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں پائی جاتی مگر جس مجمل کو آیت وراثت کے متعلق فقیر پیش کر رہا ہے اس سے ایک طرف ایک قطعی نص اس صوفیانہ عقیدہ کی بنیاد بن جاتا ہے اور دوسری طرف اس آیت کی ایک ایسی تفسیر میسر آجاتی ہے جس پر اس قسم کے اعتراضات وارد نہیں ہوتے جو دوسری

واقعہ یہ ہے کہ ان کی "وراثت" بلاشبہ ایسی "وراثت" ہو سکتی ہے جسے ہم خدا کی صحیح "وراثت" قرار دے سکتے ہیں۔ اور "عباد صالحون" اور "قوم عابدین" کے الفاظ کے انطباق میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ ؎۱

لیکن محض "ان آتاہ اللہ الملک" یعنی کسی خاص علاقہ کی حکومت اور بادشاہی کے حاصل ہو جانے کے بعد ہر قسم کے الٰہی اقتدار کا محور اپنی ذات کو ٹھیرا لینا جیسا کہ نمرود نے ٹھیرا لیا تھا اور حکومت کے نشہ میں بدمست ہو کر احیا و امات کے قدرتی قوانین کو اپنی ذات کی طرف منسوب وہ کر رہا تھا۔ مغالطہ کے سوا اور کیا ہے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ عباد صالحون کی وراثت کی آیت کو بھی جن لوگوں نے سیاسی اقتدار رکھنے والی قوموں کی طرف منسوب کر دیا ہے، یہ بے چارے بھی کچھ اسی نمرودی مغالطہ کے شکار ہو گئے۔ بلکہ "نمرود" سے بھی زیادہ لایعنی مغالطہ "نمرود" تو سیاسی اقتدار کے نشہ میں خود مبتلا تھا اور ان بے چاروں پر تو "سیاسی اقتدار" یا حکومت کے اقتدار کا رعب اتنا طاری ہوا کہ دوسروں میں اس اقتدار کو محسوس کر کے انھوں نے خدائی اقتدارات کا وارث ان کو قرار دیدیا۔ اور اسی مغالطہ کا آج یہ نتیجہ ہے کہ "سیاسی اقتدار" ہی کو لوگوں نے سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ "سیاسی اقتدار" بھی اقتدار کی ایک بڑی اہم شکل ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سیاسی اقتدار ہی سب کچھ ہے۔

؎۱ مطلب یہ ہے کہ آیت وراثت کے متعلق یہ خیال کہ اس سے مراد سیاسی اقتدار رکھنے والے لوگ ہیں آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ نہ صرف فساق و فجار ہی کو بلکہ کفار و ملاحدہ زنادقہ اور بے ایمانوں کے متعلق یہ مان لے کہ عباد صالحین اور قوم عابدین ہونے کی سند ان کو قرآن عطا کر رہا ہے کیونکہ آج ہی نہیں بسا اوقات سیاسی اقتدار کی باگ اسی قسم لوگوں کے ہاتھوں میں پائی گئی ہے گیا ایک لمحہ کے لئے کوئی یہ مان سکتا ہے کہ یورپ کی جن قوموں کو آج دنیا میں سیاسی اقتدار حاصل ہے یہ خدا کے عبادِ صالحین ہیں، کیا خدا کے ان دشمنوں کو قوم عابدین کے ذیل میں کسی حیثیت سے بھی شریک کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح بعضوں کا یہ خیال کہ "الارض" سے مراد یہاں "ارض" جنت ہے یا یہ دعویٰ کہ زمین کے حقیقی وارث تو عباد صالحین ہیں اور کفار و فساق کا قبضہ غاصبانہ ہے۔ تاویلاتِ باردہ کے سوا اور بھی کچھ ہیں بعض بزرگوں نے اس آیت کو صحابۂ کرام کے سیاسی اقتدار کی پیشگوئی جو قرار دی ہے وہ بھی اس لئے محل نظر ہے کہ ان فی ھذا البلاغا لقوم عابدین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوامی قدرتی کلیہ

افسوس ہے کہ "نمرودی ذہنیت" رکھنے والی یورپین قوموں نے سیاسی اقتدار کے حاصل کر لینے کے بعد چونکہ اس نمرودی مغالطہ کو دہرانا شروع کر دیا کہ اب سب کچھ ہم ہی ہیں انھوں نے بھی لوگوں کو کچھ یہی باور کرا دیا ہے کہ آج مارنا اور جلانا سب ہمارے ہاتھ میں ہے جس قوم کو ہم چاہیں زندہ رکھیں اور جسے چاہیں موت کے گھاٹ اتار دیں۔ نمارِدۂ عصر کے اسی مشاغبہ نے آج اچھے اچھوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیا۔ اور ہر چیز سے ہٹ کر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے اپنی ساری توجہات کا مرکز "سیاست" ہی کو بنا لیا ہے حالانکہ قرآن آج بھی

اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ   قطعۂ الارض (زمین) کا وارث بناتا ہے خدا اپنے نیک بندوں کو

وَاِنَّ فِي هٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِيْنَ   اور اس میں بلاغ (صلائے عام) ہے ان لوگوں کیلئے جو عبادت گذار ہیں

کا صلائے عام دے رہا ہے "الٰہی وراثت" کے خواہشمندوں کے لئے آج بھی میدان کھلا ہوا ہے۔ صلاح کی راہیں یقیناً ابھی بند نہیں ہوئی ہیں اور "قوم عابدین" میں شریک ہونے کی تیاریوں میں آج بھی اگر کوئی مصروف ہو تو جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی روکنے والا کسی کو روک نہیں سکتا۔

بہر حال میرے نزدیک حجاج ابراہیمی کے قصہ کا تو آیۃ الکرسی کے دعوی "الحی" سے تعلق ہے باقی دو قصے یعنی عزیر علیہ السلام اور چار پرندوں کے قصے ان کا تعلق "القیوم" کے دعوے سے ہے۔ انشاء اللہ کسی آئندہ صحبت میں ان کے متعلق بھی اپنے ناچیز خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

داخلی محرکات اور علم النفس

(از جناب ہدایت الرحمٰن محسنی صاحب ایم اے ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی)

علم النفس کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جس قدر مشکل ہے اسی قدر سہل بھی ہے بشرطیکہ فکر ونظر دونوں سے یکساں کام لیا جائے۔ اس سلسلہ میں نہ ہمیں علم طبقات الارض اور علم نباتات وغیرہ کی طرح درسی تعینات اور تمثیلات کی تلاش میں کہیں دور جانے کی ضرورت ہے اور نہ ضبطِ حالات اور صدورِ کیفیات کے ادوار اور درجات متعین کرنے کے لئے بیرونی اسباب وعلل کی تلاش وجستجو کی حاجت ہمارا مطالعہ گردوپیش کے معمولی مشاہدات اور بشری کردار کے ادنیٰ مظاہرات پر موقوف کیا جاسکتا ہے۔ دماغ کی معمولی تحریکات کے داخلی تجزیہ سے اہم سے اہم علمی نتائج اور فہم علم کے اصول وقوانین اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ ضرورت محض اتنی ہے کہ مشاہدہ اور ادراک حقیقت کا عکس بجائے شواہدِ حرکات کے داخلی محرکات پر ڈالا جائے۔ انسانی کردار اپنے افعال اور باہمی ارتباط کے ذریعہ موضوع اور مطالعہ کے لئے بے پایاں ذخائر بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ چنانچہ روزمرہ کے تجربات سے ضروری مواد انتخاب کرکے ہمارے موضوع کے مختلف پہلو روشن کئے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ خود ہماری اپنی ذات موضوع کی مختلف النوع کیفیات اور تمثیلات کا مظہر ہے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

انسانی نفسیات کے مطالعہ کی مبادیات کے طور پر دماغی تحریکات کا علمی تجزیہ ضروری ہے اس تجزیہ کی اعتباری منازل طے کرنے کے لئے شاہد پر واجب ہے کہ ابتدائً وہ مشہود کو خود اپنی ہی ذات میں تلاش کرے۔ مثال کے طور پر ہم ایک معمولی سا تجربہ لیتے ہیں۔ ایک راستہ سے گذرتے ہوئے ہماری توجہ دفعۃً کسی ایسے سراپا کی طرف مبذول ہوتی ہے جو بظاہر

انسانی سراپا معلوم ہوتا ہے اور ہماری جانب بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ابتداءً ہم اس کو صاف طور پر نہیں دیکھ سکتے اور غور کرتے ہیں کہ یہ دور کا آنیوالا شخص کون ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کی بابت واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ یا اشتیاق ہمارے اندر ایک قسم کا تجسس پیدا کر دیتا ہے اور ہم غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ درمیان میں سوچنے بھی جاتے ہیں کہ اس آنے والے شخص کا سراپا کس سے مشابہ ہو سکتا ہے۔ یا اس وقت اس خاص جگہ پر کن اشخاص کے گذرنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ کچھ وقفہ کے بعد جب بُعد کم ہوتا ہے تو جسامت اور لباس اور وضع وقطع کے بارہ میں مشاہدہ متعین اور احساس یقین کے قریب تر ہونے لگتا ہے۔ تاہم ابھی ہم پہچاننے پر قادر نہیں ہوتے تاکہ آنے والے سراپا کو معلوم اشخاص میں سے کسی خاص شخص سے نسبت دے سکیں یا بالفاظِ دیگر نام متعین کر سکیں۔ گویا ابھی تک ہمارا قیاس احتمالات کو عبور کر کے یقین اور اعتبار کی سرحد میں داخل ہونے سے قاصر ہے۔

فاصلہ اور بھی کم ہو جاتا ہے، مشاہدہ دماغ سے غمازی کرتا ہے اور اب ہم فوراً شناخت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں دماغ معلوم کر لیتا ہے کہ یہ آنے والا شخص زید ہے۔ اس سے ہم گذشتہ موسم گرما میں فلاں جگہ کنارِ بحر پر متعارف ہوئے تھے اور شاید کسی سینما میں اور پھر ایک بار کشتی رانی کے سلسلہ میں بھی اس کے ساتھ چند گھنٹے گذارنے کا اتفاق ہوا تھا یہیں سے ہماری پہلی دماغی کشمکش پر ایک قسم کا احساسِ مسرت غالب آجاتا ہے اور گذشتہ تجربات کا جائزہ لینے کا دماغی تکدر جو ایک نامعلوم سے ہیجان اور اضطراب و نیز اشتیاق کا محرک ہوا تھا یکبارگی رفع ہو جاتا ہے فوراً ہی ہم ملاقاتی کو طعام یا سیر و تفریح کی دعوت دینے کی تجاویز پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ دفعتاً کسی ایسے معاہدۂ ملاقات کا خیال آجاتا ہے جس کے لئے ہم پہلے سے پابند ہیں اور جس کا ایفا اخلاقی فرض معلوم ہوتا ہے۔ اس موقع پر احساسات میں پھر ایک تموج اور ہیجان بپا ہوتا ہے حتیٰ کہ دماغ ضروری دلائل اور براہین پر غور کرتا ہوا ناقابلِ احساس عجلت کے ساتھ ہر دو نہج کے امکانات اور ان کے خوشگوار و ناخوشگوار نتائج کا جائزہ لیکر ایک بین بین راہِ عمل تلاش کر لیتا ہے

اس نوع کے تجربات ہر شخص کی زندگی میں پیش آتے ہیں مگر عام طور پر ان کا علم النفس کے معیار سے مطالعہ بہت کم کیا جاتا ہے۔ اگر تمثیلی واقعہ ہم میں سے کسی کے ساتھ بجنسہٖ پیش آئے تو تغیر احساسات اور کشمکشِ دماغی کے لطیف تجربات کا داخلی عنصر ہمارے ادراک سے دور رہ جاتا ہے۔ ہماری تمام تر توجہ خارجی حالات، اسباب و نتائج تک ہی محدود رہتی ہے یعنی یہ کہ آنے والا شخص کون ہے؟ ہمیں اسے کیا کہکر مخاطب کرنا چاہیے؟ ملاقات کے بعد کیسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟ وغیرہ وغیرہ۔ گویا دماغی مراحل سے گذرتے وقت ہم تمام تر تجویزِ عمل میں منہمک رہتے ہیں یا مقصودِ عمل پر نگاہ رکھتے ہیں۔ احساسات، افکار اور تدابیر کے دماغی پہلو سے ہمیں ادنیٰ دلچسپی بھی نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہمارے جملہ جذبات اور کارکردگی کے اضطراب کا محرکِ حقیقی یہی دماغی عنصر ہوتا ہے اور اسی کے احکامات کی تعمیل میں ہم سرگرداں ہوتے ہیں ہمارا تحت شعور ظاہری اور خارجی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اسے اسباب فعل اور تحریکات دماغ یعنی فاعل نفسیات سے سروکار نہیں ہوتا۔

اس کے بالکل برعکس علم النفس لاشعور کو شعور اور موثرات ظاہری کو مذاق فکر میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور مقتضی ہے کہ ہم خارجی تحریکات کا داخلی محرکات کی روشنی میں تجزیہ کریں چنانچہ فنی طور پر مذکورہ بالا مثالی واقعہ میں ہمیں صرف ان کیفیات پر غور کرنا چاہیئے تھا۔

(۱) کسی شخص کو اتفاقیہ طور پر اپنی سمت آتا ہوا دیکھ کر اس کی جانب متوجہ ہونے کی جبلی کیفیت

(۲) اس شخص کو پہچاننے میں تجسس اور اضطرار کی کیفیت اور اس کی ماہیت۔

(۳) حواسِ خمسہ میں سے کسی ایک یا زیادہ حواس پر محرکات کی نوعیت (جو زیر غور مثال میں اولاً صرف قوتِ باصرہ کی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے)

(۴) اس شخص کے بارہ میں احساسِ تیقن اور آگاہی حاصل کرنے کی فعلی کیفیت۔

(۵) غور و فکر اور قوتِ حافظہ کا جبلی استعمال جو "شناخت" کی حد تک رہنمائی کرتا ہے۔

(۶) داخلی کیفیات پر مسرت اور رنج کے اثرانداز ہونے کی تغیر پذیر کیفیت۔ اس کا لب و لہجہ

اور الفاظ و کلام پر تحت شعوری اثر۔

(۷) تدبر اور قوت فیصلہ کی باہمی کشمکش اور ان کا امتزاج اور اس کے بعد ضروری اقدام یعنی انتخابِ عمل۔

اس تجزیہ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ علم النفس دماغ کی جملہ تحریکات، مثلاً توجہ، ادراک، فکر، حافظہ، احساسات (پُر الم ہوں یا مسرت انگیز) تدبر اور انتخاب عمل کا ایک ایسا گہوارہ ترتیب دیتا ہے جس میں یہ تمام کیفیات اپنی جبلی خصوصیات کے ساتھ بے نقاب نظر آتی ہیں۔

کیفیات کا باہمی تعلق مذکورہ بالا تجربات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک بار پھر مثالی واقعہ کی طرف رجوع کیجئے اور اس پر غور کیجئے کہ مختلف احساسات میں ایک بیّن تناسب اور متوازن تسلسل قائم ہے۔ جملہ کیفیات یعنی توجہ، ادراک، فکر، حافظہ اور انتخاب عمل وغیرہ ایک دوسرے سے مخصوص نظم و نسق کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دلچسپی توجہ اور غور و فکر کا باعث ہوئی۔ توجہ، ادراک اور قوتِ امتیاز پر اثر انداز ہوئی۔ اگر دلچسپی پیدا نہ ہوتی تو ہم بدرجۂ شوق و اضطراب متوجہ نہ ہوتے۔ توجہ نہ ہوتی تو یہ بھی قرینِ قیاس تھا کہ ہم شخصِ متعلقہ کو پہچانے بغیر گذرتے چلے جاتے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شبیہ کے مسئلہ پر غور کرنا۔ قوت تخیل پر زور دینا۔ حافظہ اور غور و فکر سے کام لینا، شہود کی دریافت اور حتمی "شناخت" کے لئے کس قدر ضروری وسائل ہیں۔ مثال سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دلچسپی اور تجسس کا احساس مراحلِ بعد الوقوع، یعنی ادراک، فکر وغیرہ کے حق میں کتنا زود اثر ہے پھر یہ کہ اپنی اپنی جگہ پر ادراک، حافظہ اور فکر، جذباتِ مختلفہ کے مخصوص طور پر محرک ہوتے ہیں اور آخر کار جذبات کا یہی غلبہ فطری تدبر کی امداد سے قوتِ فیصلہ کے دروازے تک رہنمائی کرتا ہے۔ صحیح طور پر سوچیں تو یہ حقیقت فہم سے زیادہ دور نہیں رہ جاتی ہے کہ تدبیر اور انتخابِ عمل کا امتیازی جذبہ اس وقت بھی ہمارے تحتِ شعور میں کارفرما تھا جب مثالی شخص کے سراپا کی موجودگی کا اولین احساس پیدا ہوا تھا۔

فاعل نفسیات دماغ کی کیفیاتِ مختلفہ کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ایک اور امر بھی خاص طور

قابلِ غور ہے۔ سوال یہ ہے کہ مثالی واقعہ میں تمام عملی قوتیں یعنی احساس، ادراک، فکر، تمیز اور تدبیر وغیرہم فعل کی نسبت سے آخر کس سے متعلق ہیں؟ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ یہ سب ہماری اپنی ہی تحریکاتِ دماغ ہیں۔ کیونکہ ہم نے خود دیکھا، خود محسوس کیا، خود مسرور یا متردد ہوئے۔ خود ہی تدابیر کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ اخیر میں اپنے ہی فیصلہ سے کام لیکر خود ہم نے ایک مختص اور منتخب صورتِ عمل اختیار کی۔ لیکن اگر اب یہ پوچھ لیا جائے کہ یہ سب کچھ ہمیں معلوم کس طرح ہوا۔ ہم نے کیونکر یقین کر لیا کہ یہ جملہ کیفیات ہماری ہی ذات کے زیرِ اثر کام کر رہی تھیں یا بالفاظِ دیگر یہ سب ہمارے اپنے ہی افعال متعلقہ تھے تو جب تک ہم علم النفس کے حقائق سے کماحقہٗ آگاہ نہ ہوں، اس سوال کا جواب بجز تحیر اور خاموشی کے شاید ہی بن پڑے۔ تاہم اس عجز و تحیر کے باوصف ایک یقین ہے جو متزلزل نہیں ہو سکتا اور وہ یہ کہ ہماری ذات کے علاوہ کوئی بیرونی طاقت ہمارے ان تجربات کی محرک قرار نہیں دی جا سکتی۔ فی الحقیقت یہی ایک امر کہ کیفیاتِ مذکورہ کا دماغی تجربہ اور محل وقوع کا تصور ہمارے حواس اور حافظہ پر ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے ہمیں یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے ہی ذاتی افعال کا شیرازۂ ترکیبی تھا اور ہماری ذاتِ واحد کے علاوہ ان کیفیات کا جو ہمارے اپنے علم اور حافظہ میں محفوظ ہیں کوئی غیر "انا" فاعلِ حقیقی متصور نہیں ہو سکتا۔ بس یہی اندیشہ اور تحقیق علم النفس کی بنیاد ہے۔ اسی کو "تحقیقِ نفس" یا "فاعلی نقطۂ نگاہ" یا "ادراکِ داخلی" وغیرہ اصطلاحات سے معنون کیا جاتا ہے۔ بنابریں ذاتی افعال و تجربات کے واقعی ادراک کو "علم النفس" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

تحقیقِ اول | "علم النفس" مطالعہ و مشاہدہ کی جملہ کیفیات میں ربط، تناسب اور تسلسل دریافت کرنے کے علاوہ ان کیفیات کو ایک فاعلِ نفسیات سے وابستہ تصور کرتا ہے جس کو ہم میں سے ہر شخص اپنی نسبت سے "انا" یا "میں" یا "خود" یا "آپ" وغیرہ الفاظ سے منسوب کرتا ہے۔

تحقیقِ دوم | "علم النفس" ایک مستقل علم یا فن کا درجہ صرف اسی وقت حاصل کرتا ہے جب تمام

کیفیات کی قدروں کو فاعلِ نفسیات کے مطالعہ سے وابستہ سمجھا جائے۔ فنی طور پر علم النفس کے طالب علم کے لئے فاعلِ نفسیات کی کیفیاتِ فکر و احساس وغیرہ ہی مبادیات مطالعہ فراہم کرتی ہیں۔

شعور اور دماغ اب تک ہم نے صرف ان مختلف النوع کیفیات کا ذکر کیا ہے جو علم النفس کے مطالعہ میں آتی ہیں جیسے کیفیات توجہ، ادراک (بذریعہ حواسِ خمسہ) قوتِ حافظہ، فکر احساس، تدبیر، فیصلہ وغیرہ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہمیں ایسے اصطلاحی لفظ یا محاورہ کی بھی ضرورت ہے جو جملہ کیفیات مذکورہ کے معانی پر دلالت کرے۔ کیونکہ یہ پہلے ہی واضح ہو چکا ہے کہ علم النفس کے نظریہ کے ماتحت یہ تمام کیفیات ایک تناسب رشتۂ ارتباط میں منسلک ہیں۔ چنانچہ اس ارتباطِ باہمی کو جو مختلف کیفیات مذکورہ کے لئے بمنزلِ اتحاد کا مترادف ہے۔ اجمالاً "شعور" کے ایک لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا توجہ، ادراک، حافظہ، تخئیل، فکر، احساس، اور قوت فیصلہ وغیرہ کو شعور کے مختلف افعال کہا جاسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی جاندار یا بے جان شے کی طرف متوجہ ہونے۔ اس کے بارہ میں غور و فکر کرنے اور تخئیل و حافظہ پر زور دینے کو حرکاتِ شعور، یا افعالِ شعور کہا جاسکتا ہے۔ اور اس میں شئے متعلقہ کے کسی خاص جنس یا نوع سے وابستہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔ تاہم یہ کسی وقت فراموش نہ ہونا چاہئے کہ شعور کے افعالِ مختلفہ میں صاحبِ شعور وہی "انا" یا "میں" یا "آپ" ہوگا۔ کیونکہ مختلف افعال کا سرزد ہونا بہرحال ہماری اپنی ہی ذات سے متعلق سمجھا جائے گا۔ افعالِ شعور میں ہم ہی کارفرما نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے شعور کی کیفیاتِ مختلفہ کا امتحان ہو چکنے کے بعد اس کو وقوف اور شعور کا اہل تصور کیا گیا ہے اور بنابریں "عاقل" اور "صاحبِ دماغ" وغیرہ الفاظ سے منسوب کیا گیا ہے۔ "عقلی" یا "روحانی" وغیرہ الفاظِ صفت بھی حواس کے بارہ میں مستعمل ہیں انھیں تحریکاتِ دماغ یا افعالِ شعور کے ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر ان تحریکات و کیفیات کو "دماغی تحریکات" یا "افعالِ نفس" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

خصوصیاتِ دماغ | تحریکاتِ دماغ کی کیفیات مختلفہ پر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو ان کی متعدد انواع ضبطِ مطالعہ سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ ایک نوع کی کیفیات صاف طور پر دوسری اقسام سے خودبخود علیحدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اختلاف کا یہ ادراک ہمیں حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ادراک اور واقفیت کے جملہ اثرات حواسِ خمسہ کی وساطت سے درجۂ تحقیق کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ امر پوشیدہ نہیں رہتا کہ کیفیاتِ مختلفہ کا افتراق اہم نتائج کا حامل ہے۔ بایں ہمہ یہ احساسِ باطنی اپنی جگہ پر غیر متزلزل رہتا ہے کہ حواسِ مختلفہ کا استعمال دماغ پر اکثر اوقات ایک سے اثرات چھوڑتا ہے۔ مثلاً اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیلگوں آسمان کی دلفریبی اور گلاب کے پھول کی بھینی بھینی خوشبو میں ایک ربط و یگانگت ضرور ہے، یا یہ کہ گلاب کا نظر فریب اور خوشنما ہلکا گلابی رنگ، اس کی نازک پنکھڑیوں کا لمس اور خود پھول کی معطر لپٹیں اگرچہ اپنی اپنی جگہ "باصرہ" "لامسہ" اور "شامہ" حواسِ مختلفہ کے احساسات ہیں، تاہم مرکزی احساس یعنی دماغی موثرات کے لئے یکساں لطافت اور جاذبیت کے حامل ہیں، یہ تو حواسِ مختلفہ کی صورت ہے صرف ایک حس کی تحریکات میں بھی موثرات کا اہم اختلاف ممکن ہے۔ قوتِ شامہ ہی کو لیجئے۔ گلاب کا پھول سونگھنے اور ہینگ سونگھنے میں جو احساس کا اختلاف ہے وہ کتنا صریح ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ دونوں صورتوں میں سونگھنے کی تاثیر ناک کے ذریعہ ہوا سے حاصل کی جاتی ہے۔ اسی نسبت سے مختلف محسوساتِ شامہ اور دیگر حواسِ اربعہ کے لطیف اختلافات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ غور کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ حواسِ خمسہ کے جملہ اثرات "دماغ" کی نسبت سے محض ایک شعبۂ فعل سے متعلق ہیں۔ دماغ کے افعال دوسرے وسیع تر شعبوں میں بھی منقسم ہیں۔ ان میں سے ایک فکر ہی ہے جو کائنات کے موجود اور غیر موجود عوالم پر حاوی ہے اور اس کے ذرائع عمل میں حواسِ خمسہ کا درجہ محض ضمنی ہوتا ہے۔

فکر کے علاوہ ہماری وسیع دنیائے احساسات بھی ہے کہ اس کو تنظیمِ اعضا سے واسطہ ہے

نہ حواسِ خمسہ سے ان احساسات میں زیادہ ترذہنی اور خیالی بھی ہوتے ہیں جیسے وہ عمیق اور مقدس احساسات جو گذشتہ زمانہ کے شہدائے ملت اور عارفینِ امت کے حالات کے علم سے پیدا ہوتے ہیں اور خارج میں تحسین وآفرین اور تعظیم کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، یا وہ پُرالم جذبات جو ایامِ گذشتہ کی ناکامیوں اور حسرت ناکیوں کی یاد تازہ ہونے پر پیدا ہوتے ہیں۔ یا اس کے برعکس وہ خوشگوار اور دلپذیر احساسات جو عالمِ فراق میں محبوب کی خیالی تصویر پیش ہوجانے سے متحرک ہوتے ہیں۔ یا صبر و مسرت کے وہ ملے جلے معصوم جذبات جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہم کسی عزیز ترین مرحوم کی دائمی مفارقت کے رنج سے نڈھال ہوکر یکبارگی مذہبی معتقدات کا سہارا لیں اور اس کی ابدی شادمانی کا تخیل قائم کرنے لگیں وغیرہ وغیرہ

غرض خصوصیاتِ دماغ سے وہ مخصوص تحریکات مراد ہوتی ہیں جو عام طور پر ایک صائب دماغ میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اپنی پیچیدگیوں کے ساتھ آپس میں وابستہ بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ہم ادراک پر قادر نہیں ہوسکتے۔ اگر انتہائی صلاحیتِ عمل سے کام لیکر بیک وقت حافظ تخیل اور فکر سے کام نہ لے چکے ہوں۔ یا اگر ہم چاہیں کہ "فکر" سے "حافظہ" کے بغیر کام لیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اور جب تک ہم "حافظہ" اور "فکر" دونوں پر زور نہ دیں تدبیر اور فیصلہ کی حد تک پہنچنا بالکل ہی ناممکن ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ان جداگانہ خصوصیات اور کیفیات کا مرکز یعنی دماغ ایک ہی ہے۔ حقیقت میں وہ ہماری ہی ذات ہے جو ادراک، حافظہ، تخیل، فکر احساس، فیصلہ وغیرہ افعال کی فاعلِ حقیقی ہے۔ لہذا خصوصیاتِ دماغ سے بجز دماغی تحریکات کے انواع واقسام کے اور کچھ مراد نہیں لیا جا سکتا۔

اگر ہم اپنے دماغ کی کسی ایک کیفیت پر غور کریں یا شعور کی چند مخصوص تحریکات کا مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوجائے گا کہ ہر وقت ہم تین حالتوں میں سے ایک کے زیر اثر ضرور رہتے ہیں یعنی مدام ہم کسی نہ کسی شے کے بارہ میں غور و فکر کرتے ہوئے یا کسی نہ کسی احساس سے متاثر یا کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے ضرور پائے جائیں گے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکر، احساس اور خواہش فعل ہی

ہمارے دماغی تحریکات کے تین بنیادی مراحل ہیں۔ کبھی ہماری فراستِ ذہنی نمایاں پائی جاتی ہے کبھی کیفیتِ احساس غالب ہوتی ہے اور کبھی خواہشِ عمل زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔

اصولِ مطالعہ | دیگر علوم کی طرح "علم النفس" بھی ترتیبِ مطالعہ کا مقتضی ہے لیکن جیسے یہاں موضوعاتِ مطالعہ دوسرے علوم سے علیحدہ ہیں اسی طور پر اسلوبِ مطالعہ میں بھی تخصیص وتفریق لازم ہے۔ ہمیں اولاً موضوع کی ماہیت پر غور کرنا چاہیئے اور پھر ان کیفیات نفس کے مدارج متعین کرنے چاہئیں جنھیں لوازماتِ مطالعہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور انھیں تعینات کے ماتحت تفصیل وتشریح پر زور دینا چاہیئے۔ مگر بیانِ واقعات یا موضوع کے مدارج میں ترتیب قائم رکھنا اور کیفیاتِ مطالعہ کی توضیح میں ضروری تنظیم قائم رکھنا ازبس ضروری ہے یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے مطالعہ کے اسلوب یعنی اندازِ فکر میں فنی احتیاط مدنظر رکھی جائے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ہماری کیفیاتِ شعور کا بجز ہمارے اور کوئی شخص صحیح اندازہ نہیں لگاسکتا ہے۔ یہ محض ہمارے اپنے باطنی احساسات وتجربات ہوتے ہیں اور صرف ہم پر ہی روشن ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ہر شخص کی داخلی زندگی کی یہی کیفیات سمجھنی چاہیئے۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص ہماری ظاہری حالت پر گمان کرکے یا خود ہمارے بتلانے سے یہ اندازہ لگاسکے کہ اس وقت ہم شدید سر کے درد میں مبتلا ہیں، یا ہماری ڈاڑھ میں درد ہے۔ یا اب ہم اپنے کسی عزیز دوست کے آنے کی امید میں مسرور بیٹھے ہیں۔ لیکن تکلیف ومسرت کے وقتی تغیرات ہماری ذات کے علاوہ کسی دوسرے پر واضح نہیں ہوسکتے۔ حاضرین ہمارے چہرہ پر احساسِ شرمندگی یا شرم وحیا کے لطیف ارتعاشات دیکھ سکتے ہیں اور اس مشاہدہ کو اپنے ذاتی تجربات سے مطابقت دیکر کیفیات کے تغیر کا اندازہ بھی لگاسکتے ہیں۔ مگر ہماری شرم، خوف، یا غصہ کی داخلی واردات کا ان پر کماحقہ اظہار ہونا ممکن نہیں ہے۔ ہم خود اپنی حقیقی کیفیاتِ شعور سے تحریر وتقریر کے ذریعہ (یعنی بیان ولسان) دوسروں کو مطلع کرسکتے ہیں مگر تمام ذی روح موجودات میں محض ہماری ذات واحد ہی ہمارے

اپنے افعالِ شعور کے صحیح علم پر قادر ہو سکتی ہے۔

علمِ ذات یا احساسِ باطنی | دماغی تحریکات کا یہی فوری احساس علمِ ذات کہلاتا ہے۔ علم النفس کا موضوع اور کیفیات مطالعہ پر غور و فکر کرنے کا اس کے علاوہ کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ احساس کی کیفیاتِ مختلفہ کو کیفیات شعور یا افعالِ شعور کہا جاتا ہے انھیں کیفیات کو فاعلی تحریکات بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جملہ کیفیات کا فاعل ایک ہی "ذات" یا "عقل" کو سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا ہے ہر علم کا مطالعہ اور غور و فکر کا طریقہ اس کے موضوع اور کیفیاتِ مطالعہ کی نوعیت پر مبنی ہوتا ہے۔ علم النفس کے مطالعہ کا اصول فاعلِ کیفیات کے مطالعہ پر منحصر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے احساسات۔ فکر و تدبر وغیرہ سے متعلقہ تحریکات کا فوری علم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن محرکاتِ فعل اور اساسِ فکر کا علم فاعلِ نفسیات کے علاوہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس فاعلِ نفسیات کے لئے علمِ ذات عینی شاہد کے مانند ہوتا ہے اور اس کے افعالِ شعور چشم دید کیفیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن دوسرے محرکاتِ شعور کے صرف خارجی اثرات ہی سے آگاہی بہم پہنچا سکتے ہیں۔

ذرائع معلومات | کیفیاتِ شعور کے بارہ میں فکر کرنا ہی علم النفس کے مطالعہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ اکثر افراد اپنی دماغی تحریکات پر اتنی کم توجہ دیتے ہیں کہ کیفیاتِ شعور کے داخلی عنصر تک رسائی مشکل ہوتی ہے۔ ان کیفیات کی خصوصیات اور تفصیل پر قادر ہونا تو بہت بعد کا درجہ ہے۔ دیگر علوم کی طرح علم النفس کے بارہ میں بھی ہمیں خصوصی غور و فکر کی ضرورت ہے اور یہ مخصوص ذوقِ فکر عموماً انداز فکر ترتیب کرنے سے پیدا کیا جا سکتا ہے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ تربیت کے بارآور ہونے میں فطری صلاحیت اور استعداد کو بھی کافی دخل ہے تاہم اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ علم النفس کے حصول میں کچھ لوگ فطرۃً مجبور ہیں۔ نہیں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ بلکہ بیشتر اوقات خود اشخاص ہی احساس باطنی کی عملی مزاولت سے مجتنب رہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ تکمیلِ فکر میں اس کی کس قدر ضرورت ہے۔

یہی سبب ہے کہ چند اشخاص غور و فکر، طرز بیان۔ علوئے کردار یعنی اپنی تحریکاتِ شعور کی پیچیدگیوں کے حل کرنے میں خاص مہارت حاصل کر لیتے ہیں اور ہم میں سے اکثر اس سے قاصر رہتے ہیں۔ اپنے افعالِ شعور سے کماحقہ واقفیت بہم پہنچانے کے بعد یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ نفسیات کے ماہرین، لوگوں کی خارجی کیفیات کے انداز و تجربہ پر خود فاعلِ نفسیات کے افعال کا احاطہ کرنے پر قادر ہو جائیں۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ انسان نادانستہ طور پر اپنی داخلی کیفیاتِ شعور کے مختلف افعال کو خارجی اثرات کے ذریعہ ظاہر کرتا رہتا ہے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے کسی دوسرے شخص کے باطنی احساسات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کی گفتار و کردار (خارجی اثرات) دوسروں کو اس کے افعالِ شعور یا تحریکاتِ دماغ کی ارتقائی ماہیت سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اور شعور کے جملہ انکشافات علم النفس کے طالب علم کے لئے ذرائع معلومات کے مترادف ہیں۔ چونکہ انسان کے اقوال و افعال کیفیاتِ دماغ کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں اس لئے علم النفس کے مطالعہ کے لئے نہ صرف بالغ انسان بلکہ بچے بھی اور نہ صرف انسانِ محض بلکہ کم حیثیت جانور بھی اہم وسائل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے لئے ایک مخبوط العقل۔ سودائی، شرابی یا جرائم پیشہ انسان (سوتا ہو یا جاگتا ہو) ہر حال میں مطالعہ کے لئے اہم مواد پہنچاتا ہے۔ علم النفس، انسانیت کی ناشائستہ اور ناخوشگوار حرکات سے بھی یہی حقائقِ درس حاصل کرتا ہے جو اس کے الوہی کردار سے۔ یہی درجہ انواعِ ادب کا ہے کہ فی الحاصل بھی انسانی ادراک و افکار کا مظہر ہیں۔

اصولِ ترتیب | تحریکاتِ دماغ کی مختلف کیفیات اور ان کے انواع کی تفصیل و تشریح کو علم النفس کے لئے ضروریاتِ مطالعہ سمجھنا چاہئے۔ فنی تشریحات کے لئے دوسرے علوم کی طرح یہاں بھی دعاوی اور امورِ قیاسی کا استعمال جائز ہے۔ مختلف کیفیاتِ شعور کا اصولی مطالعہ کر کے قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔ تجربات و امثلہ کے ذریعہ ان قوانین کی جانچ

کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی طور سے تدریجاً تحریکاتِ دماغ کا ایک مکمل نقشہ مرتب کر لیا جاتا ہے جو جملہ کیفیات کی تحقیق و تدوین میں فنی کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

تعریف | اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ مختصراً مندرجہ ذیل تعریف کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"علم النفس وہ علم ہے جو دماغی تحریکات یا افعالِ شعور سے بحث کرے اور اس فاعلِ نفسیات کی داخلی تحریکات کا آئینہ ہو جسے عام طور پر "ذات" یا "عقل" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے"

تشریح اس کی یہ ہے کہ علم النفس ایک مکمل علم کی حیثیت سے نہ صرف واقعات و کیفیات کا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہے اس کی تحقیق نہ صرف صورتِ واقعات اور دماغی تحریکات کے باہمی حالات کی تشریح تک محدود ہوتی بلکہ کیفیاتِ مختلفہ کے داخلی اسباب و علل، تحریکاتِ ذہنی کی تفصیل و توضیح ان کا باہمی تناسب اور تسلسلِ فعل و نیز یہ امر کہ دقیق اور پیچیدہ منتہی کیفیات ابتدائی اور سہل واقعات پر کیونکر مبنی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ سب ضروری موضوعاتِ مطالعہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ گویا دماغی تحریکات کے نشو و نما اور افعالِ شعور کی تشریح و توضیح کو علم النفس کا فنی مطمحِ نظر سمجھنا چاہیے۔

برہان کے چند نمبروں کی ضرورت

دفتر کو مارچ ۱۹۴۶ء اور جون ۱۹۴۴ء کے پرچوں کی ضرورت ہے جو صاحب فروخت کرنا چاہیں مطلع فرمائیں۔ ان کی خدمت میں قیمت پیش کر دی جائیگی

ادبیات

نہیں رہے

از جناب ماہرالقادری

اب جوشِ اضطراب کے ساماں نہیں رہے — ساحل کو ہے گلہ کہ وہ طوفاں نہیں رہے
خونِ جگر سے کھیلنے والے کہاں گئے؟ — قطرے لہو کے زینتِ داماں نہیں رہے
جن کے جنوں پہ ناز تھا فصلِ بہار کو — وہ عاشقانِ چاک گریباں نہیں رہے
پھولوں میں نازکی ہے نہ کانٹوں میں سختیاں — صحرا نہیں رہے وہ گلستاں نہیں رہے
جن کے حضور سطوتِ کسریٰ تھی سجدہ ریز — وہ بوریا نشین سلیماں نہیں رہے
تیغوں کے زخم دب گئے اچھا یوں ہی سہی — سجدوں کے داغ بھی تو نمایاں نہیں رہے
دھندلے سے کچھ نقوش ہیں سرمایۂ ضمیر — ایماں کے چراغ فروزاں نہیں رہے
جن کی نشید نغمۂ بیدار بن گئی — وہ کاروانِ دل کے حدی خواں نہیں رہے
تھی جن کی فکر حاصلِ پروازِ جبرئیلؑ — وہ حاملانِ مفتیِٔ قرآں نہیں رہے

جن کے لئے تھی "انتم الاعلون" کی نوید
اللہ کیا ہوا وہ مسلماں نہیں رہے

تبرکات

حضرت شیخ الہند مرحوم کے چند اشعار

مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب راندیری کے والد ماجد حافظ قاری اسمٰعیل صاحب راندیری ایک مقدس اور خدا ترس بزرگ تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے ۱۳۲۸ھ والے عظیم الشان جلسہ دستار بندی کا افتتاح حافظ صاحب ہی کی قرارت سے کیا گیا تھا جب حافظ صاحب کا انتقال ہوا تو حضرت شیخ الہند مرحوم نے چند اشعار اظہار غم میں لکھے تھے جو حضرت شیخ الہند کے تبرک ہونے کی وجہ سے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں

عالم و حافظ و وجیہ و نبیہ — نیک خو نیک رو فرشتہ شیم
آج دار البقا کو جاتے ہیں — چھوڑ کر سب کو مبتلائے الم
غربا کے لئے ہے یوم عسیر — ہو مبارک انھیں نعیم دائم
ہے مساجد میں یاس اور حسرت — اور مدارس میں چھا رہا ہے غم
فقراء کے لئے تھا آب بقا — خضر تھا بہر اہل جود و کرم
آج مسکین یتیم رہ گئے حیف — اور یتامیٰ ہیں مسکنت توام
سنتا تھا دور سے صدائے ضعیف — تھا تو حاتم مگر نہیں تھا اصم
دم عیسیٰ و لحن داؤدی — چھپ گئے ہائے زیر کتم عدم
فکر سال وفات ہے بے سود — ہے ہر ایک دل پہ سانحہ یہ رقم

ہاتھ سے ہیں اجل کے بے سرو پا
فضل و علم و تقا و ورع و کرم

۱۳۳۰ھ

ولہ ایضاً رحمۃ اللہ

تقیؒ و نقیؒ و سمیؒ ذبیح — چو زیر کفن چہرۂ خود نہفت
ز روئے بکا سال او ہاتفے — ثمال المساکین قدمات گفت

۱۳۳۰ھ

تبصرے

انگریزی ترجمہ پارۂ سیقول | شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور تقطیع کلاں قیمت عمار

کم و بیش دو سال ہوئے کہ برہان کے صفحات میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے انگریزی ترجمہ پارۂ الم پر تبصرہ ہو چکا ہے۔ اب ہمیں اس سلسلہ کا دوسرا پارہ برائے تبصرہ موصول ہوا ہے۔ فاضل مترجم کے ترجمہ کی تمام خصوصیات اس میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں یعنی صحیح اور درست ترجمہ (عقائد صحیحہ کے مطابق) حواشی میں تشریحی اور توضیحی نوٹ مثلاً ضمیروں کے مراجع، ابہام اجمال کی بقدر ضرورت تفصیل۔ اختلافی مسائل میں مسلکِ حق کی ترجیح۔ جگہ جگہ مستند حوالوں کی روشنی میں قرآن مجید اور اسلام کے احکام و مسائل کا مقابلہ و موازنہ، دوسرے مذاہب کے احکام و مسائل کے ساتھ۔ تمدنی اور تاریخی مباحث پر مختصر لیکن مفید تبصرہ۔ اتنے بڑے اور وسیع کام کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے کسی ایک جز یا حصہ سے بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے مثلاً خنزیر کے متعلق مولانا نے کسی ایک نامعلوم مصنف کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ یہ لفظ قذرالشی سے مشتق ہے ایک ایسی بات ہے جسے مشکل سے ہی باور کیا جا سکتا ہے۔ پھر ہمیں اس موقع پر یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مولانا نے ترجمہ کے لئے جو بائبل کی زبان استعمال کی ہے اس کی بجائے ترجمہ کے مقصد کے پیشِ نظر یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ آج کل کی متداول اور معروف زبان استعمال کرتے۔ ایک انگریزی داں کو اس کے سمجھنے اور اس سے مطلب اخذ کرنے میں بڑی سہولت ہوتی چنانچہ آج کل اہل یورپ خود بائبل کو موجودہ مروج زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں بعض کوششیں ہو بھی چکی ہیں۔ بہرحال جہاں تک ترجمہ اور مطالب کی تشریح و توضیح کا تعلق ہے۔ اس ترجمہ پر بے تکلف اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

امید ہے کہ تاج کمپنی اب باقی حصوں کی اشاعت میں زیادہ تاخیر نہ کریگی۔

محمد علی جناح کا ایک سیاسی مطالعہ (انگریزی) از مطلوب حسین سید صاحب۔ شائع کردہ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔ ضخامت ۹۳۱ صفحات ٹائپ جلی اور روشن۔ قیمت ۱۲/۸/۹

مسٹر جناح ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کے مسلمہ لیڈر ہیں۔ اور ان کا یہ کمال واقعی داد طلب ہے کہ وہ جس طرح شروع میں "مسٹر جناح" تھے بعینہ اسی طرح اب بھی "مسٹر جناح" ہی ہیں اور اس کے باوجود مسلمانوں نے ان کو اپنا "قائد اعظم" تسلیم کر لیا ہے ورنہ مسلمانانِ ہند کی مذہب پرستی کا ہمیشہ یہ عالم رہا ہے کہ مسٹر محمد علی جوہر اور مسٹر شوکت علی نے مسلمانوں کی قیادت کا بارِ گراں اپنے دوش پر اٹھایا تو وہ مسٹر سے "مولانا" بن گئے۔ اور ان کی آزاد زندگی مذہبیت کے سانچہ میں ڈھل گئی۔

مصنف نے یہ کتاب جس عقیدت اور ارادت سے لکھی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ شروع میں کتاب کو اپنی بیوی کے نام سے معنون کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں یہ کتاب اپنی بیوی زلیخا کے نام معنون کرتا ہوں جس نے اپنے چھوٹے بچہ فرید کی تعلیم و تربیت کے لئے تین نمونوں کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ ایک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے علی (رضی اللہ عنہ) اور تیسرے جناح۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے علم و حکمت کا چراغ روشن کیا دوسرے نے اپنی بہادری اور مردانگی سے اس کی حفاظت کی۔ اور تیسرے (جناح) نے اس بد قسمت ملک میں اس چراغ کو گل ہونے سے بچا لیا۔"

بہر حال کتاب بڑی محنت و جانفشانی اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے مسٹر جناح کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی گذشتہ پچاس سال کی سیاست اس کے نشیب و فراز۔ اور خصوصاً فرقہ وارانہ کشمکش کی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ اس کا مطالعہ ہر ایک موافق و مخالف کے لئے مفید ہو گا۔ شروع میں بنگال کے سابق وزیر اعظم سر خواجہ ناظم الدین کا مقدمہ ہے۔

Glimpses of Islam از پرنس آغا خاں و ڈاکٹر ذکی علی صفحات ۲، تقطیع خورد ٹائپ جلی اور روشن قیمت عہ پتہ: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور

یہ کتاب اگرچہ بقامت کہتر ہے لیکن اس کے بقیمت بہتر ہونے میں شبہ نہیں۔ جیسا کہ شروع میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مقصد یورپ والوں کو یہ بتانا ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں اور وہ ایک عالمگیر نظام امن کے قائم کرنے میں انسانیت کی کیسی کچھ عظیم الشان خدمات انجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے پرنس آغا خاں کا ایک مختصر سا مقالہ ہے جس میں انھوں نے اسماعیلی المسلک ہونے کے باوجود سنی نقطۂ نظر سے توحید و رسالت اور فرشتہ و روح اور دوسرے چند مسائل سے متعلق اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد کے دو ابواب ڈاکٹر ذکی علی کے لکھے ہوئے ہیں جو اپنی کتاب Islam in the world. کی وجہ سے علمی حلقوں میں معروف ہیں۔ ان ابواب میں مصنف نے نہایت عمدگی اور جامعیت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں نے طبی علوم و فنون کو ترقی دینے میں کیا کچھ کیا ہے اور پھر دنیائے اسلام میں نشاۃ ثانیہ کے جو آثار پائے جاتے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔

المختصر از جناب ڈاکٹر سید محمد اظہر علی صاحب ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی (کینٹب) صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو دہلی یونیورسٹی۔ ضخامت ۱۵۹ صفحات تقطیع کلاں کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ مکتبہ جہاں نما۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی

اردو زبان میں فنِ بدیع اور عروض پر الگ الگ کئی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ترجمہ حدائق البلاغت از مولانا صہبائی اور تذکرۃ البلاغت از مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم ہیں۔ پھر مولانا نجم الغنی صاحب کی بحر الفصاحت کا نمبر آتا ہے لیکن ان میں بڑا نقص یہ ہے کہ ایک تو طوالت اور اطناب بہت زیادہ ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی زبان آج کل کے مذاق کے مطابق عام فہم اور سلیس و رواں نہیں ہے۔ علاوہ بریں ان کتابوں میں جن اشعار سے استشہاد کیا گیا ہے وہ شگفتہ اور برجستہ نہیں ہیں۔ اس بنا پر یونیورسٹیوں کے طلبائے فارسی و اردو کی ضرورت کے

پیش نظر ایک ایسی کتاب کی کمی محسوس ہوتی تھی جس میں فن بدیع اور عروض دونوں یکجا ہوں اور جو زبان و بیان اور اندازِ تفہیم کے اعتبار سے مذاقِ حال کے مطابق ہو۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہی زیرِ تبصرہ کتاب تالیف کی ہے اور چونکہ وہ دہلی یونیورسٹی کے پرانے استاذ السنۂ شرقیہ ہونے کے باعث اس سلسلہ میں طلبا کی ضرورتوں کا کافی احساس و تجربہ رکھتے ہیں اس بنا پر مقصد تالیف کے اعتبار سے یہ کتاب بہمہ جہت کامیاب ہے، زبان و بیان شگفتہ اور سلیس اور مثالیں دلچسپ و دلنشیں ہیں۔ امید ہے کہ یونیورسٹیوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلبا اس کی قدر کریں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔ البتہ یہ دیکھکر بڑا افسوس ہوا کہ کتاب میں کتابت اور طباعت کی فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اگرچہ صحت نامہ ملحق کر دیا گیا ہے تاہم بڑی ضرورت ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان دونوں باتوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔

عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ایم، اے۔ پی۔ ایچ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن تقطیع متوسط ضخامت ۳۱۷ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸؎ پتہ :۔ مکتبہ جامعہ دہلی

اس کتاب کے فاضل مصنف جامعہ عثمانیہ میں قانون اور سیاست کے استاد ہونے کے ساتھ عہدِ نبوی کی سیاسی تاریخ کے مشہور فاضل اور محقق ہیں۔ اس سلسلہ میں موصوف کی کتاب "الوثائق السیاسیۃ" حال میں ہی مصر سے چھپ کر آئی ہے اور ہماری نظر سے گذری ہے۔ کئی سال ہوئے موصوف نے عہدِ نبوی کے نظامِ حکمرانی کے مختلف عنوانات و مباحث پر اسلامک کلچر حیدر آباد میں مسلسل چند مضامین لکھے تھے پھر انھیں کا اردو ترجمہ کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ معارف اعظم گڈھ میں بھی شائع ہوا تھا اب یہی مضامین چند اور مضامین کے ساتھ جو بعض انجمنوں اور جلسوں میں پڑھے گئے تھے کتابی شکل میں چھاپ دیئے گئے ہیں۔ کتاب کا موضوع نہایت وسیع اور مختلف الجہات ہے۔ اس بنا پر کتاب کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب جلد اول ہے جس میں چند اصولی مباحث کے علاوہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی تک کے حالات آگئے ہیں۔ کتاب بہت

بصیرت افروز اور پُراز معلومات ہے اور اس کا مطالعہ بے شبہ فائدہ کا باعث ہوگا۔ لیکن چونکہ فاضل مصنف کے بعض مقالات ایسے بھی شامل کردیئے گئے جو وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی جلسہ میں پڑھنے کے لئے لکھے گئے تھے۔ اس بنا پر کتاب میں بحیثیتِ مجموعی وہ یکسانیت اور نظم و ترتیب نہیں ہے جو ایک سنجیدہ اور ٹھوس علمی کتاب کے لئے ضروری ہے امید ہے ڈاکٹر صاحب ان پر نظرِ ثانی فرماکر اس خامی کو دور کردیں گے۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت | تقطیع خورد ضخامت ۱۶ صفحات کتابت وطباعت متوسط قیمت ۲ ر پتہ:۔ ادارۂ دعوت الحق بیگم بازار کوچہ گھانس منڈی حیدرآباد دکن

یہ دراصل ایک مختصر سا خطبہ ہے جو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کسی جلسہ میں پڑھا تھا اور بعد میں مختلف رسائل میں شائع ہوا اس میں مولانا نے سورۂ فاتحہ کو بنیاد قرار دیکر یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق قوم ضال اور مغضوب علیہم کون لوگ ہیں اور ان کے خصوصیات کیا ہیں پھر یہ کہ مسلمان کی خصوصیات کیا ہیں اور اسے کیسا ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں فاضل خطیب نے دعوت دی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد کا نقطۂ مقصود کسی باطل کی حمایت نہیں بلکہ دنیا میں الٰہی قوانین کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ نفاذ کیونکر ہو؟ اور خود مسلمانوں کو ان قوانین کا پابند کیونکر بنایا جاسکتا ہے؟ بہتر ہوتا کہ ان پر بھی روشنی ڈالی جاتی۔ کیونکہ جہاں تک اصل مقصد کا تعلق ہے کوئی مسلمان بحیثیت مسلمان اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے طریق کار میں ہے۔

رسالوں کے خاص نمبر

شاعر کا افسانہ نمبر | مرتبہ جناب اعجاز صدیقی ضخامت ۱۶۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ۔ دفتر رسالہ شاعر آگرہ۔

یہ آگرہ کے مشہور اور پرانے ادبی رسالہ شاعر کا خاص نمبر ہے لیکن اس میں جدت یہ کی گئی ہے کہ تمام افسانے خواتین کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ افسانے جن میں بعض منظوم بھی ہیں گنتی میں ۲۹ ہیں اور ان کے بیک وقت مطالعہ سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ چند برسوں میں ہی ہماری

خواتین نے افسانہ نگاری کی دنیا میں کتنی ترقی کرلی ہے۔ بعض بعض خواتین کے طرزِ نگارش پر "مردانہ پن" یا مغربی ادب کا اثر غالب نظر آیا لیکن یہ آج کل کی نئی پود کا ایک عام رجحان ہے اور صنفِ لطیف تو انفعال و تاثر کی فطرۃً زیادہ صلاحیت رکھتی ہی ہیں۔ پھر اڈیٹر صاحب نے ایک امر یہ کی ہے کہ ان خواتین سے خود ان کے اپنے حالات اور اپنے انداز افسانہ نویسی پر تبصرہ لکھوایا ہے یہ چھوٹے بڑے ہر خاتون کے اپنے سوانحی نوٹ بذاتِ خود ایک افسانہ ہیں جس کے باریک اور لطیف پردہ کے پیچھے سے نسوانی فطرت اپنی بوقلموں خصوصیات و کیفیات کی غمازی کررہی ہے یہ نمبر بحیثیتِ مجموعی بہت دلچسپ دلکش اور لائق مطالعہ ہے۔ جن بہنوں کے افسانوں میں دماغی بحران یا ایک لاشعوری کیفیت "نیم خوابیدگی" پائی جاتی ہے۔ امید ہے کہ مستقبل کے تجرباتِ زندگی اگر ان کی فطرت سلیم ہے تو انھیں خود کسی ایک پائدار شاہراہِ زندگی پر ڈال دیں گے۔

سالنامہ آجکل سال چہارم نمبر ا | مرتبہ آغا محمد یعقوب صاحب دواشی۔ "آجکل" اردو زبان کا سنجیدہ معلوماتی اور ادبی پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ زیر تبصرہ نمبر اس رسالہ کا سالنامہ ہے جو بڑی تقطیع کے ۱۵۲ صفحات پر بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ عمدہ کاغذ پر بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ اس میں علمی تاریخی تنقیدی۔ معاشیاتی اور سوانحی ہر قسم کے مضامین و مقالات ہیں ان کے علاوہ دو ڈرامے اور پندرہ افسانے بھی ہیں حصۂ نظم میں بھی کافی تنوع اور رنگارنگی ہے لکھنے والوں میں زیادہ تر مشاہیر ارباب قلم اور معروف اصحاب علم وادب شامل ہیں یہ نمبر ہر حیثیت سے معیاری اور ادب العالیہ کا ایک پیکر لطیف کہا جاسکتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ادبِ جدید کی گندگیوں سے بالکل محفوظ ہے۔ تاریخی مضامین میں "افغانستان کی چند سنسکرتی تحریریں" "امیر تیمور گورگانی کا خط بنام شاہِ فرانس" (مصور) "باڈلین لائبریری اور اس کا بانی" سوانح میں "رضیہ سلطان کی خانگی زندگی" تنقیدی مقالات میں "نئے افسانے کا فنی پس منظر" "پشتو شاعری کے جدید رجحانات" خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں۔ ڈراموں اور افسانوں میں "فن کار" "آزاد خیال" "سانس" اور "فلسفہ تبسم" بہت دلچسپ ور لائق مطالعہ ہیں۔ ٹائٹل پیج بہت خوبصورت، متعدد تصویریں اور فوٹو بھی ہیں قیمت عہ جو واقعی کم ہے پتہ:۔ ادارہ مطبوعات متحدہ ۵ سٹ مکس نمبر ۱۶۶ دہلی

سنہ ۴۲ء: قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ: تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں قیمت ہے مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ [illegible]

سنہ ۴۳ء: مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ ورفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت: صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپئے مجلد سات روپئے۔

خلافتِ بنی امیہ: تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات ہے مجلد [illegible]

سنہ ۴۴ء: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

سنہ ۴۵ء: قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دلنشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اسی طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد ؎

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء کے حالات مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد [illegible]

انقلابِ روس۔ انقلاب روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد [illegible]

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No.L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسنِ خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت، معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا:۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱۰ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء:۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جن میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ۳؎ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۲؎ مجلد ۸؎

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳؎ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۴؎

۱۹۳۹ء:۔ نبی عربی صلعم:۔ تاریخِ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت ۱؎

فہم قرآن جدید ایڈیشن:۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بےمثل کتاب قیمت ۲؎ مجلد ۳؎

غلامانِ اسلام:۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت ۵؎ مجلد ۶؎

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۵؎ مجلد ۶؎

۱۹۴۱ء:۔ قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت ۵؎ مجلد ۶؎

بین الاقوامی سیاسی معلومات:۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت ۲؎

وحیِ الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ۳؎

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت ۲؎

برہان

جلد ششدہم　　　　شمارہ (۶)

جون ۱۹۴۶ء مطابق رجب المرجب ۱۳۶۵ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۳۲۲
۲۔ حدیث افتراقِ امت	جناب مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی	۳۲۵
۳۔ اسلامی روایات اور ان کا تحفظ	پروفیسر سید محمد جمیل صاحب واسطی ایم، اے	۳۵۴
۴۔ اقبال اور آرزوئے نایافت	مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی	۳۶۰
۵۔ عبداللہ بن المعتز	مولوی حافظ رشید احمد صاحب ارشد ایم اے	۳۶۷
۶۔ ادبیات		
سوزِ تمام ۔ فکرِ نو	جناب ماہر القادری	۳۷۶
یک رنگی	جناب الم مظفر نگری	۳۷۷
عرضِ نیاز	جناب عامر عثمانی	۳۷۸
۷۔ تبصرے	م ۔ ح	۳۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور دارالعلوم دیوبند یہی دو مرکزی تعلیمی ادارے ہیں جن کا مسلمانانِ ہند کی موجودہ قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں بہت بڑا حصہ ہے لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ بوجوہ چند جن کا اس موقع پر تذکرہ کرنا غیر ضروری ہے" ادھر کچھ دنوں سے دونوں کے حالات بہت کچھ اصلاح طلب اور اربابِ رائے و عمل کی فوری توجہ کے مستحق ہو گئے ہیں۔ کسی تعلیمی ادارہ کی اصل روح صرف دو چیزیں ہیں۔ ایک بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام اور دوسرے طلبا میں ڈسپلن اگر یہ دونوں چیزیں مفقود ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ ادارہ اپنے مقصد وجود کو فوت کر بیٹھے گا اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ ادارہ سے ملک و قوم کو جو فوائد حاصل ہونا چاہئے تھے وہ حاصل نہیں ہوں گے بلکہ ردِ عمل کے اصول کے مطابق جو نوجوان نسلیں اس بے راہ روی کی آب و ہوا میں نشو و نما پائیں گی وہ قوم کے لئے ایک مستقل جرثومۂ ہلاکت و بربادی کا کام کریں گی۔

جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب تک اس تعلیم کے ساتھ روحانی تعلیم و تربیت کا علاقہ چولی دامن کا سا رہا ہے۔ پہلے زمانہ میں کسی دینی درسگاہ کا استاد صرف کتابیں نہیں پڑھاتا تھا بلکہ وہ روحانی معلم اور اخلاقی مربی اور خود اسلامی فضائل و اخلاق کا پیکر ہوتا تھا۔ طلبا درس سے خارج اوقات میں بھی اس کی صحبت میں بیٹھکر استفادہ کرتے تھے اس بنا پر ایک طرف طلبا میں مذاقِ علمی پختہ ہو جاتا تھا اور دوسری جانب شاگرد استاد کے اخلاقی محاسن و مکارم کا اثر قبول کر کے خود اسی رنگ میں رنگے جاتے تھے لیکن آج کے حالات بالکل دگرگوں ہیں۔ دینی مدارس بھی دوسری دنیوی درسگاہوں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کے قواعد

ضوابط بنائے جاتے ہیں لیکن اسے کوئی نہیں دیکھتا کہ طلبا میں ڈسپلن اگر قائم رہ سکتا ہے تو صرف اساتذہ کی لیاقت وقابلیت اور ان کی اخلاقی عظمت و برتری اور مضبوط کیرکٹر کے ذریعہ ہی رہ سکتا ہے۔

ہمارے علمار اور زعمار جن کے تدبر کی انگلی زمانہ کی نبض پر ہے ایک عرصہ سے محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارا نظامِ تعلیم (خواہ وہ تعلیم دینی ہو یا دنیوی) بہت سے نقائص سے پر ہے اور جب تک اس میں خاطر خواہ تبدیلیاں نہ کی جائیں گی ہماری قومی ضرورتیں پوری نہ ہوں گی لیکن یہ دیکھ کر بڑا رنج اور دکھ ہوتا ہے کہ اس عام احساس کے باوجود اب تک اس راہ میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا جا سکا۔ آج ہندوستان آئینی انقلاب کی ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں سے اس کا قدم اب آئندہ آزادی کامل کی طرف ہی بڑھے گا اور ہندوستان پر حکومت کے اختیارات خود ہندوستانیوں کو ملیں گے اس مرحلہ پر یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی جو قوم صحیح تعلیم و تربیت سے جتنی محروم ہوگی اسی قدر اس کو خسارہ رہے گا اور نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں اس کے نتائج کیا ہوں۔ اس بنا پر ہمارے علمار اور زعمار کا فرض ہے کہ وہ وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور قومی مفاد کی خاطر اپنے تمام اختلافات یک قلم ختم کر دیں اور تمام تر توجہ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح اور اس میدان میں ان کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے کی سعی و کوشش پر مرکوز کریں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ مبادا تناسب آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے اسمبلی اور کونسلوں میں محکموں اور دفتروں میں بڑے سے بڑے عہدے اور نشستیں محفوظ ہوں لیکن ان کو پر کرنے کے لئے مناسب اور موزوں اشخاص جو بیک وقت لائق و قابل بھی ہوں اور ایماندار و دیانت دار بھی دستیاب نہ ہو سکیں کوئی شبہ نہیں کہ نظامِ تعلیم کی اصلاح اور اس پر خلوص و دیانت کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت جتنی آج ہے پہلے کبھی نہ تھی! دیوبند اور علیگڈھ ہندوستان میں اسلامی قومیت کے جسم و جان ہیں اگر یہ دونوں ٹھیک ہو جائیں تو پھر مسلمانوں کی قومی زندگی کے بہتر اور درست ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

عربی کا مشہور مصرع ہے "عند الشدائد تذھب الاحقاد" سختیوں کے وقت آپس کے کینے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ مسلمانانِ عالم پر یہ مصرع صادق نہیں آتا۔ یہاں یہ عالم ہے کہ شدائد روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتے جارہے ہیں لیکن اس کے باوجود نیشنلزم اور ملکی عصبیت نے مسلمانوں میں جو تفریق پیدا کردی ہے وہ ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے ملک کے مسلمانوں کے دردوغم اور رنج والم میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ فلسطین کے مسلمان عرب آج زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہیں اور ان کا مستقبل بڑے خطرہ کی حالت میں ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ٹرکی، ایران افغانستان کی مسلمان حکومتیں کس طرح مہر بلب بیٹھی ہوئی ہیں کہ گویا فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ محض ایک قوم یعنی عربوں کا مسئلہ ہے جس سے بربنائے اختلافِ قومیت انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔

تاہم اس سلسلہ میں یہ خوشی کی بات ہے کہ جہاں تک عربوں کا تعلق ہے فلسطین کے معاملہ میں وہ سب ایک ہوگئے ہیں اور اس بات کا عزم بالجزم کرچکے ہیں کہ اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لئے ہر ممکن اقدام کرنے سے دریغ نہیں کریں گے چنانچہ قاہرہ ۳۰ مئی کی اطلاع ہے کہ قاہرہ سے تیس میل کی مسافت پر مشرقِ وسطیٰ کی سات عرب حکومتوں کے نمایندوں نے ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا اور اس میں یہ طے کیا کہ "فلسطین ایک عرب ملک ہے اور تمام عربی ممالک کو اس کی یہ حیثیت قائم اور محفوظ رکھنے کے لئے سرگرم جدوجہد کرنی چاہئے۔" اس اجلاس کے خاتمہ پر مصر کے شاہ فاروق نے جو اعلان کیا ہے اُسے پڑھ کر ہر مسلمان مسرور ہوگا۔ اس اعلان میں کہا گیا ہے کہ اس کانفرنس کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ ہم سب آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کو جانیں پہچانیں اور دنیا کو صاف صاف یہ بتادیں کہ ہم میں یا ہمارے ملکوں میں انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور ہم سب عرب بالکل ایک ہیں۔"

خدا کرے عرب حکومتوں کا یہ اتحاد عرب قومیت پر نہیں بلکہ اسلامی اخوت و برادری کے رشتہ پر مبنی ہو اگر واقعی ایسا ہے اور یہ اتحاد محض لفظی نہیں بلکہ اتحاد حقیقی ہے تو اس کو مسلمانوں کے لئے طلوعِ سحر کا پیغام سمجھنا چاہیے۔

حدیث افتراقِ امت

(۲)

از جناب مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی ندوۃ المصنفین دہلی

پارٹیوں کا ظہور اور اب وہ وقت قریب تر ہوگیا کہ آیت "او یلبسکم شیعاً" کی تاویل دنیا بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اچانک خلافتِ راشدہ کے دورِ رابع میں ایک طوفانِ بدتمیزی اٹھا۔ ایک جماعت قرآن ہاتھوں میں لئے ہوئے ہے تہجد کے نشانات اس کی پیشانیوں پر ہیں اور وہ خلیفۂ وقت پر چڑھائی کے لئے اس لئے جمع ہوئی ہے کہ اس کے نزدیک وہ کافر ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کون ہے جسے یہ بدبخت دائرہ اسلام سے خارج کر رہے ہیں؟ وہ کہ جس کی شمشیر اور جس کی تقریر نے نہ معلوم کتنے کفار کو مسلمان بنایا تھا جس کی نسبت ارشادِ نبوی تھا انت منی بمنزلتہ ھارون من موسیٰ۔ علیؓ تمہیں میرے ساتھ وہ نسبت ہے جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی۔ اور وہ جس کو امت باب العلم کہتی ہے۔ حیرت ہے کہ جس کو کل دورِ کفر میں پہلا مسلمان کہا جاتا تھا آج اسلام کے زمانہ میں خود اسی کے دورِ خلافت میں اُسے اول کافر کہا جا رہا ہے۔ یہ فتنہ خوارج کا فتنہ تھا جس کی تفصیل کتبِ تاریخ میں مذکور ہے [۱]

---

[۱] حافظ ابن عبد البرؒ نے اس کی مختصر سرگذشت اس طرح لکھی ہے کہ جب خوارج حضرت علیؓ پر چڑھائی کر کے آئے تو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے امیر المومنین دیکھئے۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

ان کے اقوال و عقائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے۔ درک مقاصد، فہم معانی، استنباط و استنتاج کا ان میں کوئی ملکہ نہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا انھیں شوق ضرور تھا مگر اس کے معانی کی انھیں کوئی اہمیت نہ تھی۔ طوطے کی طرح قرآن ان کی زبانوں پر تھا مگر ان کے قلوب اس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعاً خالی تھے، ان کی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) یہ جاہل لوگ آپ کے مقابلہ میں آمادہ پیکار کھڑے ہیں آپ نے جواب دیا کہ پہلے انہیں جنگ شروع کر لینے دو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ایک دن میں نے عرض کیا کہ آج ذرا تاخیر سے نماز ادا کیجئے میں ان لوگوں سے گفتگو کر لوں۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھیڑ لگ رہی ہے شب بیداری کی وجہ سے ان کے چہرے سیاہی مائل ہیں سجدوں کے نشان پیشانیوں پر ہیں اور کہنیوں میں اونٹ کے گھٹنوں کی طرح ٹھیک پڑ گئی ہیں۔ دُھلی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہیں حضرت ابن عباسؓ کو دیکھا تو بولے ابن عباسؓ کیسے آئے؟ اور یہ حلہ کیسا پہن رکھا ہے؟ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ تمہیں اس حلہ پر کیا اعتراض ہے میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر اچھے اچھے یمنی کپڑے دیکھے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔ آپ کہہ دیجئے کہ یہ زینت اور اچھی اچھی غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہیں کس نے حرام کیں۔

پھر انھوں نے دریافت کیا کہو کیوں آئے ہو میں نے جواب دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور ایک ایسی جماعت کے پاس سے آرہا ہوں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور جن میں قرآن نازل ہوا تھا اور تم میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو، میری آمد کا مقصد یہ ہے کہ ان کی باتیں تم تک اور تمہاری باتیں ان تک پہنچا دوں۔ انھوں نے آپس میں کہا ان سے بات مت کرو کیونکہ یہ قریشی ہیں اور ان کے حق میں قرآن کہتا ہے بل ہم قوم خصمون۔ بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔ بعض نے کہا کہ ہم ضرور گفتگو کریں گے اس کے بعد ان میں سے دو تین شخص سامنے آئے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت علیؓ پر تمہیں کیا اعتراض ہے۔ انھوں نے کہا تین اعتراض ہیں، میں نے کہا بتلاؤ انھوں نے کہا پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے دین کے معاملہ میں انسانوں کو حکم بنایا حالانکہ قرآن کریم میں ہے ان الحکم الا للہ۔ فیصلہ صرف خدا کا ہے۔ میں نے کہا چلو ایک بات ہوئی، اور بولو۔ کہنے لگے حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ سے جنگ کی پھر نہ کسی کو قید کیا اور نہ مال غنیمت لوٹا۔ اب اگر ان کی جماعت مسلمان تھی تو ان سے جنگ کیوں کی اور اگر کافر تھی تو جس طرح ان کے ساتھ جنگ درست تھی قید کرنا بھی درست تھا۔ میں نے کہا اچھا اور کچھ؟ بولے تیسری بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنا نام امارت سے کیسے مٹایا اس لئے اگر وہ مومنین کے امیر نہیں تو یقیناً کافروں کے امیر ہوئے۔

میں نے کہا اگر میں ان سب باتوں کا تمہیں خود قرآن وسنت کی ہی جواب دیدوں (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اسی علمی بے مائگی کی طرف حدیث کے الفاظِ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے یقرؤن القرآن لایجاوز حناجرھم یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف ان کی زبانوں پر ہوگا اُن کے قلوب میں علم وفہم کا کوئی ذرہ تک نہ ہوگا۔ دوسری علامت ان کے علم تما جہل کی یہ بتلائی گئی ہے کہ یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان۔ بت پرستوں کو چھوڑ کر اہلِ اسلام کو قتل کریں گے۔ کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدت اور نفس میں تقشف پیدا ہونا لازم ہے۔ حضرت ابن عباس رض جب ان سے مناظرہ کے لئے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ انھوں نے فرمایا ہے وہ یہ تھا۔ میں ایسی جماعت کے پاس سے آرہا ہوں جس میں یہ قرآن اترا ہے اور جو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو کیا واپس چلے جاؤ گے انھوں نے کہا کیوں نہیں۔ اس پر میں نے کہا اچھا تو سنو!

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن ہی میں دوسروں کو حکم مقرر کرنے کا حکم موجود ہے چنانچہ حالتِ احرام میں کوئی شخص شکار کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جزاء مقرر کی ہے اور اس کا فیصلہ دو منصف مسلمانوں پر رکھا ہے جو وہ کہدیں گے وہی قابلِ تسلیم ہو جائے گا۔ اسی طرح خلع میں طرفین کے دو شخص بلاکر فیصلہ ان کی رائے پر رکھدیا ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب جانوروں اور عورتوں تک کے معاملات میں مسلمانوں کا فیصلہ قابلِ تسلیم سمجھا گیا ہے تو مسلمانوں کے جانی معاملات میں کیوں قابلِ تسلیم نہیں ہوگا۔ اب بتلاؤ تمہارا یہ اعتراض جاتا رہا یا نہیں کہنے لگے جی ہاں۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بتلاؤ حضرت عائشہ رض تمہاری ماں تھیں یا نہیں اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد ان کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ جائز ہوتے ہیں اگر اس کا اقرار کرتے ہو تو بھی کافر ہو۔ کہو اس پر تمہارا کوئی اعتراض ہے ؟ انھوں نے کہا نہیں۔

میں نے کہا کہ اب تیسری بات کا جواب سنو، صلح حدیبیہ میں ابوسفیان وسہیل کے اصرار پر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام سے رسول اللہ کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا پھر اگر حضرت علی رض نے اپنا نام امارت سے علیحدہ کردیا تو کیا ہوا۔

سوال وجواب کے بعد ان میں دو ہزار اشخاص تو واپس ہوگئے اور جو رہ گئے وہ قتل کردیئے گئے۔

(جامع بیان العلوم ج ۲ ص ۱۰۴)

قرآن خواں اور قرآن داں کا فرق

اس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن داں نہیں، اگر انصاف کرتے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کے صحیح مراد وہ لوگ زیادہ جانتے تھے جن میں سب سے پہلے قرآن اترا، اور جنھوں نے براہِ راست صاحبِ کتاب سے اس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اس پر صحیح عمل کا طریقہ دیکھا یا تم جو ان میں سے کسی ایک بات میں بھی ان کے شریک و سہیم نہیں۔ نہ تم قرآن کے نزول کے ماحول سے واقف ہو اور نہ اس کی مراد دریافت کرنیکا کوئی صحیح معیار تمہارے سامنے ہے صرف ایک سطحی علم، ایک جامد رائے اور ایک جہل آلود مزاج ہے، اس پر یہ دھوکا ہے کہ مخلص بھی تم ہی ہو، قرآن کو بھی تم ہی سمجھتے ہو اور تم ہی اس پر عمل کرتے ہو۔

اسبابِ اختلاف حضرت ابنِ عباسؓ کی نظر میں

اسی لئے جب ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ابنِ عباسؓ سے دریافت فرمایا کہ اس امت کا جب نبی ایک، قبلہ ایک، کتاب ایک ہے تو پھر اس میں اختلاف کیونکر پیدا ہوگا تو ابنِ عباسؓ نے یہی جواب دیا تھا کہ اے امیرالمومنین قرآن ہمارے سامنے اترا ہے۔ ہم تو اس کے موارد نزول کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر انھیں صحیح طور پر اس کے موارد و مصادر کا علم نہ ہوگا پھر اس میں اپنی طرف سے رائے زنی شروع کریں گے اور اٹکل کے تیر چلائیں گے۔ اس لئے ان میں اختلاف ہو جائے گا اور جب اختلاف ہوگا تو لڑائیاں ہوں گی۔ شروع میں تو حضرت عمرؓ نے اس خیال سے اتفاق رائے نہ کیا لیکن غور کرنے کے بعد انھیں بھی ابنِ عباسؓ سے اتفاقِ رائے کرنا پڑا۔ [۵۱]

حضرت ابنِ عباسؓ کے اس صوابدید کی اس سے زیادہ شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام میں ایک مشہور گروہ بندی کی جب بنیاد پڑتی ہے تو وہ اسی ناواقفی و جہل کی بدولت نظر آتی ہے۔ چنانچہ خوارج کا نقطۂ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہوئی تھیں انھیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر انھیں کافر قرار دیتے۔ پھر اس جاہلانہ بنیاد پر اُن سے آمادۂ جنگ ہو جاتے تھے۔

---

[۵۱] الاعتصام ص ۱۵۷۔

سلف کی یہ دقتِ نظر قابلِ داد ہے جنھیں ہر دینی معاملے میں سب سے پہلے یہی تلاش رہا کرتی تھی کہ یہاں صحابہ کرام کا طریقہ کیا تھا اور جب ان کی کوئی ایک رائے معلوم ہو جاتی تو اسی کو اپنے لئے اسوہ بنا لیتے اور اختلاف دیکھتے تو ان ہی آرار میں سے کسی کا اتباع کر لیتے اور اُن سے باہر قدم نکالنا ضلالت و گمراہی تصور کرتے۔ ۵۱

---

۵۱ حافظ ابن عبدالبر امام اوزاعی سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شاگرد بقیہ بن الولید سے فرمایا

یا بقیۃ العلم ما جاء عن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم وما لم یجئ فلیس بعلم ۵۲	اے بقیہ بس علم تو وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں۔
قال الشعبی ما حدثوك عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخذ بہ وما قالوا فیہ برأیہم فبل علیہ ۵۳	عامر شعبیؒ کہتے ہیں لوگ جو باتیں تمہارے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی جانب سے نقل کریں، انھیں تو اختیار کرلو اور جو اپنی رائے سے کہیں انھیں نفرت کے ساتھ چھوڑ دو۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

لا یزال الناس بخیر ما اتاھم العلم من قبل اکابرھم فاذا اتاھم من قبل اصاغرھم ھلکوا۔ ۵۳	جب تک لوگوں کے سامنے بڑے بڑے علمار کا علم رہے گا وہ دین میں ترقی یافتہ رہیں گے اور جب ناواقفوں کا علم شروع ہو تو برباد ہو جائیں گے۔

ابن مبارکؒ فرماتے ہیں اصاغر سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین میں اپنی رائے لڑائیں، ابو عبیدۃ فرماتے ہیں میرے نزدیک اس کی مراد یہ ہے کہ جو لوگ صحابہ کے بعد ہیں ان کا علم حاصل کیا جائے اور صحابہ کے علم کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دی جائے۔ ۵۴

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن امام ربیعہ پر سخت گریہ طاری ہوا ان سے دریافت کیا گیا خیر تو ہے کیا کوئی مصیبت درپیش ہے فرمایا نہیں لیکن یہ دیکھ رہا ہوں کہ دین کی باتیں بے علموں سے دریافت کی جاتی ہیں اور یہی گمراہی کا پیش خیمہ ہے ۵۵

ان آثار اور اس طرح کے بہت سے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلف کے یہاں صحابہ کے علم کا کتنا وزن تھا ان کے یہاں اس علم کی اتنی قدر و قیمت کیوں تھی؟ — (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

---

۵۱ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۹ ۵۲ ایضاً ج ۲ ص ۳۲ ۵۳ ایضاً ج ا ص ۱۵۹ - ۵۴ ایضاً ج ا ص ۱۵۸ - ۵۵ الاعتصام ص ۱۳۹ ج ۲

کلام فہمی کے لئے محاورات کے سوا مصنف کی مزاجی خصوصیات کا علم بھی ضروری ہے

اگر ملکی عادات، رسم و رواج، زبانی محاورات، مصنف کی خصوصیات کا علم کسی عام کلام کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے تو بلا شبہ کلام اللہ کے مراد متعین کرنے کے لئے بھی اس کا علم ضروری ہے کہ عرب کا ماحول، عرب کی زبان پھر سب سے پہلے کتاب اللہ کا طرزِ خطابت کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ ان اوصاف میں جس قدر عہدِ نبوۃ کے قریب ہوتے جاؤ گے اتنا ہی کمال نظر آتا جائے گا اور جتنا اس عہد سے نیچے اترتے آؤ گے اتنا ہی نقصان نظر آتا جائے گا۔

علم کا طول و عرض اور ہے اور اس کا عمق اور

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ صحابہ کے علوم میں وہ طول و عرض نہیں ملتا جو متأخرین کے یہاں موجود ہے مگر صحیح علم طول و عرض کا نام نہیں بلکہ اس کے رسوخ اور عمق کا نام ہے۔ اکتسابی اور رسمی فنون چونکہ محض انسانی دماغ کی پیداوار ہیں اس لئے ظنی ہیں اور ظنیات میں چونکہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لئے تحصیلِ یقین کی سعی میں دلائل اور تحقیقات کا طول و عرض خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن وحی کا علم قطعی ہے وہ جتنا نظر آتا ہے سب مغز ہی مغز ہوتا ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس کا راز یہ ہے کہ جس طرح سنت مقاصدِ قرآنیہ کے لئے کاشف ہے اسی طرح صحابہ کے کلمات مقاصدِ سنت کی شرح کرنے والے ہیں کیونکہ یہ کلمات اگر حضور ؐ سے سُنے ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل سے افضل کوئی نقل نہیں ہو سکتی اور اگر وہ ان کی اپنی رائے ہے تو دین میں ان کی رائے سے بہتر کس کی رائے ہو سکتی ہے۔

محمد بن سیرین ؒ سے حج کے ایک مسئلہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ کرہھا عمر و عثمان فان یکن علماً فھما اعلم منی وان کان رأیا فرأیھما افضل۔[۵] یعنی عمر فاروق ؓ اور عثمان غنی ؓ نے مکروہ سمجھتے تھے اب اگر یہ علم تھا تو وہ مجھ سے زیادہ عالم تھے اور اگر ان کی رائے تھی تو ان کی رائے میری رائے سے افضل ہے۔

یہ محمد بن سیرین کا قول ہے جو مشہور ترین تابعی ہیں اور تابعین میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں وہ علم اسی کو کہہ رہے ہیں جو آنحضرت ؐ سے منقول ہو اور اس کے سوا جو علم ہے اس کا نام رائے رکھتے ہیں پھر صحابہ کی رائے کا وہ مرتبہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں اپنی رائے قابلِ ذکر نہیں سمجھتے۔

[۵] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۳۱

اس لئے اس میں طول وعرض نہیں ہوتا ہاں اس کی گہرائی بے اندازہ ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص زمین کی کرویت یا اس کی حرکت بزور دلائل ثابت کرنا چاہے تو اس کے لئے بہت بڑے علم بہت کافی تجربے اور ایک طویل عمر کی حاجت ہوگی لیکن وہ شخص جوان دونوں چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس کو ان میں سے کسی بات کی بھی ضرورت نہیں سب سے بڑی دلیل سب سے بڑا تجربہ اس کا اپنا مشاہدہ ہے۔ اس لئے جو یقین اس کو حاصل ہے وہ پہلے شخص کو عمر عزیز بھی نصیب نہیں ہو سکتا چنانچہ قرآنِ کریم میں فرمایا۔ افتمارونہ علیٰ مایریٰ کیا تم اس رسول سے اس کی آنکھوں دیکھی باتوں میں جھگڑتے ہو۔ بہرحال جب دین کے علم اور دین کے مسائل پر بحث ہوگی تو سب سے پہلے یہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اس باب میں صحابہ اور سلف[1] کی رائے کیا تھی اور ان کی رائے کے بعد تل

---

[1] حضرت حسنؓ صحابہؓ کے حال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ جماعت پوری امت میں سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرے علم کی مالک اور سب سے زیادہ بے تکلف جماعت تھی خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کی رفاقت کے لئے اسے پسند کیا تھا وہ آپ کے اخلاق اور آپ کے طریقوں سے مشابہت پیدا کرنے کی سعی میں لگی رہا کرتی تھی اس کو دُھن تھی تو اسی کی تلاش تھی تو اسی کی۔ اس کعبہ کے پروردگار کی قسم ہے کہ وہ جماعت صراطِ مستقیم پر گامزن تھی (الموافقات ج ۴ ص ۷۸)

حضرت ابنِ مسعودؓ کی تعبیر اس سے بھی زیادہ صاف، شاندار اور مکمل ہے۔

من كان منكم متأسيا فليتأس بأصحاب	تم میں جس کو اقتدا کرنا ہو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے
محمد صلى الله عليه وسلم فانهم كانوا ابر	صحابہ ہی کی اقتدا کرے کیونکہ وہ نیک دلی میں سب سے زیادہ علم میں
هذه الامة قلوبا واعمقها علما و	سب سے گہرے نہایت بے تکلف مضبوط کیرکٹر
اقلها تكلفا واقومها هديا واحسنها	اور بہت اچھے حالات کے لوگ تھے اور اسی لئے
حالا قوما اختارهم الله	خدا تعالیٰ نے اس بہترین جماعت کو اپنے بہترین
لصحبة نبيه واقامة دينه	رسول کی صحبت اور دین کی حفاظت کے لئے انتخاب
فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوا	کیا تھا اس لئے تم بھی ان کی بزرگی پہچانو اور
في آثارهم فانهم كانوا على	ان کے ہی نقشِ قدم پر چلو کیونکہ وہ سیدھے
الهدى المستقيم۔ (ر)	اور صاف راستہ پر تھے۔

(باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

دوسری سب رائیں اسی طرح ٹھکرا دینے کے قابل ہوں گی جس طرح ہائیکورٹ کے نظائر کے مقابلہ میں دوسری عدالتوں کے فیصلے ٹھکرا دینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ دین کا ہائی کورٹ ہے اور ان سے زیادہ صحیح مراد حاصل کرنا عقلاً تو ممکن ہے مگر واقعات کے دائرہ میں ممکن نہیں اس کے جو علم بھی ہے گو اس میں طول و عرض نظر آئے اور اس میں عمق کا بھی گمان ہوتا ہو لیکن وہ سب سطحی علوم ہیں اور ان کا اتباع یقیناً دینی افتراق کا باعث ہو کر رہے گا۔[ل] اسی کی طرف حدیث ذیل میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

لا یقبض اللہ العلم انتزاعا	اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے ایک دم نہیں
ینتزعہ من الناس ولکن یقبض	نکالے گا بلکہ علماء کو ایک ایک کرکے اٹھائے گا۔
العلم بقبض العلماء حتی	یہاں تک کہ جب کوئی صحیح عالم نہ رہے گا تو لوگ
اذا لم یبق عالم اتخذ الناس	جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے وہ فتوے دیں گے
رؤسا جھالا فافتوا بغیر علم	اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ
فضلوا واضلوا۔	کریں گے۔

عالم رئیس فتنہ نہیں ہوتا جاہل پر عالم کا گمان کر لیا جاتا ہے

بعض علماء نے اس حدیث سے خوب استنباط فرمایا ہے کہ علماء کبھی رئیس ضلالت نہیں ہوتے مبدأ ضلالت ہمیشہ جاہل ہوتا ہے پھر اس کے اتباع میں گمراہی پھیلتی ہے مگر فتن جب ٹوٹتے ہیں تو ایک تاریکی لیکر نہیں ٹوٹتے اپنے گردوپیش میں اتنی تاریکیاں لیکر آتے ہیں کہ اس وقت عالم اور غیر عالم کی شناخت ہی ممکن نہیں رہتی۔ غیر عا

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) صحابہ کی صفات اور ان کے علمی پایہ کے متعلق الفاظ کا یہ توافق بتلاتا ہے کہ ان میں یہ اوصاف اس قدر عیاں تھے کہ جو شخص بھی انہیں دیکھتا تھا وہ ان اوصاف کو سب سے پہلے ان میں دیکھ لیتا تھا اور اس لئے خود ان کے سامنے سرنگوں ہو جاتا اور دوسروں کو اس وصیت کے پہنچانے کے لئے مجبور تھا جو ان کے زمانہ میں ان مقدس ہستیوں کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والے تھے یا اس سے قریب تر زمانہ میں تھے ان کی رائے ان کی یہ ہے اور جو ان دو صفتوں سے محروم ہیں اگر وہ کوئی اور رائے رکھتے ہیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) [ل] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۶ و ج ۴ ص ۱۱۳ و ۱۳۶

بانیٔ ضلالت ہوتا ہے اور یہ ٹیکہ علمار کے نام پر مفت لگ جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک امین انسان کبھی خیانت نہیں کرتا لیکن غلطی سے کبھی امین کے دھوکہ میں امانت خائن کے ہاتھوں میں جا پڑتی ہے۔ وہ خیانت کرتا ہے پھر مشہور یہ ہوتا ہے کہ فلاں امین نے خیانت کی ہے اسی طرح ایک عالم متقی، راسخ العلم، کبھی منشار ضلالت نہیں ہوتا۔ یوں زلّۃ ولغزش انسانی فطرۃ ہے وہ اس وقت زیر بحث نہیں۔ فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کا جذبہ ہمیشہ بے علموں میں اُبھرتا ہے مگر بدنامی علم کے نام پر باقی رہ جاتی ہے۔ آج بھی اگر ہندوستان کی فرقہ بندیوں پر نظر ڈالوگے تو ان کے مختلف عناصر میں ایک بڑا عنصر یہی بے علمی ہے یا وہ فرزانگی جس کی بلند پروازیوں کے لئے حدود اور غیر حدود کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔

سطحی اور عمیق علم کا فرق

بحث تشنہ رہ جائیگی اگر اس مرحلے پر سطحی علم اور عمیق علم کی مناسب وضاحت نہ کی جائے۔ صاحب موافقات نے اپنی کتاب کے شروع میں تیرہ مقدمات تحریر فرمائے ہیں جن میں ہر مقدمہ اپنی جگہ مہم اور ضروری ہے لیکن بارہواں مقدمہ ہمارے مضمون کے لحاظ سے اور بھی زیادہ اہم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ہمیشہ محقق اور راسخ العلم شخص سے حاصل کرنا چاہئے کیونکہ مشہور ہے کہ از ناقصے کامل نزاید۔ اس کی علامت تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ راسخ العلم کی بڑی علامت یہ ہے کہ اس نے علم شیوخ کی زیر نگرانی اور ان کی تربیت میں رہ کر حاصل کیا ہو تاکہ ان کے فیض صحبت سے اس کا رسوخ بھی حاصل ہو جائے۔ صحبت اور ملازمتِ شیخ کو رسوخ علم میں بڑا دخل ہے۔ صحابہ کا علم اسی طریق پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک "قل ھو اللہ" پڑھنے والا صحابی جس خوبی اور پختگی سے توحیدِ اسلام سمجھا ہوا تھا آج تیس پاروں کا حافظ بھی اس کا عشر عشیر سمجھا ہوا نہیں۔

صرف مطالعہ کا علم اغلاط سے پاک نہیں ہوتا

بات یہ ہے کہ الفاظ میں اشتراک وترادف، حقیقت ومجاز اور عموم وخصوص کے احتمالات پھیلتے چلے جاتے ہیں اس لئے محض لفظوں کی لوٹ پلٹ سے یقین تک رسائی نہیں ہوتی، محقق معلم ایک نکھری نکھرائی مراد متعلم کو تبلا دیتا ہے پھر یہ کچھ قدرتی انتظام بھی ہے کہ جب ایک جماعت تشنہ لب، دستِ حاجت دراز کئے ہوئے تحصیلِ علم کے لئے آتی ہے

تو اس اجتماع میں کچھ عجیب برکت پیدا ہو جاتی ہے یعنی معلم میں قوتِ افادہ اور متعلم میں ویسی طور پر قوتِ استفادہ کچھ اس طرح رونما ہو جاتی ہے کہ علوم جس انداز سے یہاں کھلتے ہیں صرف اپنے مطالعہ سے نہیں کھلتے۔ آخر یہ کیا بات تھی کہ صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے بعد ہی اپنے قلوب میں ایک تغیر محسوس کیا تھا۔ حضرت حنظلہ جب اپنے گھر آتے تو ان کے قلب میں بردِ یقین کی جو کیفیت آپ کی صحبت میں ہوتی بدل جاتی۔ یہ انشراح و یقین سب اسی ملازمت ہی کا کرشمہ ہوتا تھا

زیر تربیت علم کی تاثیرات

اس تربیت اور صحبت کی تاثیر بعض مستعدین پر تو عجب حیرت انگیز طریقے سے ہوئی ان کی قوت استفادہ اتنی ترقی کر گئی کہ بعض مرتبہ نزولِ وحی سے پہلے ہی وہ بجلی کی طرح دوڑ کر اس کو اُچک لیا کرتے۔ کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا کہ وحی الٰہی کا فیصلہ کل کیا ہوگا۔ مگر نورِ نبوۃ کا یہ تربیت یافتہ انوارِ صحبت سے لبریز مجلس میں بول اٹھتا اور جو وہ بول اٹھتا کل وحی اسی کے موافق نازل ہو جاتی، صلاحیت و صواب رسی کی یہی وہ آخری منزل تھی جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو گیا ہوتا تو یہ خلعت اس کو پہنا دیا جاتا۔ یہ وہی ہے جس کو دنیا عمر فاروق رضؓ کے نام سے پکارتی ہے۔ صحاح کی روایات میں تو موافقاتِ عمرؓ کی تعداد تین ہی بتلائی گئی ہے مگر موافقاتِ عمرؓ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ بہرحال اگر عمرؓ اس ماحول کے سوا قرآن کریم کا مطالعہ کہیں اور رہ کر کرتے تو کیا یہ صواب رسی یہ توقد یہ ذکاء ان کو میسر آتا۔

صلح حدیبیہ میں صحابہ کے اضطراب اور پھر سکون میں ایک تعلیمی سبق

دیکھئے صلح حدیبیہ کا واقعہ ان کے اور دیگر صحابہ کے لئے کتنا مشکل سبق تھا فاتحانہ جرأت رکھتے ہوئے مفتوحانہ شرائط کو معقول تسلیم کرنا ایک ایسی کٹھن منزل تھی۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ وحی الٰہی نازل ہوئی اور اس نے اس کو فتح مبین ٹھہرایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروق رضؓ کو جو اس معاملہ میں سب سے زیادہ الجھن میں پڑے ہوئے تھے بلایا اور وحی الٰہی کو پڑھ کر سنا دیا آپ کا پڑھ کر سنانا تھا کہ یا ابھی ابھی وہ بے چینی وہ اضطراب تھا کہ طبیعت سنبھالے نہ سنبھلتی تھی یا اب صلح حدیبیہ کا فتح ہونا ان کی رگ و پے

میں اتنا سما چکا تھا کہ تمام اضطراب و بے چینی کی بجائے سکون ہی سکون واطمینان ہی اطمینان تھا۔

حادثۂ وفات پر صحابہ کرام کا دوسرا اضطراب و سکون

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وفات نے جو ہیجان اُن کے سینہ میں برپا کردیا تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کی موت کے نام لینے والے کا جواب شمشیر سے دینا چاہتے تھے مگر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا ادھر آیتہ وما محمد الا رسول نے کا پڑھنا تھا ادھر یہ ادران کے ساتھ بہت سے مدہوش صحابہ ہوش میں تھے۔ صحبت میں رہ کر جو علوم حاصل کئے جاتے ہیں ان میں اول تو شبہات پیدا نہیں ہوتے اور جو پیدا ہوتے ہیں وہ اسی طرح ظاہری و باطنی اثرات سے کافور ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ

علم پڑھنا بھرا ہے گننا چاہئے

جب ایک متعلم اس طرح علم پڑھتا اور گُن لیتا ہے تو اس کا قلیل علم بھی قلیل نہیں ہوتا۔ اب اس کا نام علم نہیں رہتا بلکہ قرآنی الفاظ میں شاید حکمت ہو جاتا ہے قرآن کریم میں جس حکمت کو حضرت لقمان کا بڑا علم بتلایا گیا ہے ولقد اٰتینا لقمان الحکمۃ ہم نے لقمان کو حکمت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے۔ ویعلمهم الكتاب والحكمۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

حکمت کا مفہوم

گو عام مفسرین نے حکمت کی تفسیر سنت کی ہے مگر یہاں اور بھی بہت اقوال موجود ہیں۔ تعلیم کتاب کے ساتھ جب حکمت کی تعلیم نہیں رہتی تو گویا اصل دوا کا بدرقہ نہیں رہتا اس لئے اس کی تاثیر میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ معلم محقق کتاب کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ دوسری چیز ہوتی ہے۔ یہ حکمت کتاب کی شکل میں کوئی دوسری کتاب نہیں ہوتی بلکہ اس کتاب کو صحبتِ نبی میں پڑھنے کے وہ اثرات ہوتے ہیں جو مستعد شخص کی ذہنیت میں وہ صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ صحیح فہم و فراست اس کے لئے ملکۂ نفس بن جاتی ہے اس کے خیالات و عقائد خود پاکیزہ اور دوسروں کو بھی پاکیزہ بنادیتے ہیں۔ غلط بات کو اس کا ذوق قبول نہیں کرتا اور صحیح حقیقت قبول کرنے میں اُسے کچھ تردد نہیں رہتا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں۔

الحکمۃ والعلم نور یھدی حکمت اور علم ایک نور ہے خدا تعالیٰ جسے
بہ اللہ من یشآء۔ چاہتا ہے دیدیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسب کا ثمرہ ہی نہیں بلکہ وہبی نعمت ہے کسی نصیب والے کو مل جاتی ہے۔ کتاب اللہ کے ساتھ جب یہ حکمت نہیں ہوتی تو خام طبائع اسے فلسفہ بنا لیتی ہیں غالباً اقبال مرحوم نے اسی کے لئے یہ شعر کہا ہے۔

فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

امام مالکؒ جب مسائل اجتہادیہ اپنے طلبہ کے سامنے بیان فرماتے تو طلبہ ان سے لکھنے کی اجازت طلب کرتے آپ منع فرما دیتے اور کہتے کہ یہ مسائل اگر دنیا میں پھیل گئے پھر کل ان کے متعلق میری رائے بدل گئی تو اس کی تلافی مشکل ہو جائے گی اس لئے لکھو مت۔ انھوں نے عرض کیا پھر کیا کریں تو فرمایا

تحفظون وتفھمون حتی بس زبانی یاد رکھو اور انھیں خوب سمجھ لو یہاں تک کہ
تستنیر قلوبکم ثم لا تحتاجون جب تمہارے قلوب روشن اور منور ہو جائیں گے
الی الکتابۃ۔ تو اس کے بعد لکھنے کی خود بخود ضرورت نہ رہے گی۔

دوسری جگہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔

لیس العلم بکثرۃ الروایۃ ولکنہ علم کثرتِ روایات کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے
نور یجعلہ اللہ فی القلوب۔ جس کو اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈالدیتا ہے۔

پھر اس کی علامت بیان فرماتے ہیں کہ

ولکن علیہ علامۃ ظاھرۃ وھو التجافی عن اس کی ایک کھلی علامت دنیا سے نفرت
دار الغرور والانابۃ الی دار الخلود اور آخرت کی طرف توجہ ہے۔

علم ایک نور کا نام ہے | امام مالکؒ جیسا شخص یہاں یہ بتلا رہا ہے کہ علم کثرتِ روایت اور طول وعرض کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کے بعد دماغ رٹنے کا محتاج نہیں رہتا اس کی روشنی میں

حقائق اشیا راسی طرح نظر آنے لگتی ہیں جیسا کہ آفتاب کی روشنی میں سیاہ وسفید۔

علم کے متعلق اشراقیہ کی رائے

اشراقیین کا بڑا طبقہ علم کی حقیقت بھی اشراق نوری قرار دیتا ہے۔ علم درحقیقت اسی نور کا نام ہے جب تک یہ نور پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک مسائل غامضہ تو درکنار بدیہیات بھی اپنی پوری حقیقت کے ساتھ منکشف نہیں ہوتے وہ قرآنی سورتیں کی سورتیں پڑھجاتا ہے۔ حدیثوں کے انبار کے انبار رٹ لیتا ہو لیکن اس کے قلب میں جو درحقیقت علم کی تخت گاہ ہے علم و فہم کا کوئی حصہ نہیں پہنچتا اسی لئے حوارج کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ یقرؤن القرآن لا یجاوز حناجرھم۔ علم کی حقیقت سے ناآشنا تو آیات واحادیث کا یہ طول وعرض الفاظ کا یہ طمطراق دیکھ دیکھکر مرعوب ہوتا رہتا ہے مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ یہ علم نہیں خوشنما الفاظ کا صرف ایک انبار ہے جس کی حقیقت قاعدۂ بغدادی کے صرف انتیس حروف ہیں اور بس۔ اس کے برخلاف جو علوم تاثیر صحبت سے راسخ ہوکر نور کی شکل اختیار کرلیتے ہیں وہ کتنے ہی مختصر ہوں ان کا جامہ کتنا ہی کہنہ اور دریدہ ہو مگر قدرشناس خوب جان لیتا ہے کہ یہ گدڑیوں میں لعل ہے۔

نورعلم بلاعقیدت واتباع منتقل نہیں ہوتا

یہ علم صرف مشائخ کرام اور علماء کبار کی زیر تربیت ہی حاصل ہوتا ہے اور اس لئے جب تک متعلم ان کے ساتھ عقیدت ومحبت کا تعلق نہ رکھے ان کے رنگ میں رنگین نہ ہو۔ اس وقت تک علم کا یہ نور بھی اس کے سینہ میں منتقل نہیں ہوتا۔ وہ حرف شناس ہوکر حاضر ہوتا ہے اور فقرہ باز بن کر واپس چلا جاتا ہے۔ اب جتنا چاہے اس پر ناز کرے۔

غالباً اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ سطحی علم سے ہمارا کیا مطلب تھا اور صحابہ کے علم کو ہم نے صرف حسنِ اعتقاد سے نہیں بلکہ حقیقت کی بنا پر عمیق کہا تھا۔ اب یہ علم اگر کسی سینہ میں سرایت کرجائے تو کیا آپ کے نزدیک اس پر مقاصدِ شریعت مخفی رہ سکتے ہیں۔ اگر علم کے مختلف حاملین ایک ہی منبع سے فیض یاب ہوں جہاں کوئی اختلاف نہیں تو کیا ان میں اختلاف پیدا ہونے کا کوئی احتمال ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد راسخ العلم کی دوسری علامت یہ تحریر فرمائی ہے کہ اس کا علم و عمل، حال و قال ایک دوسرے سے مطابق ہو۔

علم صحیح عمل کی دعوت دیتا ہے

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد یہ نتیجہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ صحیح عالم بے عمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ صحیح علم بلا عمل قائم رہ سکتا ہے۔ علم صحیح کا تسلط اور اس کی باطنی تسخیر اپنے حامل کو اس بے ... کا دیتی ہے کہ وہ اس کے مقتضا پر عمل کرے۔ کچھ دن عالم اور علم میں یہ کشمکش رہتی ہے پھر بالآخر یا عالم کو اقتضاءِ علم کے تابع ہو جانا پڑتا ہے ورنہ علم خود اس سے کنارہ کش ہو کر اپنی گدی ویران چھوڑ جاتا ہے۔

علماءِ سوء کی علامت

فاضل مؤلف نے آٹھویں مقدمہ کے آخر میں ایسے علماء کا نام علماءِ سوء رکھا ہے اور اس کی شہادت میں اکابر صحابہ و علماء کے آثار ذیل نقل کئے ہیں۔

"حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اے گروہ علماء اپنے علم پر عمل بھی کیا کرو کیونکہ عالم وہ ہے جو پہلے علم حاصل کرے پھر اس پر عمل بھی کرے اس کا علم و عمل یکساں نظر آئے۔ آئندہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے جو علم حاصل کریں گے مگر ان کے گلے کے نیچے نہ اتریگا، ان کا باطن ان کے ظاہر کے مخالف اور ان کا علم ان کے عمل کے برخلاف ہوگا۔ حلقے بنا بنا کر بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کریں گے۔ یہانتک کہ اپنے شاگرد پر کوئی تو اس لئے ناراض ہوگا کہ وہ اسے چھوڑ کر دوسرے کے حلقۂ درس میں کیوں بیٹھ گیا یہی لوگ ہیں جن کے اعمال قبول نہ ہوں گے۔

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ عالم تو وہ ہے جو اپنے علم کے موافق عمل بھی کرے لیکن جس کا علم و عمل مخالف ہو وہ کیا عالم ہے۔ یہ تو روایتِ حدیث ہے ایک بات سنی پھر اسے نقل کر دی۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علماء وہ لوگ ہیں کہ جب علم حاصل کر لیتے ہیں تو اس پر عمل کرتے ہیں اور جب عمل کرتے ہیں تو اسی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب

مشغول ہو جاتے ہیں تو عوام میں نظر نہیں آتے جب نظر نہیں آتے تو ان کی تلاش پڑتی ہے جب تلاش ہوتی ہے تو مخلوق سے بھاگتے ہیں۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے جو شخص لوگوں سے علم میں برتر ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ عمل میں بھی ان سے برتر رہے۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علم جب آتا ہے تو عمل کو پکارتا ہے اگر وہ بھی آگیا تو ٹھہر جاتا ہے ورنہ وہ بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

ان مذکورہ بالا آثار میں علم وعمل کا وہ ربط جو ان حضرات کی دوربین نظروں میں تجربہ کے بعد ثابت ہوا ہے ظاہر کر دیا گیا ہے اس کے بعد صاحب موافقات لکھتے ہیں کہ علم میں لگے رہنے سے ایک نہ ایک دن عمل کے لئے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔

حسنؒ فرماتے ہیں "شروع میں ہم نے دنیا کے لئے علم حاصل کیا آخر کار ہمیں علم نے آخرت کی طرف کھینچ ہی لیا"

معمرؒ کہتے ہیں کہ یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی علم دنیا کی نیت سے حاصل کرے گا تو آخر علم اسے کشاں کشاں خدا ہی کی طرف لے ہی آئے گا۔

حبیب بن ابی ثابتؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے علم حاصل کرنا شروع کیا تو اس وقت ہماری کوئی اچھی نیت نہ تھی لیکن جب علم آیا تو خود بخود اچھی نیت پیدا ہو گئی۔

اختلاف کا دوسرا سبب اتباع ہویٰ ہے۔ قدرت نے انسان میں فہم وفراست اور عقل وذکاوت کی وہ طاقت ودیعت رکھی ہے کہ جب وہ اس کا پورا پورا ادراک کر لیتا ہے تو بر وبحر کی ساری طاقتیں اس کو اپنی ہی محکوم نظر آتی ہیں وہ سمندروں کے طوفانوں، دریا کی موجوں اور بڑے بڑے حوادثِ ارضی کو نظر میں نہیں لاتا وہ سورج کی شعاعوں اور بادلوں کے پانی سے بہت بے نیازی کے ساتھ فائدہ اٹھاتا ہے اور اگر اس کے نظامِ عمل میں یہ عظیم الشان مخلوق کبھی اس کے ارادہ کے موافق کام نہیں کرتی تو اپنا ایک الگ سورج اور جدا بادل بنا کر نہایت حاکمانہ

انداز میں اللہ کا بائیکاٹ کر دیتا ہے۔

انسان کچھ پر اپنی حکومت دیکھتا ہے اور سب کچھ پر حکومت کا یقین کر لیتا ہے

اپنی حاکمیت کی یہ بے پناہ وسعت دیکھ کر اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بس وہی ایک حاکم علی الاطلاق ہے اور سب کچھ اسی کے زیر حکومت ہے۔ اسی زعم حاکمیت میں کبھی کبھی جب وہ آسمان کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو اس کی نظر ایک ایسے عالم پر پڑتی ہے جہاں اس کی حاکمیت کا وہ اثر ظاہر نہیں ہوتا جو اس کرۂ ارضی پر نظر آتا تھا یہ ہمہ وقت اس کے قدموں کے نیچے پامال ہو رہا ہے اور وہ اس کی قید حکومت سے تمام تر آزاد ہے۔ نظام شمسی و قمری اس کی دست رس سے بالکل باہر ہیں، سیارات کی گردش اور بے شمار ثوابت کی معین نشست پھر ان میں صغیر و کبیر، قرب و بعد کا تناسب، یہ ابھی تک اس کے لئے موجب حیرت بن رہا ہے۔ مدتوں سعی کے بعد اگر اس نے بازو پرواز حاصل کئے بھی تو وہ بھی چند میل کے فاصلہ پر جا کر شکستہ ہو گئے۔ تاہم کبھی وہ ہواؤں پر اڑا اور کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھا اور اپنی عقل و فراست کی جتنی بھی طاقت تھی وہ سب خرچ کر ڈالی مگر ابھی تک اس کو یہ باور نہیں ہو سکا کہ عالم علوی پر بھی اس کو وہی تصرف و قبضہ حاصل ہو گیا ہے جو عالم سفلی پر تھا قدرت اس کو اتنا زبردست حاکم بنا کر پھو کبھی کبھی اس لئے شکست دیتی رہتی ہے کہ اس کے دل میں کبھی اس سے برتر حکومت کا تصور بھی آ جائے اسی قدرت و عجز کے درمیان اس کا امتحان لیا جا رہا ہے۔

معجزہ

انبیاء علیہم السلام آتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسی بادشاہت کے پیغمبر ہیں جس سے وہ ہمیشہ شکست کھاتا رہا ہے اور اس دعوی کے ثبوت میں دنیوی طاقتوں کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ اپنی ساری طاقتوں کو بروئے کار لے آئیں اور ان کا مقابلہ کر لیں اور اگر اس پر بھی مقابلہ نہ کر سکیں تو اس کا یقین کر لیں کہ وہ ضرور کسی ایسی حکومت کی طرف سے آئے ہیں جو ان ساری حکومتوں سے قوی تر اور بالاتر ہے اسی کا نام معجزہ ہے اس کے بعد وہ ان کے سامنے ایک دستور العمل رکھتے ہیں، اور بے چون و چرا اس پر عمل کرنے کی عام دعوت دیتے ہیں۔

انسان کا قدرت کے ساتھ ایک فریب

یہ شکست خوردہ انسان کو اس قاہرانہ طاقت کے بالمقابل کبھی کبھی

سرنگوں ہوجانے پر مجبور تو ہوجاتا ہے مگر اندر ہی اندر کوشش کیا کرتا ہے کہ اس حاکم قانون کو بھی اپنی ہی قیدِ حاکمیت میں لے آئے باغی تو یہاں صاف انکار کر دیتا ہے اس سے یہیں سروکار ہی نہیں۔ ایک فرمانبردار بھی اس موقع پر حقِ حاکمیت ادا کرتا نظر نہیں آتا اور ایک صحیح بات کی آڑ لیکر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے اور بجا کرتا ہے کہ اس آئین کو معقول تر آئین ثابت کرے مگر یہاں فریب یہ ہے کہ اس معقولیت کا معیار اپنی عقلِ نارسا بنا لیتا ہے اور اس کے اس خیر خواہی میں وہ شریعتِ سماویہ کی گردن توڑتا موڑتا رہتا ہے۔ حکم یہ تھا کہ ہر اختلاف میں اسی قانون کو حکم اور فیصل بناؤ اور عمل یہ ہے کہ اس قانون کو اپنی عقل کے مطابق کرنے کی سعی ہو رہی ہے اور اسی کا نام اتباعِ ہویٰ ہے۔

اتباعِ ہدیٰ اور اتباعِ ہویٰ متضاد صفتیں ہیں

قرآن کریم اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے یعنی جو متبعِ ہویٰ ہے وہ سماوی ہدیٰ کا متبع نہیں ہوسکتا اور جو آسمانی ہدایت کا متبع ہے وہ ہویٰ کے پیچھے نہیں جا سکتا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (جاثیہ)

پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر رکھا ہے (یعنی ہدیٰ) تو آپ اسی پر چلئے اور بے علموں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلئے۔

یعنی اتباعِ ہدیٰ کو اتباعِ ہویٰ کا ترک لازم ہے۔ ہدیٰ اور ہویٰ اپنی اپنی جگہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں، قدرت نے دونوں انسان کے سامنے رکھدیئے ہیں۔ وھدیناہ النجدین۔ اور ان دونوں راستوں میں ایک راستہ پر چلنے کا حکم اور دوسرے سے احتراز کا حکم دیدیا ہے۔

ہدیٰ اور ہویٰ کے دوراہے پر انسان کا امتحان

اسی دوراہے پر کھڑا کرکے انسان کا امتحان لیا گیا ہے۔ راہِ ہدیٰ پکارتی ہے کہ راہ یہ ہے اس پر چلو مگر ہویٰ مچلنے لگتی ہے اور سو طرح کی رکاوٹیں سامنے لے آتی ہیں۔ ہدیٰ ایک آسمانی آئین ہے اس کی اتباع میں محکومیت کا داغ لگتا ہے اور ہویٰ اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے مان لینے میں حاکمیت کا مزا آتا ہے اس لئے یہاں ایک نیک بخت

انسان بڑی حماقت یہ کرتا ہے کہ ھدیٰ اور ہویٰ کے درمیان اتفاق و سازگاری کی سعی کرنے لگتا ہے
تاکہ ؎ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔
مگر سعی یہ لاحاصل ہے قرآن نے پہلے اعلان کر دیا ہے کہ یہ دو راہیں علیحدہ علیحدہ ہیں
ایک کا سرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور دوسری کا سرا شیطان کے ہاتھ میں ہے
ایک کا منتہیٰ جنت ہے اور دوسری کا دوزخ۔

اتباعِ ہویٰ میں سکون کا راز

یاد رکھنا چاہیئے کہ خواہشات و اہوا کا محرک چونکہ خود نفسِ انسانی ہے اس لئے وہ جسمِ انسانی میں جان کی طرح رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کی ہوئی ہوتی ہیں ان کا خلاف اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جیسا کہ جسم کو جان کا۔ ان میں اسی طرح فطری جاذبیت ہوتی ہے جیسا کہ لوہے اور مقناطیس میں اور جب کبھی ان پر قرآن و سنت کا ملمع چڑھ جاتا ہے تو اب وہی ہویٰ ٹھیک ھدیٰ کی صورت نظر آنے لگتی ہے اور ہدیٰ اور ہویٰ کے اس توافق کے بعد جو اطمینان وانشراحِ قلب میسر آتا ہے وہ گنگا و جمنا کے سنگم کا سا لطف سامنے کر دیتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر انسان اپنے اندر اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ پھر تلاشِ حق کا لفظ سننا بھی اُسے گوارا نہیں ہوتا۔
اسی لئے سورہ الجاثیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریقِ امتنان ارشاد فرمایا گیا تھا کہ دیکھیے اتباعِ ہویٰ کی اس گرم بازاری کے زمانہ میں ہم نے آپ کو ہدیٰ پر قائم رکھا ہے یہ کتنا بڑا احسان ہے تو اب آپ ان بے علموں کی ہویٰ کا ساتھ نہ دیں۔ ہویٰ کے ان غیر معمولی اثرات اور برقی تاثیر و تعدیہ کا حال حدیثِ افتراق کے آخری جملوں میں بدیں الفاظ ذکر کیا گیا ہے۔

وانہ سیخرج فی امتی اقوام	آئندہ میری امت میں کچھ لوگ آئیں گے جن میں
تتجاری بھم تلک الاھواء کما	یہ اہوا اور خواہشات اس طرح رچی ہوئی ہوں
یتجاری الکلب بصاحبہ	گی جیسا کہ ہڑک سکتے کاٹے کے جسم میں کہ کوئی رگ
لا یبقی منہ عرق ولا مفصل	اور کوئی جوڑ اس کا ایسا نہیں رہتا جس میں یہ
الا دخلہ (ابوداؤد)	بیماری گھسی ہوئی نہ ہو۔

تشبیہات انبیاء علیہم السلام اور استعارات شعراء میں فرق

یہ انبیاء علیہم السلام کے تشبیہات ہیں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے استعارات نہیں اس لئے یہاں صرف رنگینی اور لطف اندوزی مقصود نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی صحیح سے صحیح ترجمانی مدنظر ہوتی ہے۔ کتے کاٹے کی بیماری پر غور کیجئے تو اس میں آپ کو دو باتیں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ چونکہ یہ بیماری ایک ایک جوڑ میں سرایت کرجاتی ہے اس لئے لاعلاج ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ جس طرح یہ بیماری دراصل دیوانہ کتے میں موجود ہوتی ہے لیکن جب وہ کسی کو کاٹ لیتا ہے تو اس کو بھی اس بری طرح لگ جاتی ہے کہ پھر یہ شخص بھی کتے کی طرح خوفناک اور قابلِ احتراز ہوجاتا ہے حتیٰ کہ اگر یہ کسی تیسرے انسان کو کاٹ لے تو اس پر بھی وہی اثر ظاہر ہوجاتا ہے جو دیوانہ کتے کے کاٹنے سے ہوتا۔

اصحاب ہویٰ کو توفیقِ توبہ میسر آنا مشکل ہے

ان خصوصیات کے بعد اب اگر آپ اہلِ ہویٰ کے حالات کا موازنہ کریں تو اس تشبیہ میں آپ کو نبوت کا ایک اعجاز نظر آئے گا۔ ہویٰ کا حال بھی یہی ہے کہ جب وہ انسان کی رگ وپے میں سرایت کرجاتی ہے تو پھر وہی انسان کو بشکل "ہدیٰ" نظر آنے لگتی ہے اس لئے یہاں توبہ کی امید نہیں رہتی توبہ کی توفیق اس وقت ہوسکتی ہے جبکہ قلب کا کوئی گوشہ ہویٰ سے خالی ہو مگر جب رگ رگ میں ھویٰ سرایت کرجائے تو اب توبہ کی توفیق کہاں سے آئے اسی لئے سورہ جاثیہ میں فرمایا ہے۔

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰاهُ	بھلا دیکھئے تو جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا
وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ	اور حاکم ٹھیرا لیا اور علم رکھنے کے باوجود خدا نے
عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى	اس کو راہ سے بھٹکا دیا اور اس کے کان اور
بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ	دل پر مہر لگادی اور آنکھوں پر پردہ ڈالدیا تو
مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ	اب اس کو خدا کے بعد کون ہدایت دیسکتا ہے
(الجاثیہ)	کیا تم اس پر غور نہیں کرتے۔

علم کی گمراہی جہل کی گمراہی سے بدتر ہے

آیتِ بالا میں چند اہم فوائد بتلائے گئے ہیں پہلا یہ کہ جس طرح

بے علمی گمراہی کا سبب بنتی ہے اسی طرح کبھی علم بھی گمراہی کا سبب ہو جاتا ہے مگر جو گمراہی کہ علم کی راہ سے آتی ہے اس کا نتیجہ بھی انتہائی خطرناک ہوتا ہے یہ گمراہی تاریکی کی گمراہی نہیں بلکہ روشنی کی گمراہی ہے جہل کی نہیں علم کی گمراہی ہوتی ہے اس لئے یہاں سامانِ ہدایت سب معطل ہو جاتے ہیں، نہ کان کچھ سنتے ہیں اور نہ آنکھیں غور و فکر کرنے کے لئے تیار ہوتی ہیں اور قلب میں تو حکومتِ ہوٰی کی وجہ سے حق بینی اور حق فہمی کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی اس لئے یہاں ہدایت و توبہ کی کوئی توقع نہیں رہتی۔ اگر خدا ہی اسبابِ ظاہریہ سے بالاتر طریقہ پر ہدایت نصیب فرمائے تو یہ دوسری بات ہے اسی کو دوسری آیت میں بلفظِ طبع ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (محمد) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور وہ اپنے خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں جس بدنصیبی کو لفظِ ختم سے تعبیر فرمایا تھا یہاں لفظِ طبع سے ارشاد فرمایا گیا ہے دونوں لفظوں کا حاصل وہی محرومی اور شقاوت ہے۔

ہوٰی پرست کو خدا پرستی کا مغالطہ

دوسری بات یہ کہ ہوٰی پرست کو اتباعِ ہوٰی میں وہ مزا آتا ہے جو خدا پرست کو عبادت میں کیونکہ جب اس نے اپنی ہوا ہی کو اپنا خدا بنا لیا ہے تو پھر اسی کی فرمانبرداری اس کو خدا کی فرمانبرداری نظر آنی چاہئے اس لئے جتنا ایک خدا پرست ہدٰی کے اتباع کی سعی کرتا ہے اس سے زیادہ ایک ہوٰی پرست اپنی ہوٰی کے اتباع کے پیچھے رہتا ہے اور حیرت ہے کہ راستے کے اس اختلاف کے باوجود دونوں کے خیال میں مقصد پھر ایک ہی ہوتا ہے یعنی خدائے قدوس کی فرمانبرداری اس التباس کے بعد متبعِ ہوٰی سے توبہ کی توقع ایسا ہے جیسا کہ ایک متبعِ ھدی سے کفر کی توقع۔ نہ وہ اپنے اسلام کو چھوڑ سکتا ہے نہ یہ اپنی ہوی کو اس کا نتیجہ پھر وہی توبہ سے محرومی نکلتا ہے

اتباعِ ہوٰی کو گمراہی لازم ہے

تیسری بات یہ کہ اتباعِ ہوٰی اور ضلالت لازم و ملازم ہیں اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ اتباعِ ہوٰی اور اتباعِ ہدٰی دو متضاد نقطے ہیں۔ اس کا حاصل یہی تھا کہ اتباعِ ہوٰی کا نتیجہ ضلالت و گمراہی ہے اسی کو آیۃ ذیل میں بیان فرمایا گیا ہے۔

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ۔ (ص)

اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تو مخلوق میں سچائی کا فیصلہ کیجئے اور خواہش و ہوی کی اتباع نہ کریئے کہ یہ آپ کو خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

ت حق اتباع ہوی کے منافی ہے

اس آیت میں بھی اسی مضمون کو بتلایا جا رہا ہے کہ آپ خلیفہ ہیں آپ کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام نافذ کریں یہی خدائی خلافت کا ن ہے لیکن اگر آپ نے ہوی اور اپنی خواہش کی پیروی کی تو پھر خدا کی راہ آپ کو نظر نہیں آسکتی اور ے نظر آسکتی ہے جبکہ اس کی خاصیت اسباب ہدی کا تعطل ہو۔

دوم اس آیت سے جہاں ہوی اور ضلالت کا ربط معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم وتا ہے کہ اتباع ہوی شانِ خلافت کے بھی منافی ہے خدا کا خلیفہ دنیا میں اس لئے آتا ہے کہ وہ وسروں کو بھی اسی کے راستہ پر لگائے نہ اس لئے کہ خود ہی گم کردہ راہ بن جائے۔

تباع ہوی شریعت اور یاست دونوں کے لئے مضر ہے

تیسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہوی جس طرح مسائلِ شریعت کی فہم میں مخل ہوتی ہے اسی طرح حکومت، عدل و انصاف، معاملہ فہمی کے لئے بھی سدِ راہ ہے چونکہ خلیفہ کا تعلق دونوں شعبوں سے ہوتا ہے اس لئے اس مرکزی نقطہ پر متنبہ رہنے کی اس کو پوری ہدایت کی گئی ہے۔ اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السموات والارض۔

اگر حق ان کے خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین فاسد ہو جاتے۔

معلوم ہوا کہ اتباعِ ہوی جس طرح نظامِ مذہب میں مخل ہے اسی طرح نظامِ عالم کو بھی درہم و برہم کرنے والا ہے۔ اسی لئے صاحب موافقات نے تو اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کہ شریعت داعیۂ ہوی کو ختم کرنے کے لئے ہی آئی ہے۔

مذمتِ ہوی میں سلف کے اقوال

مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں ہم سلف کے چند آثار بھی نقل کر دیں

کہ ہمارے نزدیک علم یہی ہے۔ سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی خوش اعتقادی میں بولا "انا علی ھواک" میں تو آپ کی ہوٰی (خواہش) کا متبع ہوں۔ اس پر ابن عباسؓ نے جواب دیا "الھوی کلہ ضلالۃ" ہوٰی (خواہشات) سب گمراہی ہے پھر بطریق تادیب و سرزنش فرمایا "ای شئ انا علی ھواک" "انا علی ھواک" کیا چیز ہے یعنی کچھ نہیں ۔
ابن وہب حضرت طاؤس سے نقل کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے جہاں ہوٰی کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی مذمت ہی فرمائی ہے[1] اب آیاتِ ذیل کو بغور پڑھئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ جہاں ہوٰی کا ذکر آیا ہے مذمت ہی کے سلسلہ میں آیا ہے۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ۔ — صرف اٹکلوں اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔

آیتِ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتباعِ ہوٰی اور اتباعِ ظن و تخمین یہ ایک ہی نوع کی باتیں ہیں واقعات اور حقائق سے دونوں دور دور رہتے ہیں۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ۔ (محمد) — بھلا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلے ہوئے راستہ پر ہو ان کے برابر ہو سکتا ہے جن کے نظروں میں اپنے اعمال بد مزین ہوں اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ہوں۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (والنازعات) — جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو یقیناً اس کی جگہ جنت ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احترازِ ہوٰی مورثِ خوف ہے اور اتباعِ ہوٰی موجب بے خوفی

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ (النجم) — وہ خواہشِ نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ صرف خدا کی وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۱۵۲ و ۱۵۵۔

یہاں آپ کا نطق دو ہی صورتوں میں منحصر کر دیا گیا ہے ہویٰ اور وحی تیسرا اور کوئی احتمال نہیں۔ اسی لئے جب ہویٰ آپ کے کلام سے منفی ہے تو صرف اس کا وحی ہونا متعین ہے معلوم ہوا کہ ہویٰ اور وحی دو متضاد چیزیں ہیں۔ اگر ان چند آیات پر ہی غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہویٰ صرف ظنون یعنی اٹکل اور تخمین کا نام ہے۔ کوئی سماوی روشنی اس کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اپنے اعمال کے ابد تری کو اچھی صورت میں سمجھنا اور سمجھانا اور خدا سے بے خوفی اس کا واحد منشا ہوتا ہے، وحی سماوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ضلالت و گمراہی اس کو لازم ہے۔ غرض نظامِ معیشت اور نظامِ مذہب دونوں کے لئے تباہ کن ہے اور شخصی مضرت کے لحاظ سے اس کا اثر انسان کے لئے اس کے اسبابِ ہدایت کا کلی تعطل ہے اسی لئے اس پر ایک طرح توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے اور اس کے شفا یاب ہونے کی اسی طرح توقع نہیں رہتی جیسا کہ کتے کاٹے شخص کی۔

ہویٰ متعدی مرض ہے تشبیہ کا دوسرا جزء تعدیہ ہے آپ کے نزدیک تو یہ صرف مجاز و استعارہ ہوگا، مگر آئیے سلف کو دیکھئے کہ انھوں نے کیا سمجھا تھا۔

عن ابن مسعود قال من احب	حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص تم میں
ان یکرم دینہ فلیتعزل مخالطۃ	اپنے دین کی قدر کرنا چاہے اسے شیطانی افعال
الشیطان ومجالسۃ اصحاب	اور اصحابِ اہوا سے علیحدہ رہنا چاہئے کیونکہ
الاھواء فان مجالستھم الصق	ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی بیماری خارش
من الجرب۔	کی طرح اڑ کر لگتی ہے۔

ایوب فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص ابن سیرین کے پاس گیا اور بولا اے ابوبکر (ان کی کنیت ہے) میں آپ کے سامنے قرآن کی صرف ایک آیت تلاوت کرنا چاہتا ہوں اسے پڑھکر بس فوراً چلا جاؤں گا۔ ابن سیرین نے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور فرمایا اگر تو مسلمان ہے تو میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں، ابھی میرے گھر سے چلا جا اس نے کہا اے ابوبکر میں آیت پڑھنے کے سوا اور کوئی تقریر نہیں کروں گا۔ انھوں نے فرمایا جا بس تو چلا ہی جا۔ جب وہ چلا گیا تو فرمایا

خدا کی قسم اگر مجھے یقین ہوتا کہ میرا دل ایسا ہی مطمئن رہے گا جیسا کہ اب ہے تو میں اسے آیت پڑھنے کی اجازت دیدیتا لیکن مجھے اندیشہ یہ تھا کہ کہیں وہ آیت پڑھ کر میرے دل میں کوئی ایسا شبہ پیدا نہ کردے جسے میں بعد میں نکالنا چاہوں اور نہ نکال سکوں[۱] امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں۔ صاحبِ بدعت سے بات چیت مت کرو اور نہ اس سے جھگڑا کرو وہ تمہارے دل میں فتنہ کا بیج ڈالدیگا ان آثار سے معلوم ہوگیا کہ صاحب شریعت کی وہ تشبیہ پر مغز اور حقیقت سے کتنی قریب تر تھی۔

ہوی کی جاذبیت اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ہوی معنوی طور پر اپنے اندر کچھ ایسی جاذبیۃ رکھتی کہ اس کے آثار بعض مرتبہ غیر اختیاری ہوجاتے ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ یہ چیز ناحق ہے مگر اس کے باطل اثرات گھن کی طرح اندر ہی اندر اس کے ایمان کو کھائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ جبر اور مشاجرات صحابہ کے مسائل۔ ایک اچھا خاصہ ایماندار شخص بھی جب اس وادی میں قدم رکھتا ہے تو کچھ دور چل کر شبہات اور وساوس کی جھاڑیوں میں الجھکر رہ جاتا ہے اور ہزار کوشش باوجود اس کا ایمان زخمی ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لئے صاحب شریعت نے اس پُرخار وادی میں قدم رکھنے کی ممانعت کردی ہے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ جتنا اُدھر سے ممانعت کی تاکید ہوئی، اتنا ہی یہاں اس کے سیر و سیاحت کا شوق دونا ہوا۔ حضرت ابن مسعودؓ کے الفاظ یہ دلیری اور ایمان کی پختگی کی بات نہیں بلکہ اپنے دین کے اکرام نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ہوی میں جاذبیۃ نہ ہوتی تو اس میں فرقہ بندی کی یہ طاقت بھی نہ ہوتی۔

قرآن وسنت عقل کے لئے روشنی ہیں نہ کہ عقل قرآن وسنت کے لئے ایک جماعت نے جب اپنی اہوا و خواہشات کی روشنی میں قرآن وسنت کا مطالعہ شروع کیا تو معیار صحت انھیں عقل ہی نظر آئی۔ پھر جو آیت اور حدیث اس معیار کے موافق اتری اس کو تسلیم کرلیا ورنہ تاویل یا انکار کا راستہ اختیار کیا اور اس معصیت کا عذر گناہ بدتر از گناہ یہ تراشا کہ صاحب شریعت کا کلام عقل کے مخالف ہوہی نہیں سکتا یہ بالکل درست تھا مگر صاحب! سوال یہ ہے کہ ا

---

[۱] الاعتصام ج ۲ ص ۲۴۱ ۔ [۲] ایضاً

عقل کا بھی کوئی معیار ہونا چاہئے۔ خلافِ عقل کہنے کا بھی کوئی ضابطہ ہونا چاہئے۔ ان مراحل پر بحث کئے بغیر فلاسفہ دور نے جو طے کر دیا بس وہ نو وحی منزل من السماء بن گیا اور جو وحیِ حقیقی نے ہدایت کی اسے اساطیر اولین کہکر محتاجِ نقد بھی نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ حشر اجسام، صراط، میزانِ اعمال جسمانی عذاب وثواب، رؤیتہ باری تعالیٰ، جنت وجہنم، اس قسم کے اور جتنے امور پروازِ عقل سے بالاتر تھے سب کا گو صاف انکار تو نہیں کیا گیا مگر اس طرح تسلیم کیا جس کو درحقیقت ایک تسلیم نما انکار ہی کہنا چاہئے۔ بلاشبہ اگر مذکورہ بالا مسائل کو صرف عقل کے ذریعہ طے کیا جائے تو یہ مشکل ہے نورِ وحی کے بغیر نہ وہ دریافت ہوئے اور نہ صفتِ ایمان کے بغیر وہ حدِ یقین میں آسکتے ہیں۔

آخر کار اس غلط بنیاد کی وجہ سے دین میں عقائد واصول کا دوسرا اختلاف پڑ گیا اور جس طرح کہ پہلے اختلاف کی بنیاد جہل پر قائم ہوئی تھی اس اختلاف کا قلعہ عقل پر تعمیر ہوا۔ اسی کی طرف حدیث افتراقِ امت کے بعض طرق میں یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں۔

الذین یقیسون الامور	یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو دین کے مسائل میں صرف
برأیہم فیحلون الحرام	قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور حرام کو حلال
ویحرمون الحلال۔	اور حلال کو حرام بنا دیتے ہیں۔

ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ ابنِ معین نے اس زیادتی کو بے اصل قرار دیا ہے مگر صاحب الاعتصام بعض علماء سے نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے ابنِ معین کا یہ حکم تسلیم نہیں کیا اور کہا ہے کہ یہ ٹکڑا اور ثقہ راویوں سے بھی منقول ہے لہٰذا اس کی اسناد بے غبار ہے۔ ہاں اگر ان کے علم میں اس کے سوا کوئی اور خفی علت ہے تو دوسری بات ہے۔

مذموم قیاس آرائی کیا ہے؟ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ الفاظ مذکورہ بالا میں اس قیاس آرائی ہی کی مذمت ہو رہی ہے جو دین کی حقیقت بدل ڈالے اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے غیر منصوص جزئیات کے احکام کا اصول شریعت کے مطابق حاصل کرنا پھر ان کے اسباب وحکم پر بحث کرنا مذموم قیاس آرائی میں داخل نہیں بلکہ اہلِ علم کے لئے ضروری ہے اس لئے یہ سمجھنا نا فہمی ہے

کہ ہم نے دین کو بلا وجہ ایک معمہ بنانے کی دعوت دی ہے یا غور و تفکر کی راہ معطل کرنے کی سعی کی ہے اس تقریر سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں۔ قرآن جگہ جگہ تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے طرح طرح سے واقعاتِ ماضیہ بیان کر کے ان سے عبرت پذیری کی ترغیب دیتا ہے آیات آفاقی و انفسی کا بغور مطالعہ شیوۂ مومنین قرار دیتا ہے۔ اور حلال و حرام کے معاملہ میں بھی اس حد تک غور و فکر کی ممانعت نہیں کرتا، جہاں تک اس کے احکام کی تبدیل و ترمیم نہ ہو، ہاں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اگر آپ کی عقل نارسا اس کے منصوص احکام کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز رہے تو ان کو توڑ موڑ کر آپ اپنی عقل کے سانچے میں ڈھال لیں یہی اتباعِ ہویٰ ہے۔ اتباعِ ہدیٰ یہ ہے کہ شریعت کو حاکم اور عقل کو محکوم اس کو متبوع اور اس کو تابع بنایا جائے۔ اور اتباع ہویٰ یہ ہے کہ عقل کو حاکم اور شریعت کو اس کا محکوم بنا دیا جائے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں عقل سے کام لینا حکمت ہے اور عقل کے حدود میں قرآن و سنت کو محدود کر دینا اتباعِ ہویٰ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے غور و تفکر پر کوئی چوکی پہرہ قائم نہیں کرتا مقصد صرف یہ ہے کہ عقل کو عقل کی حد پر رکھئے اور اس کو دیو بے زنجیر کی طرح آزاد مت بنائیے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تافتن کہ جا ہا سپر باید انداختن

اختلاف و افتراق کا تیسرا سبب اتباعِ عادات ہے

قومی، ملکی یا خاندانی عادات اور رسم و رواج کچھ اتنی بری چیزیں بھی نہیں کہ ان کی اصولاً مذمت ہی کی جائے بلکہ اگر غور کیجئے تو یہ انسانی اصلاحِ معیشت کا ایک فطری دستور العمل بھی ہیں بہت سی وہ اصلاحات جو انسان آئینی طور پر قبول کرنا پسند نہیں کرتا اپنی خاندانی یا ملکی عادات کی وجہ سے خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے اسی لئے شریعتِ حنیفیہ نے اس کا بڑا لحاظ کیا ہے بلکہ قانونِ یسر کا یہی ایک بڑا اصول ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانوں میں کوئی فاسد عنصر ظلم و تعدی اور محض اپنے جہل و بے علمی کی وجہ سے کوئی بات کر گذرتا ہے اُس کے دستِ نگر تو اس کے خوف کے مارے چون و چرا نہیں کر سکتے اہلِ علم اپنی بے دست و پائی کی وجہ سے اغماض کر لیتے ہیں لیکن جب اسی حال پر کچھ زمانہ گذر جاتا ہے اور کوئی سماوی یا

ارضی طاقت اس میں انقلاب پیدا نہیں کرتی تو پھر یہی عام عادت بن جاتی ہے اور شدہ شدہ اہلِ مذہب اس کو اپنے مذہب کا جزء قرار دیدیتے ہیں۔ بعض مزارات پر بھنگ نوشی اور سجادہ نشین کے لئے عزوبت کی زندگی گویا شرطِ سجادگی تھی۔ آخر ایک دور آیا اور آنکھ کھلی تو اس کے خلاف آواز بلند کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی کورٹ تک مقدمہ پہنچا جب مدعین سے اس کا ثبوت طلب کیا گیا تو ان سے پاس بجز اس کے کوئی دلیل نہ تھی کہ یہ اس درگاہ کی قدیم رسم ہے۔!

اسی طرح فاسد عادات کچھ زمانہ کے بعد مذہبیت کا رنگ پیدا کرلیتی ہیں اور دین میں محض اس رسمِ بد کی وجہ سے فرقہ بندی کی بنیاد پڑجاتی ہے۔ شب برات کی آتش بازی اور عرسوں میں شراب و قمار بازی مذہب کی تعلیم نہیں لیکن یہی عادات ہیں جن کو مذہبی رنگ دیدیا گیا ہے یہ عادات بعض جہلا میں تو اتنی راسخ ہوچکی ہیں کہ ان کے خلاف آواز اٹھانا گویا علمِ جہاد بلند کرنا ہے اسی کا نام اندھی تقلید ہے۔

اندھی تقلید کیا ہے؟ قرآن کریم نے جہاں کہیں مذمت کی ہے اسی قسم کی تقلید کی کی ہے جب کبھی قرآن نے کفار کی بے تکی اور نامعقول باتوں پر دلائل کا مطالبہ کیا ہے تو ان کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ وَقَالُوا اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ. کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کی روش یہی دیکھی ہے اس لئے ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ اس پر قرآن کریم نے جو اعتراض کیا وہ یہ نہیں تھا کہ آباء واجداد کی تقلید کرنا غلط ہے بلکہ یہ تھا کہ اَوَلَوْ کَانَ اٰبَاءُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ. یعنی اگر تمہارے باپ دادوں میں عقل وہدایت کا کوئی شمہ بھی نہ ہو پھر بھی تم ان ہی کی تقلید کئے چلے جاؤ گے۔ دوسری جگہ ذرا اس سے نرم لہجہ میں ارشاد ہے۔

قُلْ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی	آپ کہدیجئے کہ اگرچہ میں تمہارے سامنے وہ راہ پیش
مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَاءَكُمْ	کروں جو اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو جس پر تم نے اپنے
قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ	باپ دادوں کو پایا ہے انھوں نے جواب دیا کہ جو طریق
کَافِرُوْنَ (زخرف)	تم دیکر بھیجے گئے ہو ہم تو اسے مان نہیں سکتے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان کے آبا واجداد میں عقل کی روشنی یا نورِ ہدایت ہوتا تو قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں کورانہ تقلید یہ ہے کہ گمراہی اور بے عقلی کی تقلید کی جائے خواہ پھر اس کے ساتھ ہزار دلائل بھی کیوں نہ ہوں اس کے بالمقابل روشن خیالی یہ ہو کہ ہدایت اور عقل کی بات کی پیروی کی جائے خواہ وہ کتنی ہی خاموش اور کتنی ہی سکوت کیساتھ ہو۔ ہمارے موجودہ دور میں اندھی تقلید اور جمود کا مفہوم ہی غلط سمجھا گیا ہے۔ عالم غیب کی بلند سے بلند حقائق الاہیات کے عمیق سے عمیق معارف اور اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کی ان تمام باتوں کو ان کے اعتماد پر مان لینا جن کو ان کی سچی نظروں نے خود دیکھا یا فہم سلیم نے خوب سمجھا ہے کورانہ تقلید کہلاتا ہے اور یورپ کے فلاسفروں کے ناتمام اور ادھوری تحقیقات کو پورے یقین کے ساتھ مان لینا روشن خیالی کے نام سے موسوم ہے اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو اختلاف دلائل و بے دلائل کا نہیں بلکہ اعتماد و بے اعتمادی کا ہے عصر حاضر کے موجدین پر چونکہ پورا اعتماد حاصل ہے اس لئے ان کی باتیں دلیل یا بے دلیل ماننا سب روشن خیالی میں شمار ہے اور انبیاء علیہم السلام پر چونکہ دلی گہرائیوں میں وہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لئے یہاں تصدیق کے لئے ان کے فرمان سے بھی کسی اور بڑھکر دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور ان کی باتیں بے دلیل ماننا اندھی تقلید نظر آتی ہے حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے سب علوم نہایت کھلے اور اتنے صاف ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

(۱) اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ	بھلا جو شخص اپنے پروردگار کے واضح راستہ پر چلتا ہو اس کے
کَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ	برابر ہو سکتا ہے جن کو اپنا برا کام بھلا نظر آتا ہے اور
وَاتَّبَعُوْٓا اَھْوَآءَھُمْ (محمد)	اپنی خواہشات پر چلتے ہیں۔
(۲) اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ فَھُوَ	بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کے لئے
عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ (زمر)	کھول دیا ہو تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی میں ہے۔
(۳) اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ	بھلا جو شخص یہ یقین کرتا ہے کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے
الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی (الرعد)	تجھ پر اترا وہ حق ہو اس کے برابر ہو سکتا ہو جو نابینا ہے۔

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس راستہ کی دعوت دیتے ہیں وہ خود ایک کشادہ اور کھلا ہوا راستہ ہوتا ہے ان کی مقابل جماعتوں پر اس کی یہ کشادگی اس لئے پوشیدہ رہتی ہے کہ ان کے سامنے ان کے اعمال بد مزین ہوتے ہیں، ان کے اہوار و خواہشات خود ان کی آنکھوں کا حجاب ہوتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ نور بصیرت اُن سے اس طرح سلب ہوجاتا ہے کہ پھر وہ ایک نپٹ اندھے کی طرح ہوجاتے ہیں۔ اب انصاف کرو کہ اندھی تقلید کس کی ہے اُن انبیاء علیہم السلام کی جن کو خود شرح صدر حاصل ہے ان کے علوم سراپا نور ہی نور ان کا راستہ صاف و ستھرا اور کھلا ہوا راستہ ہے یا ان کی جو خود نابینا ہیں جن کی آنکھوں پر اہوار و خواہشات کے تہ بہ تہ حجابات پڑے ہوئے ہیں اور اس لئے انھیں اپنی بد عملی ہی بھلی نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح سطحی علم اور اتباع ہوا فرقہ بندی کا سبب ہوجاتے ہیں اسی طرح اتباع عادات و رسوم بھی اس کا سبب بن جاتی ہیں یہ تینوں اسباب ایک جگہ جمع بھی ہوسکتے ہیں اور جدا بھی ہوسکتے ہیں اور وقت کی مساعدت اور ماحول کی مناسبت پر ان جماعتوں کے گھٹنے بڑھنے، پیدا ہونے اور فنا ہونے کا مدار رہتا ہے امید نہیں ہے کہ مذہبی افتراق و تشتت کے لئے ان امور کے اسباب ہونے میں دو رائیں ہوں مگر جو بات ہر دور میں عقدۂ لاینحل بنکر رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی فرقے کے علم کو سطحی کہدینا یا اس کو تبع ہوی قرار دینا یا کسی رسم کو رسم جاہلیت ٹھیرا دینا آسان بات نہیں ہر فرقہ اپنے علم کو عمیق اور اپنے طریق کو اتباع سنت اور اپنے رسم و رواج کو طریق سلف کہتا ہے اس گتھی کو سلجھانے سے عقل کے ناخن عاجز ہیں۔ ایک فرقہ کا فیصلہ دوسرے کے حق میں معتبر نہیں ہوسکتا اور اس مرحلہ پر پہنچکر خدا کی اس تقدیر پر راضی ہونا پڑتا ہے جس کی طرف اس نے یہ فرما کر اشارہ کیا ہے ولذلك خلقهم۔ ہم نے اس تماشا گاہ اختلاف کو اختلاف ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی ہنگامۂ اختلاف میں انبیاء علیہم السلام وحدت و اتحاد کی دعوت دینے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ ان کی اس آواز پر اختلاف و تشتت بڑھتا رہا ہے اسی کشاکش میں دنیا کی حیوۃ کا راز مضمر ہے اگر خیر و شر ایک طرف ہوجائے تو شاید کارخانۂ عالم درہم برہم ہوجائے۔

(باقی آئندہ)

اسلامی روایات اور ان کا تحفظ

پانچواں باب

خنزیر خوری

از پروفیسر سید محمد جمیل صاحب واسطی ایم۔ اے (کینٹب) سندھ مدرسہ کالج کراچی

فاضل مقالہ نگار "اسلامی روایات کا تحفظ" کے زیر عنوان ایک مستقل سلسلۂ مضامین لکھ رہے ہیں لیکن آپ کو تعلیمی مشاغل سے فرصت کم ہوتی ہے اس لئے جب کبھی موقع ملتا ہے لکھ لیتے ہیں اور ازراہِ کرم اسے برہان میں اشاعت کے لئے بھیجدیتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ کے چار مقالات برہان کی گذشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آج کی صحبت میں یہ پانچواں باب نذرِ قارئین ہے۔ چونکہ ہر باب ایک مستقل مقالہ ہے اس لئے ان مضامین کی اشاعت میں غیر معمولی فترت اور ان کا عدم تسلسل قارئین کے لئے ناگواری کا باعث نہ ہوگا۔ "برہان"

جیسا کہ اس سلسلہ کے باب اول میں بیان ہو چکا ہے۔ مسلمان تہذیب کے عناصر قوت کی غلط تشریح کے باعث اپنی تہذیب کی ان سب باتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جن میں اسلامی تہذیب یورپ کی حاکم عیسائی تہذیب سے مختلف ہے۔ منجملہ ازیں خنزیر خوری کی ممانعت ہے۔ اسلامی ممالک میں مغرب زدہ حلقوں میں خنزیر خوری کا رواج عام ہو رہا ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لئے قاہرہ، استانبول، انگورہ کی زندگی اور مشرق قریب کے ان مسلمانوں کی زندگی کا مشاہدہ کافی ہوگا جو بوجوہ قلیل یا دراز عرصے سے یورپ میں مقیم ہیں۔ میں ذاتی مشاہدہ کے بعد

ان افسوسناک حالات کی جانب اشارہ کر رہا ہوں۔

خنزیر خوری سب سے پہلے چین میں شروع ہوئی پھر رفتہ رفتہ تمام دنیا میں رائج ہو گئی قرآن کریم نے سور کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔ مگر کھانے کے جواز میں کہا جاتا ہے کہ آج کل مہذب ترین اقوام سور کا گوشت کھاتی ہیں۔ مسلمان محض بے بنیاد تعصب کی بنا پر ایک مفید خوراک کو اپنے اوپر کیوں حرام کر لیں وغیرہ وغیرہ۔ لہذا اس جگہ اُن امراض کا بیان جن کا تعلق سور سے ہے غالباً غیر مفید نہ ہو گا۔

سور ایک غلیظ جانور ہے۔ لاطینی شاعر ہورس اسے "گندگی کا دوست" کہتا ہے۔ موجودہ سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جانداروں میں مرض کا ایک دائرہ قائم ہے۔ جس طرح مچھر اور چوہے ملیریا اور طاعون کے حامل ہو سکتے ہیں اسی طرح موجودہ سائنس نے سور کو بھی بہت سے امراض کا حامل ثابت کیا ہے۔

(۱) پیچش کی وہ قسم جو Balantidnil Coli جراثیم سے پیدا ہوتی ہے، ایک تکلیف دہ بیماری ہے جو مہلک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ جراثیم عام طور پر سور کی انتڑیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس کی غلاظت کے ساتھ خارج ہو کر اپنے اوپر ایک خول بنا لیتے ہیں لیکن اس خول کے اندر زندہ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر چینڈلر نے ثابت کیا ہے کہ اس حالت میں یہ جراثیم انسانی خوراک میں داخل ہو جاتے ہیں اور پیچش کا باعث بنتے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ کا محکمہ پبلک ہیلتھ اس مسئلہ پر غور اور تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس جانور کو انسان سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ جیسا کہ ڈاکٹر چینڈلر نے بھی ثابت کیا ہے یہ مرض زیادہ تر انہی ممالک میں پایا جاتا ہے جہاں سور اور انسانی زندگی کا گہرا تعلق ہے۔

(۲) ڈاکٹر چینڈلر نے اسی کتاب میں ایک اور قسم کے جراثیم کا ذکر کیا ہے جنھیں Faciolopsis Buski

---

(۱) Chandler — Animal parasites and Human Disease. P. 7. (1926)

کہتے ہیں۔ یہ جراثیم سور کے ذریعے پانی میں اور پانی کی جونکوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور ایسا پانی پینے سے انسان کے معدے میں پہنچتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دست لگ جاتے ہیں اور تمام جسم سوج جاتا ہے۔

(۳) مشہور بیماری Hookworm Disease کے جراثیم جسم میں کھال کے رستے سے داخل ہو جاتے ہیں اور معدہ تک پہنچتے ہیں۔ مریض میں خون کی کمی اور بخار کی علامات ظاہر ہوتی ہیں اور معدہ کے زخموں کے ذریعہ تپ محرقہ کے جراثیم اور پھیپھڑے میں تپ دق کے جراثیم داخل ہو کر اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ یہ بیماری بھی سور کے ذریعے پھیلتی ہے۔ سور اس انسان کا فضلہ کھا لیتا ہے جسے پہلے یہ بیماری ہو۔ یہ کیڑے سور کے اندر انڈے دیتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر جب سور کے فضلے میں نکلتے ہیں تو انسان کے لئے متعدی ثابت ہوتے ہیں۔ امریکہ میں راک فیلر انسٹی ٹیوشن فلموں کے ذریعہ لوگوں کو ان کیڑوں کے حالات سے آگاہ کرتا رہتا ہے تاکہ لوگ سور سے بچتے رہیں۔

(۴) ایک اور بیماری ہے گول کیڑے کی، Round worms کہتے ہیں نو دس انچ لمبے ہوتے ہیں اور جسم کے مختلف حصوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مریض کو نمونیہ خناق اور امعاء کے امراض یکے بعد دیگرے لاحق ہوتے ہیں اور ڈاکٹر درست تشخیص نہیں کر سکتا ڈاکٹر سٹنٹ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ کیڑے بھی سور کے ذریعے ہی انسانی جسم میں پہنچتے ہیں۔

(۵) پھیپھڑوں سے خون بہنا یعنی Endemic Haemoptysis مشرقی ایشیا میں بہت عام مرض ہے۔ اس مرض کے جراثیم صرف سور کے ذریعے ہی انسان تک پہنچتے ہیں اور یہ مرض صرف ان ملکوں میں پایا جاتا ہے جہاں کی معاشرت سور اور انسان میں قرب پیدا کرتی ہے جن ملکوں میں سور نہیں پایا جاتا وہاں یہ مرض مفقود ہے۔ اس مرض کا ابھی تک خاطر خواہ علاج نہیں مل سکا۔

(۶) ایک اور مرض جو انسانوں کو سور سے حاصل ہوتا ہے اس کا ڈاکٹری نام Clonorchiasis ہے۔ اس مرض میں جگر سوج جاتا ہے اور انسانی جگر کی تباہی کا باعث وہی جراثیم ہوتے ہیں جو

سور کے جگر میں بھی پائے جاتے ہیں اور اسی سے انسان کے جسم میں منتقل ہوتے ہیں جہاں سور نہیں پایا جاتا وہاں یہ مرض مفقود ہے۔

(۷) ڈاکٹر دوما سوریواس ایک اور امعائی کرم Gigantoryochus gigas کا ذکر کرتے ہیں جو بیس تیس سنٹی میٹر لمبا ہوتا ہے اور جنوبی روس میں سور اور انسان کی انتڑیوں میں پایا جاتا ہے اس کے انڈے بھی سور کے فضلہ سے انسانی خوراک کے ذریعے انسان کے اندر داخل ہوتے ہیں۔

(۸) تپ دق مشہور مرض ہے اور یہ مرض سور میں بہت پایا جاتا ہے۔ مریض سور کے گوشت کھانے سے یہ انسانی جسم میں پہنچ جاتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ پبلک ہیلتھ کے اعداد شمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حکومت ہر سال لاکھوں خنزیروں کو تباہ کر دیتی ہے کیونکہ انھیں تپ دق ہوتی ہے اور ان کے ذریعہ انسانی حیات کو خطرہ ہوتا ہے۔

(۹) مشہور مرض .Tapeworm صرف خنزیر خور قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اس مرض کے جراثیم کی تاریخ حیات یوں ہے کہ مریض انسان کا فضلہ سور کھا لیتا ہے۔ اس کے امعاء میں اس مرض کے نامکمل کیڑوں کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے اور پھر یہ کیڑے اس کے خون کے ذریعے سور کے مختلف حصوں میں جا کر گھر بنا لیتے ہیں۔ لہٰذا سور کھانے والے حضرات سور کے ساتھ یہ کیڑے بھی کھا لیتے ہیں۔ یہ کیڑا انسان کی انتڑیوں میں پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور کئی فٹ دراز ہو جاتا ہے انسان کے فضلہ کے ساتھ اس کے انڈے خارج ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کی نشو و نما کے سلسلہ میں سور ایک لازمی کڑی ہے۔ اگر انسان سور نہ کھائے تو اسے یہ مرض ہو ہی نہیں سکتا۔

(۱۰) ایک اور مرض جسے Trichiniasis کہتے ہیں صرف خنزیر کے کھانے والوں کو لاحق ہوتا ہے۔ اس کے جراثیم خنزیر کے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں اور اس طرح پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ خردبین کا سطحی مشاہدہ ان جراثیم کے متعلق کافی معلومات بہم نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا ڈاکٹروں کا

---

al Dumasso Rivas – Human Parasitology P. 338 (1920)

پاس کیا ہوا لحم الخنزیر بھی اکثر مرتبہ ان کیڑوں سے پیدا کئے ہوئے مہلک امراض کا باعث ثابت ہوا ہے۔

مندرجہ بالا امراض کے پورے حالات پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس غلیظ جانور کا گوشت کھانا یا انسانی معاشرت میں اس کو پالتو جانور کی حیثیت میں رکھنا انسانی حیات کے لئے کتنا خطرناک ہے۔ اس جانور کے ذریعے پیدا کئے ہوئے مرض اکثر مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ ان معلومات کے حصول میں میرے ایک دوست نے (جو ڈاکٹر ہیں اور انگلستان کے تعلیم یافتہ ہیں) بہت امداد کی ہے اگر اور اہلِ علم اس موضوع پر مزید تفتیش کریں تو ایک پر از معلومات کتاب لکھ سکتے ہیں۔

ہم مچھروں اور چوہوں کو ایک ایک مرض کا حامل خیال کرتے ہیں اور ان کو نیست و نابود کرنا اخلاقی فرض خیال کرتے ہیں۔ سور بہت سے امراض کا حامل بنتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا حفاظتِ حیات کا جذبہ سور کے گوشت کو حرام اور اس کے قرب کو مکروہ قرار نہ دے لیکن افسوس ہے کہ کچھ مسلمان مغرب کی نقل کی خوشی میں اپنی کم علمی کا احساس نہیں رکھتے اور اپنی تہذیب کے پاکیزہ ترین اصولوں کو محض توہم خیال کرتے ہیں۔

یہ اتفاقی بات ہے کہ یورپ کی طاقت آج دنیائے اسلام پر مسلط ہے۔ اگر ہم پر چین کی حکمرانی ہوتی تو غالباً ہم چینیوں کی طرح چوہے کھانے کا جواز تلاش کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو چیزیں اسلام نے حرام یا مکروہ قرار دی ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ انسانی علم و عقل و فطرت کے مطابق ناقابلِ خورد و نوش رہیں گی ویسے دنیا کی قومیں عجیب عجیب چیزیں کھا لیتی ہیں۔ فرانسیسی مینڈک کو لذیذ خوراک سمجھتے ہیں۔ انگریزی[1] مورخ تونیر کے مطابق وجیا نگر کی ہندو آبادی اور وجیا نگر کے راجہ علاوہ دوسرے جانوروں کے چوہے اور بلی اور چھپکلی کے گوشت کو بھی بطور خوراک استعمال کرتے تھے اور یہ چیزیں وجیا نگر کے بازاروں میں کھانے کے لئے زندہ بکتی تھیں۔ عارضی سیاسی حالات کے ماتحت اپنی پاکیزہ زندگی کے دائمی اصولوں کو چھوڑ دینا صائبِ عقل کی دلیل نہیں۔ اگر مسلمان ہر اتفاقی فاتح کی نقل کرتے رہیں گے تو خدا جانے وہ آخر زمانہ تک کن کن ناپاک اور مکروہ چیزوں کو اپنی خوراک میں داخل کر لیں گے۔

---

[1] Vincent Smith - The Oxford History of India. P. 315

انسانی تجربہ نے سور کے گوشت کو ورود اسلام سے صدیوں پہلے حرام قرار دیا ہے۔ مصر قدیم[ا] میں سور کا گوشت عوام کے لئے ممنوع اور مقدس پجاریوں کے لئے قطعاً حرام تھا۔ اور یہ امر یورپ کے اولین مورخ ہیروڈوٹس[۲] یونانی کی تاریخ میں بھی درج ہے۔ قدیم لاطینی مورخ پلینی[۳] کے مطابق قدیم عربوں فنیشوں اور حبشیوں میں بھی سور کے گوشت کا کھانا ممنوع تھا۔ تورات[۴] میں بیان ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو حکم دیا کہ "سور اگرچہ اس کے سم پھٹے ہوئے ہوتے ہیں تمہارے لئے ناپاک جانور ہے۔ تم اس کا گوشت نہ کھاؤ۔ نہ اس کی لاش چھوؤ۔ وہ تمہارے لئے ناپاک ہیں" اور یہی حکم عہد نامۂ قدیم[۵] میں کئی جگہ آیا ہے۔ سور کا گوشت یہودیوں پر ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ مسلمانوں پر اور تاریخی طور پر بھی یہودی اس جانور کو انتہائی نفرت اور کراہت سے دیکھتے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ یہودی النسل تھے اور وہ بھی سور کو یہودی قانون کے مطابق حرام خیال کرتے تھے۔ انجیل سے ان کا سور کا گوشت کھانا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ عہد نامۂ جدید میں سور کی ناپاکی کو کہانی کی صورت میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ متی کے آٹھویں باب میں درج ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے شیطانی روحوں نے اجازت چاہی کہ وہ سوروں میں چلی جائیں اور حضرت عیسیٰؑ کے حکم سے وہ خبیث روحیں سوروں میں داخل ہو گئیں وہ سور دیوانہ وار بھاگے اور پانی میں گر کر ڈوب گئے۔ اسی طرح مرقس کے پانچویں باب میں بھی درج ہے۔ غرض موسوی قانون کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات میں سور اور شیطانی روحوں کا تعلق اسی کراہت کا ثبوت ہے جو عبرانی مذاہب کو سور سے ہے۔ یہی نفرت حضرت عیسیٰؑ کے حکم "موتیوں کو سور کے سامنے نہ بکھیرو" اور حضرت سلیمانؑ کے فاحشہ عورت کو "سور کی تھوتھنی میں سونے کے زیور" سے تشبیہ دینے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

غرض مناسب یہی ہے کہ مسلمان درست عناصر قوت یعنی علوم فطرت اور صنعت اور اس کے بنیادی علمی و اقتصادی نظام کے قیام کی جانب متوجہ ہوں اور مغربی معاشرتی قباحتوں مثلاً بے پردگی۔۔ خنزیر خوری خمر نوشی وغیرہ کو اختیار کرنے میں دنیاوی طاقت و وقار کے حصول کی بیسود امید نہ رکھیں۔

ا Sir G. Wilkinson - ancient Egypt. ۲ Herodotus. ۳ pliny.
۴ Old Testament: Leviticus XI-4. ۵ Old Testament: Dentronomy XIV-8.

اقبال

اور

آرزوئی نایافت

از جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم اسٹیٹ لائبریری رامپور

مولانا جلال الدین رومی کا ایک قطعہ ہے:-

دی، شیخ باچراغ ہمی گشت گردِ شہر کزدام وددملولم وانسانم آرزوست
زین ہمرہانِ سست عناصردلم گرفت شیرِ خدا ورستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود، جستہ ایم ما گفت "آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست"

علامہ اقبال مرحوم بھی رومی کے اس "نایاب انسان" کے آرزومند ہیں۔ لیکن کوشش وجستجو کے باوجود ان دونوں بزرگوں کو، یا کم ازکم اقبال کو، اپنی آرزو کی تکمیل کا موقع نہ ملا اس ناکامی کے اسباب ووجوہ کیا تھے، اس امر کی تہ تک پہنچنے کے لئے ان خصوصیتوں اور صفتوں پر نظر کرنا چاہئے جو اقبال کے خیال میں اس "یافت می نشود" میں پائی جاتی ہیں۔ ورنہ اس عالم آب وگل میں انسانوں کا قحط نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔

اقبال کا انسان حسن وقبح اشیا میں عقل وخرد سے کام لینے پر آمادہ ہوگیا تو فطرتِ الٰہی نے اُسے کائنات کی خلافت سپرد کرکے جنت کے "میخانۂ بے خروش" سے دنیا کے "گہوارۂ جذب ومستی" میں حاکمانہ داخلے کی اجازت عطا فرمائی۔ فرشتوں نے اُسے ان الفاظ کے ساتھ خدا حافظ کہا:-

عطا ہوئی ہے تجھے روز وشب کی بیتابی خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے، خاک سے تیری نمود ہے، لیکن تری سرشت میں ہے کوکبی ومہتابی

گراں بہا ہے ترا گریہ سحر کاری اسی سے ہے ترے نخل کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

انسان نے اس زمینِ کدو کاوش پر قدم رکھا، تو روحِ ارضی نے استقبال کرتے ہوئے عرض کیا۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل، کوششِ پیہم کی جزا دیکھ
نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا، دیکھ

روحِ ارضی نے اپنے استقبالیے میں انسان کی ان امتیازی صفات کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ اسرارِ کائنات کا کھوج نکالنے میں بیم و رجا کا معرکہ سر کرے گا۔ آئینۂ ایام میں اپنی ادائیں دیکھ کر خودی کی تعمیر کرے گا، اپنے خونِ جگر سے نئی دنیا اور انوکھی جنت بسائے گا اور تقدیرِ جہاں کو اپنے قبضے میں رکھے گا۔

بالفاظِ دیگر جس انسان کی اقبال کو تلاش ہے، اس میں حقائق کی تلاش کا جذبہ ہونا چاہیے، ایسا شدید جذبہ کہ کوئی خوف اور کسی طرح کا لالچ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو سکے اس دنیا میں اپنا حقیقی مقام اور واقعی منصب متعین کر کے اس منصب اور فریضے کی تعمیل میں ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لئے بیتاب و مضطرب ہونا چاہیے، ایسا مضطرب کہ اس اضطراب کے فعلیت میں تبدیل ہو جانے پر خالق و مخلوق کی تقدیر اور رضا ایک ہو جائے۔ یا کم از کم ان کو دو کہنا ناممکن نظر آنے لگے۔

اس سے بھی زیادہ مختصر لفظوں میں مطلب ادا کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے انسان میں مجنونانہ جرأت و ہمت اور عاشقانہ شیفتگی کے ساتھ اپنا اور اپنے فرضِ منصبی کا سچا علم وراس علم پر قرارِ واقعی عمل ہونا لازمی ہے۔

انسان کی اس خصوصیت کو اقبال نے کبھی عشق، جنون اور قلندریت سے اور کبھی خودی

یا ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس صفت کے حامل کو ہمیشہ قلندر، فقیر یا مومن کہکر پکارا ہے۔ ان کے مومن، عاشق، فقیر اور قلندر کی صفاتِ مشترکہ اتنے زیادہ اور ممیزہ اتنے کم ہیں کہ انھیں ایک نہ ماننا ایک طرح کی ناانصافی کے مترادف ہے۔ میں یہاں فرداً فرداً ہر ایک کی صفات پیش کرتا ہوں۔

عشق | پہلے عشق و عاشقی کے متعلق اقبال کے ارشادات سنئے۔

بیا، اے عشق، اے رمزِ دلِ ما　　بیا، اے کشتِ ما، اے حاصلِ ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں　　دگر آدم بنا کن از گلِ ما

اس مقدس اور پاک جذبہ کو نہ ہر شخص جانتا ہے اور نہ ہر ہستی اس کے لائق ہے۔

ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست　　ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست
داند آں کو نیک بخت و محرم است　　زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

یہی وجہ ہے کہ پست ہمت، کمینہ طبیعت اور بدباطن کو یہ نعمت عطا نہیں ہوتی۔

ندارد کار با دون ہمتان عشق　　تذرو مردہ را شاہین نگیرد
نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے　　شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

انسان کی کامرانی، کامیابی، سربلندی اور اس کے تمام اعمال کی قوتِ محرکہ عشق ہے۔ عقل و خرد اور علم و حکمت اس کے بغیر مردہ، زہرِ ہلاہل اور سراسر گمراہی ہیں۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے　　تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

عشق اس ناپیدا کنار کائنات پر محیط اور اس کے اقدار زمانی و مکانی کا حاکم ہے۔ اس کی گرفت و رسائی سے دنیا کا کوئی گوشہ باہر نہیں۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

یہی نہیں، عشق و جنون یزداں شکار بھی ہیں:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدی — یزداں بکمند آور، اے ہمتِ مردانہ!

حکمت و فلسفہ بحث و نظر کے ہزاروں دروازے کھول سکتے ہیں مگر عمل کا ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ یہ عشق ہی ہے جو جرأت و ہمت کے معجز نما کام انجام دے سکتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

ایمان و یقین عشق کی اس ثنا و صفت کے بعد، جو اقبال کے کلام کے چند بکھرے موتی کہے جا سکتے ہیں۔ ایمان و یقین کی تعریف ملاحظہ کیجئے:-

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی — یقیں اللہ مستی، خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار — غلامی سے [illegible] بے یقینی

ایمان و یقیں تقدیرِ عالم کو بدل سکتے ہیں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقین و ایمان سے جو بلند ہمت اور بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے، اس کی اثر آفرینی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

فقر فقر کی توصیف اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے۔

فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریر و کلاہ — فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

علم کا مقصود ہے، پاکیٔ علم و خرد — فقر کا مقصود ہے، عفتِ قلب و نگاہ

علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویای راہ، فقر ہے دانای راہ

فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر — فقر میں مستیٔ ثواب، علم میں مستیٔ گناہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

فقر انسانیت کا معمار ہے، قلبِ ماہیت کرنا اس کا کام ہے، سطح چمکا دینا نہیں، یہ دولت و حکومت کی کارستانیاں ہیں۔

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے — یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی

قلندر اقبال نے قلندر کی پہچان بھی بتائی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ جواں مرد — جاتا ہے جدھر بندۂ حق، تو بھی ادھر جا

ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ — بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا — چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو، تو اتر جا

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا؟ — ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

قلندر کی بارگاہ کا شان و شکوہ شاہوں سے بالاتر ہے۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے — جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

صفاتِ مومن اقبال اس پاکباز بندے کی اخلاقی کیفیات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

پر سوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

اگر ہو جنگ، تو شیرانِ غاب سے بڑھکر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا صفات جس شخص کے اندر جمع ہوں گے وہ زمین کا وارث برحق تسلیم ہو کر رہے گا۔ اقبال نے اس کی وراثت پر استدلال بھی قائم کیا ہے۔

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

مگر میرے خیال میں حجت و دلیل سے یہ مسئلہ بلند ہے۔ کائنات خود اس کی خودی کو دعوت دے گی کہ

چو موج مستِ خودی باش و سر بہ طوفاں کش ترا کہ گفت بہ نشیں و پا بدامان کش
بہ قصدِ صیدِ پلنگ از چمن سرا برخیز بہ کوہ رخت کشا، خیمہ در بیاباں کش
بہ مہر و ماہ کمند گلو فشار انداز ستارہ راز فلک گیر و در گریباں کش

بہر حال مجھے یہاں کہنا یہ ہے کہ اقبال اور رومی نے ان صفات کے انسان کی آرزو کر کے خاکدانِ بے کیف میں اس کا سراغ نہ پایا تو یہ انسان کی پستی سے زیادہ ان کے مطمحِ نظر کی بلندی کا نتیجہ تھا۔ کیا ہر انسان یہ کہہ سکتا ہے۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی مقامِ بندگی دیگر نہ لوں شانِ خداوندی

اس کے لئے وقت درکار ہے اتنا طویل جس کی تحدید خود اس عالمِ نو کے پہلے مردِ مومن نے بھی مناسب نہ جانی۔ بہر حال ناامیدی مومن کی شان سے بعید ہے۔ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

اگر ہم نے کوشش کر کے اقبال کے نصب العین کی کسی حد تک پیروی کر لی تو اس دنیا میں اپنی، اپنے ملک کی، اور اپنے ہمسایوں کی دوبارہ سربلندی حاصل کر لینے میں شک و شبہ کی گنجایش باقی نہ رہے گی۔

ز

عبداللہ بن المعتز
عباسی شہزادہ شاعر کی حیثیت سے

مولوی حافظ رشید احمد صاحب ارشد ایم اے

اسلام کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نے دنیا کو اس وقت علوم وفنون کی روشنی سے جگمگایا جبکہ تمام دنیا پر جہالت چھائی ہوئی تھی، اور یورپ و ایشیا کے باشندے تہذیب و شائستگی کے ابتدائی اصولوں سے ناآشنا تھے۔ اسلامی دور میں نہ صرف علماء و ادبا کے طبقے میں علم و ادب کا چرچا رہا، بلکہ امراء و روٴسا نے بھی علم و فن کی تکمیل میں زبردست حصہ لیا انھوں نے نہ صرف اس پر اکتفا کیا کہ علما و فضلاء کی پرورش و قدردانی کرتے ہوئے انھیں ترقی علوم و فنون کی طرف مائل کریں بلکہ خود بھی انھوں نے عربی لٹریچر کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور اپنی علمی قابلیت سے عربی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔

اس سلسلے میں اگر ہم عربی ادب کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ علمی مذاق طبقہ امراء کے مردوں تک محدود نہ تھا بلکہ ان کی خواتین اور شہزادیاں بھی شعر و ادب سے بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ خود خلیفۂ اعظم ہارون الرشید کی ہمشیرہ محترمہ علیہ بنت المہدی عربی زبان کی زبردست شاعرہ اور خاص طرز کی مالک تھیں۔ نیز سرزمینِ اندلس کی مسلم شہزادیوں کا نام بھی تاریخ ادب میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد فی الحال ہم اس جلیل القدر عباسی شہزادے سے قارئین کو روشناس کرانا چاہتے ہیں جو اپنی شاعری، انشاپردازی اور امارت کے لحاظ سے تاریخ میں عباسی دور کی مایۂ ناز

شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مختصر حالات تاریخ ابنِ خلکان، اور دیوان ابن المعتز کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں۔

ابتدائی حالات عبداللہ بن المعتز مشہور عباسی خلیفہ المعتز باللہ بن المتوکل بن المعتصم بن ہارون الرشید کا فرزند ارجمند ہے۔ اس کے والد خلیفہ المعتز باللہ کا زمانۂ خلافت کچھ زیادہ مشہور نہیں ہے کیونکہ اس نے حکومت کی باگ کلیۃً اپنے ایک عزیز کے ہاتھ میں دیدی تھی اس وجہ سے اس کا ذاتی جوہر عباسی دور کی سیاسیات میں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد خلیفہ المعتضد کے زمانے میں عباسی خلافت نے ایک نئی کروٹ لی۔ اور اس نے وہ سب بد انتظامیاں جسے اس کے پیشتر دور نہیں کر سکتے تھے یک لخت رفع کر دیں۔

عبداللہ بن المعتز کی پیدائش ۲۳۶ھ میں ہوئی۔ ہوش سنبھالنے پر اس نے دیگر فضلا کے علاوہ خاص طور پر دو مشہور ادیب ابو العباس المبرد اور ابو العباس ثعلب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ یہ دونوں ادیب اپنے زمانے میں علم ادب کے آفتاب و مہتاب تھے اور ان کی ضیا پاشیوں سے آسمانِ ادب کے بہت سے ستارے درخشاں ہوئے۔ عبداللہ ان ادبا کا مایۂ ناز شاگرد تھا۔ بچپن ہی سے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات تھے۔ شعر و ادب سے اسے قدرتی دلچسپی تھی اور فہم و ذکاوت اور جدتِ طبعی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس پر ممتاز ادبا کے فیضِ صحبت نے اس پر سونے پر سہاگہ کا کام دیا اور وہ ہر وقت ادبی فضا میں زندگی بسر کرنے لگا۔ اس نے شہزادگی کے امتیاز کے باوجود علماء کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور علم دوست ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ان کی رفاقت اختیار کی۔

خلافت علم و ادب سے شغف کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد کے تمام علماء و مشائخ اسے چاہنے لگے اور اگرچہ اس نے تخت و تاج حاصل کرنے کی کبھی خواہش ظاہر نہیں کی۔ لیکن طبقۂ علماء نے اسے مجبور کیا کہ وہ مسندِ خلافت پر سرفراز ہو۔ چنانچہ کئی سالارانِ لشکر کی مدد اور علماء و فضلاء کے سمجھوتہ سے خلیفہ مقتدر باللہ کو ۲۹۶ھ میں تختِ خلافت سے اتارا گیا اور چوبیس گھنٹے کے لئے عبداللہ بن المعتز سریر آرائے خلافت ہوگیا۔ مگر چونکہ ابن المعتز سیاسی آدمی نہ تھا اور اس نے کبھی انتظام سلطنت میں حصہ لینے کی

کوشش نہیں کی تھی۔ اس لئے وہ حاصل شدہ تخت کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ علاوہ ازیں ابن المعتز کے مددگار علمار و فضلار تھے جو سیاسی شاطرانہ چالوں سے نابلد ہوتے ہیں اس لئے اس کی سلطنت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی اور خلیفہ معزول مقتدر کی جماعت جلد ہی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئی انھوں نے عبداللہ بن المعتز کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ اور کمزور فریق دیکھکر اس کے ساتھیوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا اور ابن المعتز بے یار و مددگار رہ گیا۔

ناچار ہوکر شہزادہ موصوف نے اپنے قدیم رفیق ابو عبداللہ الحسین بن عبداللہ المعروف بابن خصاص جوہری کے گھر جاکر پناہ لی اور وہاں چھپ گیا لیکن قسمت کی بدنصیبی دیکھیے کہ مقتدر کو جلد خبر مل گئی اور اسے گرفتار کراکر اپنے خادم مونس کے حوالے کیا۔ مگر شومئ قسمت نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا اور اس نے قدیمی حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا وہی حشر کیا جو عام طور پر تاجداروں کی خصوصیت رہی ہے۔ یعنی اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اور اس طرح ایسے نامور عباسی شہزادے کا خاتمہ کر دیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یہ المناک واقعہ بروز جمعرات ۲ ربیع الآخر ۲۹۶ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ اور یہ نامور انسان اپنے گھر کے سامنے ایک ویرانے میں مدفون ہوا۔ دنیائے شعر و ادب میں اس کی حسرت ناک موت ناقابل تلافی نقصان تصور کی گئی۔ اور جلیل القدر شعرا نے اس پر مرثیے لکھے۔

افسوس ہے کہ عبداللہ بن المعتز نے اپنے ساتھیوں کے غلط مشورے سے متاثر ہو کر سیاست کی خارزار وادی میں قدم رکھا اور اس طرح اپنی بیش بہا زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اس کی زندگی سے علم و ادب کی بے شمار توقعات وابستہ تھیں اور اگر اس کی عمر وفا کرتی تو وہ دنیائے ادب میں ایک لاثانی شخصیت کا مالک ہوتا۔

شاعری | ابن المعتز کی شاعری گوناگوں خصوصیات رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عباسی شہزادہ تھا اور اس کا زمانہ تہذیب و لطافت کے اعتبار سے عباسی دور کے اوج شباب کا زمانہ تھا۔ عجمیوں اور بالخصوص ترکوں کے اختلاط سے عربی تمدن اور علم و ادب پر خوشگوار اثر پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ شہزادہ موصوف کو فطری ذہانت اور تعلیمی قابلیت کے ساتھ ساتھ لطائف و شائستگی اور لوازم تمدن کے

بہترین ساز و سامان حاصل تھے۔ ان تمام چیزوں نے اس کی شاعری اور قوتِ متخیلہ کو چار چاند لگا دئیے اور اس نے عربی شاعری میں مختلف جدتیں پیدا کیں۔ اس کی خصوصیاتِ شاعری حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس کے الفاظ نہایت سادہ اور عبارت نہایت سلیس ہوتی تھی اور مفہوم شعر کی ادائیگی میں دقت پسندی پر عمل پیرا نہ تھا۔ اس کے اشعار جلد سمجھ میں آجاتے تھے اور دیگر ہم عصر شعرائے کے برخلاف حسنِ تخیل کو مشکل الفاظ کے استعمال پر ترجیح دیتا تھا۔

(۲) اس کی طبیعت معنی آفرینی اور جدت کی طرف زیادہ راغب تھی۔ اچھوتے مطالب ادا کرنا اور نئے نئے تخیل پیدا کرنا وہ لوازم شاعری خیال کرتا تھا۔

(۳) اس کی تشبیہات نہایت لطیف اور فطرتی ہوتی تھیں اور عیش و عشرت کے ساز و سامان اور امارت کی زندگی نے اس کی تشبیہوں اور استعارتوں کو اور زیادہ نازک و لطیف بنا دیا تھا، ایک دفعہ اس نے ایک شعر پڑھا جس میں اس نے کسی چیز کو چاندی کی کشتی سے تشبیہ دی تھی۔ وہ تشبیہ اس قدر برمحل اور مناسب تھی۔ کہ ایک مشہور شاعر اس کو سُنکر پھڑک گیا۔ اور کہنے لگا۔ "اگر ابن المعتز شاہی محلات میں پلا ہوا نہ ہوتا تو وہ اس قدر بدیع النظیر تشبیہ کہنے میں، ہرگز کامیاب نہ ہوتا۔

(۴) عبداللہ بن المعتز مناظرِ قدرت کا بے حد دلدادہ تھا۔ عام طور پر وہ بغداد کے قریب ایک نو تعمیر کردہ شہر "سُرَّ مَنْ رَاٰی" میں قیام پذیر رہا۔ جو قدرت کی رنگینیوں سے مالامال تھا۔ اور وہاں آزاد ہوا میں مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہوتا تھا اس لئے اس نے اپنے اشعار میں جابجا ایسے مقامات کے فطرتی مناظر کا سماں دلکش انداز میں کھینچا ہے۔

(۵) ابن المعتز نے بحر رجز میں کئی طویل نظمیں تحریر کی ہیں۔ جن میں مختلف مضامین پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کی ایسی ایک نظم جسے عربی زبان میں "ارجوزہ" کہا جاتا ہے۔ صبوح (صبح کی شراب) پر ہے اور ایک دوسری مشہور نظم خلیفہ المعتضد باللہ کے جنگوں اور کارناموں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس نظم کے تقریباً چار سو اشعار ہیں اور نہایت سادہ مگر موثر الفاظ میں المعتضد

کی حکومت کے تاریخی حالات نظم کئے گئے ہیں۔ یہ نظم خلیفہ المعتضد کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے اپنے عہد خلافت کی تاریخ مرتب کرنے کا حکم منسوخ کر دیا اور اپنی بہترین یادگار سمجھتے ہوئے یہ قصیدہ اپنی ایک ہونہار پسندیدہ لونڈی کو حفظ کرایا۔ اور یہ لونڈی مختلف محفلوں اور اہم جلسوں میں اس قصیدے کو اپنے مخصوص ترنم اور انداز موسیقی سے گا کر سنایا کرتی تھی۔

یہ قصیدہ ادبی اور تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے۔ ابن المعتز کا بیان المعتضد کے عہد کے تاریخی حالات کی زبردست معتبر سند ہے۔ اور اس کی نظم میں تاریخ کے اسلامی عہد کے طالب علم کو اس زمانے کے تمدن و معاشرت سے متعلق کافی مواد ملے گا۔ جو عام اسلامی تاریخوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس قصیدے میں بغداد کی تباہی اور زمانۂ تنزل میں گمراہ اور سرکش باغیوں کے اخلاق و عادات نیز مختلف ٹولیوں اور ان کے طریقۂ زندگی کا نقشہ دلکش انداز سے کھینچا گیا ہے کہ اس کی نظیر سے عام اسلامی تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔

ادبی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو قصیدے کا حسن دوبالا نظر آتا ہے۔ اس قصیدے میں زور کلام، جوش، بے ساختگی اور سادگی امتیازی خصوصیات ہیں۔ محاکات اور واقعہ نگاری کا فرض ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی ہے۔ خوارج اور باغیوں کے اخلاق و عادات کا نقشہ اس انداز میں کھینچا ہے کہ اصل واقعات کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ رزم اور جنگوں کا حال بیان کرتے ہوئے۔ ابن المعتز اسی جوش و خروش کا اظہار کرتا ہے جو اکثر فارسی کی رزمیہ نظموں کا طرۂ امتیاز ہے اور اس لحاظ سے یہ فردوسی شاہنامہ کے ہم پلہ ہے اور عربی میں سب سے پہلی طویل تاریخی رزمیہ نظم ہے۔

تصانیف عبداللہ بن المعتز نے متعدد ادبی اور تاریخی کتابیں تصنیف کی تھیں جن کے نام تذکروں میں موجود ہیں۔ لیکن زمانے کی دستبرد سے صرف چند کتابیں باقی بچیں جو مندرجہ ذیل ہیں

(۱) دیوان ابن المعتز جو اس کے بیش قیمت اشعار کا مجموعہ ہے۔

(۲) کتاب الزہر والریاض یعنی "پھول و باغات"

(۳) کتاب البدائع۔

(۴) کتاب مکاتبات الاخوان بالشعر۔ شعروں میں خط و کتابت۔

(۵) کتاب الجوارح والصید۔ شکار اور شکاری پرندوں کے متعلق۔

(۶) کتاب السرقات۔ شاعروں کے سرقۂ شعری کے بارے میں۔

(۷) کتاب اشعار الملوک۔ جس میں بادشاہوں کے اشعار درج ہیں۔

(۸) کتاب طبقات الشعراء۔ شعراء کے حالات ہیں۔

(۹) ایک کتاب راگ اور موسیقی کے متعلق تحریر کی۔

نمونہ کلام | اس موقع پر بیجا نہ ہوگا اگر ہم موصوف کے نثر و نظم کا نمونہ قارئین کرام کے تفنن کے لئے پیش کریں۔ اگرچہ ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ جو لطف اصل کلام میں پایا جاتا ہے وہ ترجمہ میں خواہ وہ کتنا ہی عمدہ ہو۔ نہیں پیدا کیا جا سکتا۔

خانقاہ عبدون کا نظارہ | مطیرہ کو (جو ایک پر فضا گاؤں سر من رائے کے قریب ہے) جہاں سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں۔ اور دیر عبدون کو موسلا دھار بارش سیراب کرے۔ یہاں مجھے بارہا راہبوں کی نمازوں کی آوازیں صبح سویرے ہی جگا دیا کرتی تھیں۔ جبکہ ابھی پرندے اپنے آشیانوں سے اڑنے نہ پائے تھے۔ یہ راہب خانقاہ میں کالی کرتی پہنے رہتے تھے اور علی الصباح نعرے مار کر عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ پٹکے باندھے ہوئے ہوتے تھے اور ان کے سروں پر "بالوں کا تاج" ہوتا تھا۔

پختہ شراب ارغوانی کے بارے میں ابن المعتز کہتا ہے۔

(۱) اے میرے دوستو! شراب ارغوانی کیا ہی خوشگوار ہوگئی ہے جبکہ میں زہد و پرہیزگاری کے بعد مےخواری کی طرف لوٹ آیا ہوں اور یہ واپسی بہت ہی اچھی ہے۔

(۲) شیشے کے لباس میں اس شراب (لال پری) کو لاؤ جو موتیوں (یعنی شیشے) میں یاقوت کی مانند چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

(۳) (پانی کی ملاوٹ سے اس پر بلبلے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے) پانی نے چاندی کا دریچہ

تیار کردیا ہے جس کے سفید حلقے کبھی کھلتے ہیں اور کبھی بند ہو جاتے ہیں (بلبلے نمودار ہو کر فنا ہو جاتے ہیں)۔

(۴) مجھے اس قسم کی شراب نے (پانی کی آمیزش کی وجہ سے) دوزخ کے عذاب سے بچالیا، اوراس کا یہ احسان ناقابلِ انکار ہے۔

بغداد کی مذمت اور اس کی ابتر حالت کے متعلق رقمطراز ہے۔

(۱) مجھے نیند کیسے آسکتی ہے جبکہ میں بغداد میں مقیم ہوں اور وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا ہوں

(۲) ایسے شہر میں میری رہائش ہے جس کے کنوؤں پر مچھروں کا غول منڈلاتا رہتا ہے۔

(۳) سردی، گرمی ہر دو موسم میں اس کی فضا کثیف دھوئیں سے بھری رہتی ہے اور اس کا پانی سخت گرم ہوتا ہے۔

(۴) ہائے وہ دارالسلطنت جس میں کبھی نسیم کے جھونکوں سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔

(۵) اب ویران ہو گیا ہے۔ زمانہ اس کے ساتھ برسر پیکار ہے اور اب وہاں (لوگوں پر) عرصۂ حیات تنگ ہو گیا ہے۔

(۶) ہم پہلے یہاں رہتے تھے مگر اب چلے گئے ہیں، کونسی چیز ہمیشہ رہنے والی ہے۔

(۷) بغداد میں میری شب غم دراز ہو گئی ہے۔ حالانکہ مسافر کو بدبختی اور کامیابی دونوں حاصل ہوتی ہیں

(۸) میں یہاں بادلِ ناخواستہ مقیم ہوں اور ایسے نامرد کی مانند ہوں۔ جس سے (اس کی مرضی کے خلاف) ایک بڑھیا بغل گیر ہو (گناہ بے لذت۔ نفرت اور ناپسندیدگی کی انتہا)

ہم نے ابھی ابن المعتز کے "ارجوزہ" (لمبی رزمیہ نظم) کا ذکر کیا تھا۔ اس نظم کے ۴۲۰ اشعار ہیں چونکہ یہ نظم سلاست الفاظ اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی اور اس میں دلچسپ پیرایے میں اس زمانہ کے تمدن و معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے تفنن طبع کے لئے ہم مختلف مقامات سے اس کے اشعار کا ترجمہ قارئین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ معتضد کی تخت نشینی اور بغداد کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے رقمطراز ہے۔

"وہ اس وقت بادشاہ بنا جب ملک تباہ اور مال غنیمت بن چکا تھا۔ سلطنت کمزور ہو چکی

تھی اور اس کا کوئی رعب نہ تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مکھی بھنبھنائے تو سلطنت کانپنے لگتی تھی (کمزوری کا انتہائی مبالغہ) روزانہ ایک ایک بادشاہ قتل کیا جاتا تھا، یا اسے ذلیل ورسوا اور خوفزدہ کردیا جاتا تھا لشکر کے سرداروں اور امیروں پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ ہر روز نئے نئے ہنگامے اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہتا تھا۔ لڑائیاں ہوتیں اور بندگانِ خدا کی جانیں موت کے گھاٹ اتاری جاتیں۔

وہ نوجوان جنھیں بادشاہ کے منشی اور ہم نشین ہونے کا شرف حاصل تھا چلتے چلتے سواری کی حالت میں لوٹ لئے جاتے تھے انھیں کوڑوں سے پیٹا جاتا تھا اور ان کی سواری کو ہلاک کردیا جاتا تھا۔ ہر دن کرخ اور دور میں فوجیں خونیں موتیں بن کر آتی تھیں اور وہ اپنا روزینہ اس طریقے سے مانگتے تھے جیسا کہ یہ ان کا قرض اور جائز مطالبہ ہے، ان کی یہی حالت رہی یہانتک کہ انھوں نے خلافت کو مفلس وکنگال اور رعب وخوف سے متاثر ہونے کا عادی بنا دیا۔

اب بھی یہ ان کے ویران ٹیلے پڑے ہوئے ہیں جہاں تم ان شیطانوں کو دن کے وقت دیکھا کرتے تھے۔ تل جوسق اور قطائع کے ویران گھروں میں ان کے اڈے تھے اور ایک زمانہ وہ تھا جب یہ آباد اور مرجع خاص وعام تھے۔ ان کے امیر سے خوف کیا جاتا تھا جس کے دروازوں پر گھوڑے ہنہناتے تھے اور ان کے دربانوں کے پاس بھیڑ لگی رہتی تھی جب دن چڑھتا تھا تو ساز وموسیقی کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ اس وقت ساقی جام شراب گردش میں لاتے تھے اور بڑے بڑے گناہوں اور جرائم کا ارتکاب کیا جاتا تھا۔

اب ان کا دور ختم ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وجود ہی نہ تھا۔ بیشک زمانہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کی قضا آئی تو آسمان نے بھی ان پر آنسو نہیں بہائے۔

نثر ابن المعتز نہ صرف شاعر تھا بلکہ ایک زبردست ادیب اور انشا پرداز بھی تھا۔ اس کی نثر اس زمانے کے طرز کے مطابق مقفّی اور مسجّع ہوتی تھی۔ لیکن الفاظ کا گورکھ دھندا نہ ہوتی تھی اور سلاستِ الفاظ کی خصوصیات نثر میں بھی نمایاں تھی۔ ذیل میں اس کی نثر کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ ابن المعتز کے ادبی کمالات کا اندازہ لگایا جاسکے۔ یہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ ابن المعتز بغداد کے قریب

ایک پرفضا مقام سرمن رائی" (جس کے لفظی معنی ہیں" دیکھنے والے کے لئے دل خوش کن) میں مقیم تھا۔ شاعر اور مناظرِ قدرت کا دلدادہ ہونے کی حیثیت سے وہ بغداد جیسے بڑے شہروں کی ہنگامہ خیز اور گندی فضا سے متنفر تھا۔ اس لئے اس نے اپنے ایک دوست کے نام خط لکھا جس میں بغداد کی مذمت اور اپنے شہر کی تعریف کی ہے۔ اپنے شہر کی آبادی کی کمی کا شکوہ کرتے ہوئے شاعر موصوف رقمطراز ہے۔

"اگرچہ اس کی آبادی کم ہوگئی ہے لیکن رہائش کے لئے یہ پسندیدہ مقام ہے۔ اس کا ستارہ میلاً ہے اور اس کی ہوا اور مٹی معطر اور خوشبودار ہے۔ اس کے شب و روز نورِ سحر کا جلوہ پیش کرتے ہیں اور یہاں کی غذا اور پانی بھی لطف انگیز اور خوشگوار ہے۔

یہ شہر تمہارے شہر کی طرح نہیں ہے جس کی فضا ہمیشہ گندی، آب وہوا خراب اور مطلع غبار آلود رہتا ہے۔ تمہارے شہر کی دیواریں بوسیدہ اور موسم اس قدر گرم ہوتا ہے کہ بہت سے آدمی اس کی دھوپ سے جل جاتے ہیں۔ تمہارے گھر تنگ ہیں۔ ہمسائے بد اخلاق اور باشندے بھیڑیوں کی مانند ہیں۔ ان کی گفتگو گالیوں سے بھری ہوتی ہے اور فقیر و درویش ان کے دروازے سے ہمیشہ محروم جاتے ہیں وہ مال چھپا کر رکھتے ہیں اور اس کا خرچ کرنا جائز نہیں سمجھتے ان کے راستے گندی نالیوں کی طرح بدبودار ہیں۔ دیواریں ٹوٹی پھوٹی اور گھر جھونپڑیوں کے مانند ہیں۔

شاعر موصوف نے جو نقشہ اپنے زمانے میں بغداد کا کھینچا ہے، بعینہ یہی حالت آج کل ہمارے شہروں کی ہے اور یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ پچھلے زمانے کے لوگوں نے شہری تمدن و معاشرت کے متعلق کچھ نہیں لکھا یا یہ کہ پرانی کتابوں میں تصویر کا روشن پہلو ہی دکھایا جاتا ہے۔

الغرض عبداللہ بن المعتز عباسی شاہی خاندان کی آخری نشانی تھا جس پر علم و فن کا خاتمہ ہو گیا۔ افسوس ہے کہ سیاسی کشمکش نے اس کی زندگی کا جلد خاتمہ کر دیا۔ ورنہ یہ باکمال ہستی اپنے جوہر کی بہترین طریقے سے نمائش کرتی۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

عرضِ نیاز

از جناب عامر عثمانی

غم میں احساسِ شادمانی ہے　　ہائے کیا چیز نوجوانی ہے
کس نے دیکھی ہے کس نے جانی ہے　　منزلِ شوق لامکانی ہے
کیا مئے چشم ارغوانی ہے!　　ڈھلتی جاتی ہے اور پرانی ہے
عشق میں مرگِ ناگہاں کیسی　　عشق خود مرگِ ناگہانی ہے
اے خوشا التفاتِ درپردہ　　شامِ غم ہے مگر سہانی ہے
جس کو چاہا دیا، دیا نہ دیا　　غم پہ بھی تیری حکمرانی ہے
عام ہوتا نہ رازِ دل اتنا　　ضبطِ غم تیری مہربانی ہے
وہ جو سمجھیں تو اشک سب کچھ ہیں　　اور نہ سمجھیں تو صرف پانی ہے
چشمکِ حسن و عشق کیا کہیے!　　ہر نظر مستقل کہانی ہے
ہائے وہ غم جو حسن بن جائے　　حاصلِ عیشِ جاودانی ہے
میں ہوں اب اس مقام پر کہ جہاں　　نامرادی ہی کامرانی ہے
کیا ستم ہے کہ ضبطِ غم پہ انھیں　　ترکِ الفت کی بدگمانی ہے

بارہا جبرِ عشق سے عامر
عقل نے دل کی بات مانی ہے

تصحیح۔ افسوس ہے برہان کی گذشتہ اشاعت میں صفحہ ۳۱۲ سطر ۹ میں بجائے "حاملانِ معنئ قرآن" کے "حاملانِ معنئ قرآں" چھپ گیا ہے۔ قارئین کرام تصحیح کرلیں۔

تبصرے

مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا ازمولانا سید ابوالحسن علی صاحب استاذ تفسیر و ادب ندوۃ العلمار لکھنؤ۔ تقطیع متوسط ضخامت ۳۰۱ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد تین روپے

پتہ :- مکتبۂ اسلام لکھنؤ

اسلام دینِ فطرت ہے اس بنا پر جب تک اس دین کے نظامِ اخلاق و تمدن کو اقتدار حاصل رہا دنیا اس کے زیرِ سایہ امن و عافیت اور خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتی رہی لیکن جب خود اس دین کے علمبرداروں کی کمزوری کے باعث یہ نظام مضمحل ہوگیا۔ اور انسانی ذہن و دماغ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی تو دنیا یک بیک خدافراموشی و معصیت کوشی کی دلدل میں پھنسکر زندگی کے حقیقی اطمینان و خوشی سے محروم ہوگئی۔ یہ ایک عام حقیقت ہے جس کو ہر بالغ نظر مسلمان محسوس کرتا ہے۔ فاضل مصنف نے اسی حقیقت کو موثر و دلنشین انداز میں دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا ہے چنانچہ پہلے انھوں نے تمدنِ اسلامی اور تمدن جاہلی دونوں کے خصائص پر بحث کرکے یہ بتایا ہے کہ جب اسلامی تمدن اپنی صحیح شکل و صورت میں قائم تھا تو وہ کس طرح دنیا کی تباہ حال قوموں کے لئے ایک زبردست پیغامِ رحمت و امنیت ثابت ہوا۔ اس کے بعد نہایت تفصیل کے ساتھ آپ نے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ اسلامی تمدن کے زوال پذیر ہوجانے سے جاہلی تمدن کیونکر ابھرا۔ اور وہ بنی نوعِ انسان کے لئے کس طرح شدید ترین مصیبت کا سامان بن گیا۔ اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے کھوج لگایا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟ اس کے عناصر ترکیبی کون کون سے ہیں اور آج تمام دنیا قومیتوں کے اختلاف کے باوصف اس نظامِ مادی و غیر اخلاقی کو متفق ہوکر کس طرح قبول کر بیٹھی ہے۔ آخر میں نہایت شگفتہ زبان اور ولولہ آفریں طرزِ بیان کے ساتھ آپ نے مسلمانوں کو دعوت دی ہے کہ اس نظامِ جاہلی کی حریف اگر دنیا میں کوئی قوم

ہوسکتی ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں کیونکہ اقبال مرحوم کے لفظوں میں "احتساب کائنات" کا منصب ان کے علاوہ کسی اور قوم کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ دوران بحث میں بعض نہایت عبرت انگیز اور موثر واقعات کا بھی ذکر آگیا ہے جنھوں نے کتاب کی شراب تاثیر کو دو آتشہ کردیا ہے۔ مثلاً مسلمان سلاطین امراء و روٴسا اور خاص خاص علماء و مشائخ کے حالات اور علماء کی ان کوششوں کا ذکر جو انھوں نے انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد سے اب تک اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے کیں۔ بے شبہ کتاب بڑی دلچسپ اور موثر اور سبق آموز و عبرت آفریں ہے ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور کرنا چاہئے۔

قرآن اور سیرت سازی | از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

تقطیع متوسط ضخامت ۱۷۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؎ پتہ:۔ ادارہ اشاعت اسلامیات حیدرآباد دکن

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ارباب علم کے طبقہ میں اس حیثیت سے بہت زیادہ قابل قدر اور لائق احترام ہیں کہ ایک طرف وہ علوم جدیدہ میں درک و بصیرت رکھتے ہیں فلسفۂ مغرب کے مبصر عالم ہیں اور انسان عہد حاضر کے رجحان ذہنی و میلان فکری سے خوب واقف ہیں اور دوسری جانب نہ صرف یہ کہ وہ قرآن و حدیث اور اسلامی تصوف کے نکتہ شناس و رمز آشنا ہیں۔ بلکہ قدرت نے انھیں "دل روشن" اور "زبان ہوشمند" کی نعمتوں سے بھی بہرہ وافر عطا فرمایا ہے۔ جس طرح امام غزالیؒ اور رازیؒ نے اپنے زمانہ میں فلسفۂ یونان کو خود اہل فلسفہ کے مقابلہ میں وقت کے ایک موثر و کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور اسلام کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب فلسفۂ جدیدہ میں اپنی مہارت و بصیرت کو یورپ کے موجودہ سیلاب فکر و نظر کے مقابلہ میں بطور ایک مضبوط بند کے استعمال کر رہے ہیں۔ پھر تصوف اور ادب کی چاشنی نے ان کے مقالات و مضامین کی تاثیر کو اور بھی سہ چند کردیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں آپ نے نہایت موثر و دلنشین انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کو کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی سیرت پختہ ہو یعنی ایک انسان کو اپنی زندگی میں مختلف جذبات و احساسات۔ مسرت و الم اور رغبت و نفرت سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان

مختلف النوع حالات کی کشمکش سے وہ اس طرح عہدہ برآ ہو جائے کہ زندگی کی جدوجہد میں نہ تو اس کے قدم میں کوئی لغزش پیدا ہو اور نہ اس کے قدم غلط پڑیں۔ بلکہ وہ ان سب مراحل سے گذرتا ہوا ایک اعلیٰ نصب العین کی طرف رواں دواں رہے۔ پھر فاضل مصنف نے یہ بتایا ہے کہ سیرت کی یہ پختگی صرف قرآن سے ہی پیدا ہو سکتی ہے نہ کہ کسی اور چیز سے۔ اس بنا پر نتیجہ یہ نکلا کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کا واحد ذریعہ قرآن ہے۔ کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے لئے اور خصوصاً نوجوان مسلمانوں کے لئے بیش از بیش فائدہ کا موجب ہوگا کہ اس میں دین بھی ہے اور فلسفہ بھی تصوف بھی ہے اور ادب بھی۔

رموز اقبال | تقطیع متوسط ضخامت ۱۸۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ :۔ ادارۂ نشریات اردو۔ حیدرآباد دکن ۔

یہ کتاب بھی ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے اگر یہ سچ ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" تو کوئی شبہ نہیں کہ اقبال کی شاعری بدرجۂ اتم اس کا مصداق صحیح ہے۔ اب تک اقبال کے کلام پر سینکڑوں کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اقبال کے کلام کی شرح کے لئے ڈاکٹر میر ولی الدین سے زیادہ موزوں اور مناسب کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کلام اقبال کا مزاج ذوقِ دینی و روحانی، اسلامی تصوف، مغربی فلسفہ، بلند فکرو نظر اور خالص اسلامی نقاب کی تڑپ وغیرہ جن چیزوں سے مرکب ہے ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب بھی ان چیزوں کے حامل اور اس بنا پر "درویش را درویش می شناسد" کا صحیح مصداق ہیں۔ اس کتاب میں "فلسفۂ خودی" "نظریۂ عقل وعشق" "حدیثِ جبر وقدر" "عہد حاضر کا انسان" اور "مسلمان کی زندگی" ان پانچ عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ فاضل مصنف نے بڑی خوبی سے پورے کلام اقبال کی روح کشید کر کے اس مختصر سے مجموعہ میں سمو دی ہے جو ان کی وسعتِ دقتِ نظر اور قدرتِ بیان کی دلیل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر "قلّ ودلّ" کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تاہم ہماری خواہش یہ ہے کہ لائق مصنف اقبال پر کوئی اور ضخیم کتاب لکھ دیں تو مسلمان نوجوانوں میں فکری انقلاب پیدا کرنے میں وہ بڑی موثر ہوگی اور بعض لوگ اقبال کو

جو اپنے غلط اور باطل اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں اس کا سدباب ہو سکیگا۔

رہنمائے قرآن تقطیع متوسط ضخامت ۹۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ ادارہ اشاعتِ اسلامیات حیدر آباد دکن۔

اصل کتاب نواب سر نظامت جنگ نے غیر مسلموں اور خصوصاً انگریزوں کو اسلام کے حقائق سمجھانے کے لئے انگریزی زبان میں لکھی تھی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے بہت سے مباحث پر گفتگو کی ہے جو اسلام کے نظام اخلاق و تمدن اور اس کے عقائد و اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ درمیان میں کہیں کہیں انھوں نے اسلامی احکام کا موازنہ دوسرے مذاہب اور فلسفہ کے افکار سے بھی کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کی برتری ثابت کی ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر مفید ہے اور اسلامیات کے طالب علم کے لئے ایک نوٹ بک کام دے سکتی ہے۔

تبلیغِ حق از مولانا محمد علی صاحب مظفری تقطیع متوسط ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ ۱۲ پتہ:- ادارہ اشاعتِ اسلامیات حیدر آباد دکن

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی ؒ نے فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے۔ "البلاغ المبین فی احکام رب العالمین واتباع خاتم النبیین"۔ اس کتاب کا موضوع اگرچہ مسئلہ زیارتِ قبور ہے لیکن حضرت شاہ صاحب کے اندازِ تحریر کے مطابق اس میں توحید اور شرک و بدعات سے متعلق متعدد نہایت اہم اور بصیرت افروز مباحث آگئے ہیں جن کی طرف ضمناً اشارے آپ کی دوسری تصنیفات میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن اس میں آپ نے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی عادت ہے کہ وہ تحقیقی چیزوں کے ساتھ ساتھ لطائف اور مزایا کا بھی ذکر کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ خصوصیت آپ کی اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ مولانا محمد علی صاحب نے اس کا سلیس اور عام فہم اردو میں ترجمہ کیا ہے اور محترمہ بیگم صاحبہ محمود یار جنگ قریشی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے جو ایک فاضلہ خاتون کے قلم سے ہونے کے باعث خود ایک مستقل چیز ہے۔

اس دور کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو "فرزندِ توحید" کہتا ہے لیکن بہت کم ہیں جو توحید کے اصل مفہوم سے واقف ہو کر عملاً بھی اس پر کاربند ہوں۔ اس بنا پر اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے عبرت و بصیرت کا سبب ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد | از جناب ابوسعید صاحب بزمی ایم۔اے تقطیع متوسط ضخامت ۱۱۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ:۔ اقبال اکیڈمی سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی مسلک سے خواہ آج کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے علم و فضل۔ ذہانت و ذکاوت۔ خطابت و انشا اور اپنی مخصوص فنادِ طبع کے اعتبار سے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ پوری دنیائے اسلام کی ایک نہایت ممتاز اور نامور شخصیت ہیں۔ فاضل مصنف نے جو اردو صحافت کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اور جن کی شگفتہ نگاری مسلم ہے پچھلے دنوں مولانا پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو لاہور کے ماہنامہ "پیغام حق" کی دو اشاعتوں میں چھپا تھا۔ اس مضمون میں بزمی صاحب نے مولانا کی شخصیت سے متعلق اپنے وہ تاثرات قلمبند کئے ہیں جو اُن پر مولانا سے کئی روز تک کلکتہ میں طویل طویل ملاقاتوں کے بعد طاری ہوئے۔ اس میں مولانا کے مختلف علمی، ادبی اور لسانی و اخلاقی کمالات کے علاوہ بعض ایسی چیزوں کا ذکر بھی آگیا ہے جن سے مولانا کے موجودہ سیاسی مسلک پر روشنی پڑتی ہے۔ لائق مصنف اگرچہ مولانا سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں تاہم انھوں نے اس مضمون میں مولانا کی شخصیت کا جائزہ ایک غیر جانب دار اور نکتہ چیں اخبار نویس کی حیثیت سے لیا ہے اس بنا پر جو باتیں ان کو کھٹکتی تھیں ان کا بھی بے غل و غش ذکر کر دیا ہے۔ اب اسی مضمون کو کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب اردو زبان میں شخصیت نگاری کی ایک بہترین مثال ہے۔

ہندوستان میں لعینی راج | از ای۔ الیف۔ مون۔ تقطیع خورد، ضخامت ۲۶۹ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت سے؍ شائع کردہ مکتبہ جدید لاہور۔

برطانوی حکمتِ عملی کے جن مہلک اثرات سے ہندوستان تباہ ہوتا رہا ہے ہندوستانی

مصنفین اس کو مدلل طور پر واضح کر چکے ہیں لیکن زیرِ تبصرہ کتاب اس لئے اہم ہے کہ اس کا مصنف سول سروس کا ایک انگریز آفیسر ہے (جس کو ہندوستان سے دلچسپی تھی لیکن برطانوی سیاست نے اس کے ارادوں کو پورا ہونے دیا اور دل برداشتہ ہو کر وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا) کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب جداگانہ موضوع کا حامل ہے۔ مصنف نے بڑی فراخ حوصلگی سے برطانوی حکومت اور اس کی پالیسی پر تنقید کی ہے۔ چند ابواب میں سیاسی مسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر چھٹے باب میں کانگریس لیگ اور پاکستان پر بہت دلچسپ اور واقعاتی تنقید ملتی ہے۔ ہر چند کہ بڑی حد تک کتاب کا موضوع برطانوی حکومت اور اس کی پالیسی پر تنقید ہے لیکن بعض بعض جگہ شعوری اور غیر شعوری طور پر مصنف ہندوستان پر برطانوی حکومت کے احسانات بھی جتلاتا گیا ہے۔ بہر حال کتاب دلچسپ ہے ترجمہ بھی سلیس و رواں ہے جس کے لئے مخمور صاحب جالندھری لائق مبارکباد ہیں۔

نئی زندگی کا خاص پاکستان نمبر | مرتبہ ڈاکٹر سید محمود تقطیع کلاں ضخامت ۱۲۸ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:- دفتر رسالہ نئی زندگی۔

پاکستان آج کل کا ایک عام موضوعِ گفتگو اور عنوانِ تحریر و تقریر ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک ڈاکٹر امبیدکار کی کتاب Thoughts on Pakistan اور راجندر بابو کی کتاب India Divided صرف یہ دو کتابیں ہیں جن میں پاکستان کے مسئلہ پر نہایت سنجیدگی اور دقتِ نظر کے ساتھ علمی اور فنی بحث کی گئی ہے لیکن یہ دونوں کتابیں انگریزی میں ہیں۔ اردو خواں طبقہ اُن سے استفادہ نہیں کر سکتا اردو زبان میں اب تک موافق اور مخالف جو کچھ اس سلسلہ میں شائع ہوا ہے افسوس ہے کہ وہ بڑی حد تک جذباتی رنگ لئے ہوئے ہے۔ البتہ زیرِ تبصرہ خاص نمبر کے مضامین اس عام کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اس مجموعہ میں پاکستان کے ہر پہلو پر سنجیدگی اور ہوشیاری کے ساتھ غور کیا گیا ہے لکھنے والوں میں ہندوستان کے مشاہیر اربابِ قلم و سیاست شریک ہیں بعض مضامین میں کہیں کہیں لب و لہجہ کی تلخی پیدا ہو گئی ہے جو بحث کی سنجیدگی کو فنا کر دیتی ہے۔ تاہم یہ مضامین اس لائق ہیں کہ پاکستان کے حامی اور مخالف دونوں ان کا مطالعہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کریں اور پھر یہ غور کریں کہ وہ اپنی رائے میں تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟

۱۹۴۲ء:۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہدِ خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں قیمت سے مجلد ہے

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ

۱۹۴۳ء:۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ ورفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپے مجلد سات روپے۔

خلافتِ بنی امیہ:۔ تاریخِ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات سے مجلد ہے

۱۹۴۴ء:۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

۱۹۴۵ء:۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دلنشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد سے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ہے

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد سے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No.L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسنِ خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبّا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبّا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا